مقالاتِ عبدالقادر

مرتبہ

محمد حنیف شاہد

★

مجلس ترقیِ ادب - کلب روڈ - لاہور

مقالاتِ عبدالقادر

ترتیب

تنقید :

* * *

پیش لفظ

علامہ اقبال سے مجھے بچپن ہی سے عقیدت رہی ہے۔ اردو ادب کے طالب علم کی حیثیت سے میں نے جب شخصیات کا مطالعہ شروع کیا تو میری نظر انتخاب علامہ اقبال ہی پر پڑی۔ ذوق وشوق اور عقیدت و محبت کا نتیجہ میری وہ کتب ہیں جو علامہ اقبال کی شخصیت اور فکر و فن کے بارے میں عقیدت مندان اقبال کی خدمت میں پیش کر چکا ہوں۔ علامہ اقبال پر تحقیق و تدقیق کے دوران میں ایک پہلو تشنہ پایا تو اسے مکمل کرنے کی ٹھانی۔ مواد کی کمیابی بلکہ نایابی کے باعث اسے مولانا غلام رسول مہر مرحوم بھی پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکے تھے حالانکہ انجمن حمایت اسلام لاہور کے ارباب بست و کشاد نے انہیں ہر قسم کی سہولت مہیا کرنے کا وعدہ کیا اور معاونت کے لیے ایک ریسرچ اسسٹنٹ بھی ان کی تحویل میں دے دیا تھا۔ تاہم مولانا مرحوم بڑھاپے اور اپنی گوناگوں مصروفیات کے سبب اس عظیم کام کو مکمل نہ کر سکے۔ اس امر کا اظہار انہوں نے اپنی وفات سے کچھ عرصہ قبل راقم الحروف سے کیا تھا۔

محترم میاں امیرالدین، صدر انجمن، نے ایک ملاقات میں بتایا کہ یہی کام انہوں نے محترم سید نذیر نیازی کے سپرد بھی کیا تھا لیکن نیازی صاحب بھی بوجوہ یہ کام سرانجام نہ دے سکے۔ میری مراد انجمن حمایت اسلام سے ہے جس کے ساتھ علامہ اقبال کا کم و بیش اڑتیس سال تعلق رہا۔

جب میں نے ''اقبال اور انجمن'' والا پہلو تشنہ پایا تو اللہ کا

نام لے کر اسے مکمل کرنے کا فیصلہ کر لیا ۔ اس سے یہ ہرگز مراد نہیں کہ میں اپنی تعریف کر رہا ہوں ، میں اسے خداوند بزرگ و برتر کا احسان اور احباب کا فیضان سمجھتا ہوں کہ پانچ سال کی شبانہ روز محنت کے سبب اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا سکا ۔ اس کتاب کو انجمن حمایت اسلام نے جس نفاست اور خوبصورتی کے ساتھ شائع کیا ، اور اسے صوری اور معنوی خوبیوں سے مزین کیا ، اسے میں محترم میاں امیرالدین کا کارنامہ تصور کرتا ہوں ۔

علامہ اقبالؒ پر تحقیق کے دوران میں ایک نام جو بار بار میرے سامنے آیا وہ شیخ عبدالقادر ، مدیر 'مخزن' کا تھا - 'مخزن' کے ایڈیٹر کی حیثیت سے شیخ عبدالقادر ادبی دنیا کے لیے اجنبی نہیں ۔ میں بذات خود شیخ عبدالقادر کے بارے میں بس اتنا جانتا تھا کہ وہ رسالہ 'مخزن' نکالتے تھے اور یہ ایک علمی و ادبی رسالہ تھا جس نے ادبی دنیا میں ایک منفرد مقام حاصل کر لیا تھا ۔ میرے شوق نے جست لگائی اور میں نے شیخ عبدالقادر اور ان کی ادبی خدمات کا جائزہ لینا شروع کر دیا ۔ چار پانچ سال تک میں نے خوب تحقیق کی اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ شیخ عبدالقادر اردو ادب ، بالخصوص جدید اردو ادب کے بہت بڑے محسن اور ادیبوں اور شاعروں کے مربی تھے ۔ ان کے اردو ادب پر بہت زیادہ احسانات ہیں جنہیں بھلانا صرف احسان فراموشی ہی نہیں بلکہ اردو ادب کے ساتھ ناانصافی ہے ۔ شیخ عبدالقادر نے اردو ادب کے فروغ اور ارتقا و ترقی کے لیے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں وہ ادب کی تاریخ میں سنہری حروف سے لکھے جائیں گے ۔ وہ بلاشبہ "جامع کمالات بزرگ" تھے جو "مذہب اردو کے پیغمبر و داعی" اور "اردو کے جناح" تھے اور بقول بابائے اردو

ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم :

"وہ اردو ادب کے اعلی درجے کے ادیب اور نقاد تھے۔ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں پر انھیں کامل قدرت تھی۔ اور جیسے وہ بہترین انشا پرداز تھے ویسے ہی وہ مقرر تھے اور ہر موقع پر بے تکلف تقریر کرتے تھے۔ وہ بڑے زندہ دل، خوش مذاق اور وسیع الاخلاق تھے۔"[1]

مُلا واحدی صاحب نے شیخ عبدالقادر کے کمالات کی تصویر اس طرح کھینچی ہے۔ وہ رقم طراز ہیں :

"سر عبدالقادر لاہور کے حکیم اجمل خان تھے۔ ویسے ہی شستہ و شائستہ، ویسے ہی سنجیدہ اور متین۔ باتیں بھی حکیم اجمل خان کی طرح جچی تلی کرتے تھے۔ لیکن حکیم اجمل خان مقرر نہیں تھے۔ سر عبدالقادر بلند پایہ مقرر بھی تھے۔ جیسا لکھتے تھے ویسا ہی بولتے تھے۔ زبان بالکل دلی والوں کی سی تھی۔ لہجہ بھی دلی والوں کا سا۔ حرکات و سکنات بھی دلی والوں کی سی۔"[2]

غرضیکہ شیخ عبدالقادر کی شخصیت اور ان کی گوناگوں خدمات سے متاثر ہوکر میں تحقیق و تدقیق میں مصروف رہا اور چار پانچ برس کے بعد چار پانچ ہزار صفحات پر مشتمل مواد جمع کر لیا جو میرے پاس محفوظ ہے اور جسے میں نے پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ اس کی ترتیب یوں ہے :

---

۱ ۔ ماہنامہ اوراق نو، عبدالقادر نمبر، ص ۳۰ ۔
۲ ۔ ملا واحدی : میرا افسانہ (سائیکو ستائلڈ) ۱۹۶۶ء، ص ۷۵ ۔

(الف) حیات عبدالقادر
(ب) مضامین و مقالات عبدالقادر (اردو و انگریزی)
(ج) مکاتیب عبدالقادر (اردو و انگریزی)
(د) خطبات عبدالقادر (اردو و انگریزی)
(ہ) مقدمات عبدالقادر

تحقیق کے دوران میں جناب ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب کا ۷ فروری ۱۹۶۷ء کا خط نظر سے گزرا جس میں انھوں نے شیخ عبدالقادر کو ان کی شاندار ادبی خدمات کی وجہ سے خراج تحسین پیش کیا تھا۔ انھوں نے لکھا تھا:

''شیخ صاحب مرحوم نے اردو ادب اور خاص طور پر جدید اردو ادب کی جو خدمت کی ہے ابھی تک اس کا صحیح جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔ ان کے کارنامے بے شمار ہیں۔ خدا کرے کوئی اس اہم کام کی طرف توجہ کرے۔''[۱]

اس خط نے میرے ذوق و شوق کو مہمیز لگائی اور میں نے ایک طرف تو اس تمام مواد کو کتابی صورت میں چھپنے کے لیے محفوظ کرنا شروع کردیا اور دوسری طرف ''شیخ عبدالقادر — احوال و آثار'' کے عنوان سے پی ایچ۔ ڈی کے لیے بورڈ آف سٹڈیز (اردو) پنجاب یونیورسٹی کی خدمت میں ستر صفحات پر مشتمل خاکہ (اور کتابیات) پیش کردیا۔ محترم ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب اور بورڈ کے دیگر اراکین نے اسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور میری

۱۔ قلمی مکتوب ڈاکٹر عبادت بریلوی، مملوکہ راقم الحروف۔

حوصلہ افزائی فرمائی ۔ چنانچہ جون ۱۹۷۵ء میں مجھے باقاعدہ طور پر پنجاب یونیورسٹی لاہور نے مقالہ لکھنے کی منظوری دے دی ۔

۱۳ اپریل ۱۹۷۲ء کو میں نے مکرم و محترم جناب پروفیسر حمید احمد خاں صاحب مرحوم کی خدمت میں ایک عریضہ ارسال کیا جس میں شیخ عبدالقادر پر تحقیق کرنے اور ان کے مضامین و مقالات مجلس ترقی ادب کی جانب سے شائع کیے جانے کی درخواست کی ۔ محترم پروفیسر حمید احمد خاں صاحب نے جواب میں فرمایا :

''شیخ عبدالقادر پر آپ کا علمی کام یقیناً ایک قومی خدمت ہے اور اگر یہ مضامین شائع ہو جائیں تو مجھے دلی مسرت ہوگی ۔'' میری ذاتی رائے مجلس کی طرف سے ان مضامین کی اشاعت کے حق میں ہے لیکن اس سلسلے میں حسب قاعدہ مجلس کے انتظامی بورڈ یا ادبی کمیٹی کی منظوری ضروری ہے ۔''۱

بہرحال مجلس کے انتظامی بورڈ یا ادبی کمیٹی نے ۲۳ جولائی ۱۹۷۲ء کے اجلاس میں مضامین و مقالات کا انتخاب شائع کرنے کی منظوری دے دی ۔ اس امر کی اطلاع محترم پروفیسر حمید احمد خاں صاحب نے راقم کو دی ۔

مضامین و مقالات کا یہ انتخاب صرف 'مخزن' میں چھپنے والے مضامین میں سے ہی نہیں کیا گیا بلکہ ان کے مآخذ دیگر علمی و ادبی رسائل و جرائد اور اخبارات بھی ہیں ۔ شیخ عبدالقادر کے اپنے رسالے 'مخزن' میں چھپنے والے مضامین کی تعداد ۱۳۰ ہے اور شیخ عبدالقادر

---

۱ ۔ قلمی مکتوب پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم ، مملوکہ راقم الحروف ۔

نے اردو زبان و ادب پر جو مضامین و مقالات لکھے وہ مجموعی طور پر دو سو سے زیادہ ہیں۔

شیخ عبدالقادر نے اپنے رسالہ "مخزن" اور اخبار "پنجاب آبزرور" (جس کے وہ پہلے مدیر معاون اور بعد ازاں مدیر رہے) کے ذریعے اردو ادب کی جو خدمت کی وہ قابل قدر بھی ہے اور قابل داد بھی۔ 'مخزن' ایک رسالہ نہیں، ایک تحریک تھی جو مندرجہ ذیل مقاصد لے کر منظر عام پر آیا تھا:

(الف) ''مخزن'' محض ایک ادبی رسالہ ہو اور سیاسی یا مذہبی جھگڑوں میں نہ الجھے۔ دوسرے رسائل کے بارے میں بھی ان کا یہی نقطۂ نظر تھا کہ ادبی رسالے خالص ادبی خدمت کے زور سے ترقی کریں اور صحیح ادبی مذاق پیدا کرنے کی کوشش ملحوظ اور مد نظر رکھیں۔ نظم و نثر میں سادگی کو مصنوعی زیب و زینت پر ترجیح دی جائے۔

(ب) ان انگریزی خواں اصحاب کو جو عموماً اپنی زبان ـــــ اردو ـــــ کو اس قابل ہی نہ سمجھتے تھے اور یہ خیال کرتے تھے کہ اردو کے اخبار یا رسالے یا کتابیں دیکھنا وقت کو ضائع کرنا ہے اور اس میں کچھ لکھنے کی کوشش کرنا بے سود ہے، انھیں اس امر کا قائل کرنا کہ اپنی زبان کی ترقی ضروری ہے۔ اپنی زبان میں بھی دل چسپی کے سامان ہیں اور اس سے بڑے بڑے کام لیے جا سکتے ہیں۔

(ج) اردو نظم میں مغربی خیالات، فلسفہ اور سائنس کا رنگ بھرنا اور نتیجہ خیز مسلسل نظم کو رواج دینا تاکہ نظم اردو کا رنگ نکھرے۔ اس کے اثر کا حلقہ وسیع ہو اور جو لوگ انگریزی

نظم کی خوبیوں کے دلدادہ ہیں ان کی تسلی کے لیے بھی کچھ سامان ملکی زبان میں ہو جائے۔

(د) نظم قدیم کے اس حصے کو بذریعہ انتخاب زندہ رکھنا جو موجودہ زمانے کی تہذیب اور مذاق کے متضاد نہ ہو اور جس سے وہ حصے جو اخلاق پر مُضر اثر ڈال سکتے ہیں ، چھانٹ ڈالے جائیں۔ اس سے یہ مدعا ہرگز نہ تھا کہ ایک نیا جوش اور نیا شوق اشعار کا نوجوانوں میں پیدا کیا جائے بلکہ جو شوق پہلے سے موجود تھا اس کو نسبتاً موزوں ، مصفا اور پاکیزہ بنا دیا جائے۔

(ہ) نثر کی اہمیت قائم کرنا اور نثر لکھنے والوں کو مشق کا زیادہ موقع دینا۔

(و) اپنے ہندو ہم وطنوں میں زبان اور ملکی لٹریچر کے مذاق کو بڑھانا اور رسالے کے لیے ہندو سکھ ناظرین کی ہمدردی اور ہندو و سکھ مضمون نگاروں کے مضامین نظم و نثر حاصل کرنا۔

(ز) انگریزی ، فرانسیسی یا دیگر مغربی زبانوں کے ادبیات کے بہترین نمونے سلیس اور بامحاورہ ترجموں کے ذریعے اردو داں صاحبان کے سامنے پیش کرنا۔[۱]

دنیا جانتی ہے کہ 'مخزن' جو مقاصد لے کر ادبی آفق پر طلوع ہوا تھا ، ان سب میں اسے خاطر خواہ کامیابی نصیب ہوئی۔

'مخزن' نے بدلتے ہوئے حالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے عملی سیاسیات میں کودنے کے بجائے غیر جانبداری سے کام لیا اور اس کے

۱۔ مخزن ، اپریل ۱۹۰۱ء۔

مباحث کو اخباروں اور دیگر رسالوں کے لیے چھوڑ دیا ۔ البتہ علم سیاسیات پر انگریزی اور دیگر مغربی زبانوں کے مضامین اخذ کر کے سلیس اور عام فہم زبان میں شائع کیے ۔

ملک میں نوجوانوں کو اردو کی کتابیں اور رسالے پڑھنے اور ان میں کچھ لکھنے کی جانب ایک پُرزور ترغیب پیدا ہوگئی جس سے نہ صرف 'مخزن' مستفید ہوا بلکہ اس کے ہم عصروں کو بھی بے حد فائدہ ہوا ، اور یہ شکایت جو اس زمانے سے پہلے اکثر سننے میں آتی تھی کہ اکثر رسالے اس لیے بند ہو جاتے ہیں کہ لکھنے والے نہیں ملتے ، بند ہوگئی ۔

اردو نظم میں مغربی خیالات ، فلسفہ اور سائنس کا رنگ بھرنے والا مقصد بھی خاطر خواہ طور پر پورا ہوا اور اس کو پورا کرنے میں سب سے زیادہ کوشش علامہ ڈاکٹر محمد اقبال اور میر غلام بھیک نیرنگ کی طرف سے ہوئی ۔

نظم قدیم کو زندہ رکھنے کے لیے 'مخزن' کے آخر میں سات آٹھ صفحات اشعار کے انتخاب یا زمانۂ حال کے بعض مغتنم حضرات کی غزلوں کے لیے وقف کیے گئے ۔

سب سے زیادہ توجہ نثر کی ترقی کی طرف دی گئی ۔ چنانچہ رسالے کا دو تہائی حصہ نثر کے لیے مخصوص کیا گیا ۔ اس میں دل چسپ ، طبع زاد مضامین کے علاوہ بہت سے مفید تراجم بھی شائع ہوتے رہے جن سے سرمایۂ زبان اردو میں قابل قدر اضافہ ہوا ۔

'مخزن' کے اجرا سے قبل ملک میں ماہوار اردو رسالے خال خال نظر آتے تھے ۔ دو تین مفید اور نامور پرچے جاری ہوکر بند ہوچکے

تھے اور جو تھے وہ بالعموم نظم کے رسالے تھے اور نظم میں بھی ایک صنفِ خاص کے ، یعنی غزل ، اور غزل میں بھی ایک طرح خاص کی قید کے ساتھ ہر گلدستے میں مختلف شعرا کا طرحی کلام درج ہوتا تھا ۔ اور کبھی کوئی غزل زائد درج ہوتی تھی تو اس پر ''غیر طرح'' لکھ دیا جاتا تھا ۔ 'مخزن' کی دیکھا دیکھی جو رسالے پہلے محض اشعار کے لیے وقف تھے اپنی پرانی حالت بدل کر نئے روپ میں نکلے اور انھوں نے اپنے اوراق کا معقول حصہ نثر کے مضامین کے لیے مخصوص کر دیا ۔

ہندو اور سکھ مضمون نگاروں اور شاعروں کی تخلیقات بھی 'مخزن' کی زینت بنتی تھیں ۔ چنانچہ ایک نہایت معقول تعداد ہندو اور سکھ اصحاب کی تھی جن کے رشحات قلم 'مخزن' میں چھپتے تھے ۔ یہ حضرات ہندی اور سنسکرت سے ترجمے کر کے 'مخزن' کو اشاعت کے لیے بھجواتے تھے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس طرح اردو ادب کا ذخیرہ وسیع تر ہوتا گیا ۔

شیخ عبدالقادر کا خیال یہ تھا کہ اردو جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی ارتباط کی یادگار اور ملک کی مشترکہ زبان ہے ، اس کی ترقی میں دونوں مل کر کوشش کریں ۔ اسی سبب سے مذہبی اور سیاسی مضامین سے بچنے کا اصول ان کے پیش نظر رہا ۔ اس ضمن میں ویسے تو ملک کے ہر گوشے سے اچھے اچھے ادیب اور شاعر حضرات سے انھوں نے رابطہ قائم کیا لیکن صوبجات متحدہ آگرہ اور اودھ کے نامور اساتذہ ان کے معاون اور مددگار تھے ۔

انگریزی ، فرانسیسی اور دیگر مغربی زبانوں کے علاوہ ہندی ، سنسکرت ، فارسی اور عربی کی ادبیات عالیہ کے نمونے سلیس ، سادہ

اور بامحاورہ ترجموں کے ساتھ مخزن کی زینت بنتے اور اردو داں صاحبان کے سامنے پیش کیے جاتے تھے ۔ خود شیخ عبدالقادر نے فرانسیسی زبان سے تین بہترین افسانے ترجمہ کیے جو ''وطن آخر وطن ہے''[۱]، ''دل ہی تو ہے''[۲] اور ''تاجدار بیوی کا بے تاج شوہر''[۳] کے نام سے 'مخزن' میں چھپے ۔ دیگر مترجمین میں مرزا سلطان احمد ، پیرزادہ بشیر احمد ، میر غلام بھیک نیرنگ ، محمد خلیل الرحمان ، سید امیر حیدر بخت ، محمد سجاد علی ، فضل الٰہی کاردار ، جواد علی خان عالی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں ۔

مخزن کی ابتدا ایسے وقت میں ہوئی جب زمانۂ حال کے بہترین صاحبانِ فن زندہ تھے اور ہونہار نوجوان ان کی صحبت اور تصانیف سے فیض پا رہے تھے ۔ غزل گو شعرا میں داغ و امیر ، قومی و ملکی شاعروں میں حالی و اکبر الہ آبادی ، افسانہ نگاروں میں شرر و سرشار ، مرثیہ گو حضرات میں نفیس و اوج و شاد ، نثر نگاروں میں نذیر احمد و شبلی موجود تھے ۔ مگر 'مخزن' نے یہ التزام کیا کہ ان استادوں کے بعد جو لوگ ان کی کرسیاں لینے والے تھے ان کو مائل کیا کہ وہ میدان ادب میں آئیں اور اپنی خداداد قابلیتوں کے جوہر دکھائیں ۔ چنانچہ اقبال ، ناظر ، نیرنگ ، حسرت اور اسماعیل میرٹھی کی نظمیں اور ابو الکلام آزاد ، ظفر علی خان ، راشد الخیری اور خواجہ حسن نظامی کی نثر مدتوں مخزن کے اوراق کی زینت رہی ۔ مولوی ذکاء اللہ ، مولانا وحید الدین سلیم ، سید سجاد حیدر یلدرم ، سید امداد امام اثر ،

۱ - مخزن ، نومبر ۱۹۰۵ع -
۲ - مخزن ، اگست ۱۹۰۷ع -
۳ - مخزن ، جون ۱۹۰۵ع -

سید علی بلگرامی ، سید سلیمان ندوی ، مولانا حبیب الرحمان شروانی ، مرزا سلطان احمد ، مرزا اعجاز حسین ، شیخ محمد اکرام ، منشی احمد حسین ، حکیم احمد شجاع ، سید ناصر نذیر فراق ، نواب عزیز یار جنگ ، پنڈت کیفی ، ڈاکٹر سپرو ، منشی دیا نرائن نگم ، منشی تلوک چند محروم ، جگن ناتھ آزاد ، درگا سہائے سرور ، لالہ سری رام ، طالب بنارسی ، بسمل الہ آبادی ، میلہ رام وفا ، جوش ملسیانی ، عرش ملسیانی وغیرہم کے قلمی تعاون سے 'مخزن' نے فضائے ادب میں وہ وہ بلند پروازیاں کیں جن کی داستانیں آج تک زبان زد خاص و عام ہیں ۔

انیسویں صدی کا ربع آخر اسلامی ہند میں انگریزی تہذیب ، انگریزی تعلیم اور انگریزی زبان کے تسلط و نفوذ کا زمانہ تھا ۔ سرسید احمد خاں شدت سے یہ بات محسوس کر رہے تھے کہ مسلمان ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے ہیں ، اس لیے انہوں نے اپنی بیشتر توجہ اس امر پر مرکوز کردی کہ مسلمان نوجوان پورے انہاک سے انگریزی تعلیم حاصل کریں اور اسی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائیں چنانچہ سر سید احمد خاں اور ان کے بعض رفقائے کار ، مسلمانوں کو انگریزوں اور انگریزی زبان ادب سے قریب تر لانے میں مصروف اور سرگرم عمل رہے ۔ سرسید احمد خاں نے اردو پر زبان برائے زبان کے نقطۂ نظر سے چنداں توجہ نہیں کی اور نہ ہی نثر اردو کی تہذیب و ترتیب پر کوئی خاص توجہ دی ۔ ان کے پیش نظر تو سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ قوم کو انگریزی زبان کے قریب لائیں اور مسلمان نوجوانوں کو انگریزی تعلیم سے آراستہ و پیراستہ کریں ۔ وہ اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے اور اس وقت بھی قوم

کے درد کا مداوا تھا ۔ انھوں نے اردو نثر سے زیادہ تر اپنے خیالات کی تبلیغ کا کام لیا ۔ اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ وہ ایک مصلح پہلے تھے اور ایک قلم کار بعد میں ، لہذا ان کی تمام تر توجہ عبارت کے حسن کی بجائے مواد کی طرف زیادہ مائل رہی ۔ سرسید احمد خان کے یہاں سلاست ، روانی ، سادگی اور زور کمال درجہ پر موجود ہے ، لیکن شگفتگی اور ادبی شان سرے سے مفقود ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ بعض نقادوں نے سرسید احمد خان کی تحریر کو ''خشک اور بے جان'' کہا ہے ۔ مجنوں گورکھپوری نے سرسید احمد خان کی نثر کو ''اخباری اور ناقابل تقلید'' بیان کیا ہے ۔ اس میں کلام نہیں کہ شبلی نعمانی کی شستہ و رفتہ نثر اور حالی کی سادگی و صفائی بیان آج بھی بے مثل اور بے عدیل ہے ۔ دونوں اپنے اپنے رنگ میں لاجواب تھے مگر ایک کا رنگ دوسرے سے جدا تھا ۔ حالی شاعر بھی تھے اور نثر نگار بھی ۔ نظم میں ان کا درجہ مصلح کا تھا ۔ ان کی نثر صفائی اور تازگی کا نمونہ ہے ۔ سلاست اور سادگی کا جو اصول انھوں نے قائم کیا اس پر عمل کرکے دکھایا ۔ مولانا شبلی نعمانی زندگی کی سادگی کے ساتھ ساتھ قدرت سے طبع رنگین لے کر آئے تھے اور وہ رنگینی جا بجا ان کی نظم و نثر میں بدرجۂ اتم موجود ہے ۔ نذیر احمد نے محاورے کے ساتھ جو آنکھ مچولی کھیلی ہے وہ آج بھی ہمیں چونکا دیتی ہے لیکن ان کی طرز نگارش میں یکسانیت اور آب رواں کی سی روانی اور صفائی بیان نہیں ہے ۔ ان کی تحریر کہیں کہیں بہت ہی صاف ، سادہ اور دل نشین ہے اور کہیں پر عربی اور فارسی کے مشکل اور ادق الفاظ کی بھرمار کر دیتے ہیں ، جن کو سمجھنے کے لیے لغت کی ضرورت لازمی ہو جاتی

ہے - یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریر میں یکسانیت قائم نہیں رہتی اور عبارت کی روانی میں خلل اور نقص آ جاتا ہے - مولانا نذیر احمد کی قدرت زبان ، ان کی علمیت اور فارسی و عربی دانی تو ضرب المثل ہے - یہ تینوں اکابر اپنے اپنے مشن میں اس حد تک منہمک اور سرگرم عمل رہے اور انھیں زبان بہ حیثیت زبان اور اس کے روز افزوں مسائل کی طرف توجہ کرنے کا موقع ہی نہ ملا - علاوہ ازیں سرسید احمد خاں کے ان رفقائے کار میں سے کوئی بھی صحیح معنوں میں انگریزی داں نہیں تھا - اگرچہ انی غیر معمولی قابلیت کی وجہ سے ان میں سے بعض نے بعد میں انگریزی کی یہاں تک تحصیل کر لی تھی کہ ہمارے بعض معرکۃ الآرا ترجمے ان کے قلم کے مرہون منت ہیں -۱

مولانا محمد حسین آزاد قلم کاری ، انشاپردازی اور انشائے لطیف کی وجہ سے "بابائے اردو" کہلانے کے مستحق ہیں لیکن مہدی حسن کے قول کے مطابق "سرسید احمد خاں سے معقولات الگ کر لیجیے تو کچھ نہیں رہتے ، نذیر احمد بغیر مذہب کے لقمہ نہیں توڑ سکتے ، شبلی نعمانی سے تاریخ لے لیجیے تو قریب قریب کورے رہ جائیں گے - حالی بھی جہاں تک نثر کا تعلق ہے ، سوانح نگاری کے ساتھ چل سکتے ہیں - لیکن آقائے اردو یعنی پروفیسر آزاد صرف انشاپرداز ہیں جن کو اور کسی سہارے کی ضرورت نہیں - اس میں شک نہیں کہ آزاد ایک سدا بہار انشاپرداز ہیں جن کے ہاں رنگینی ، صنعت کاری ، فن کارانہ حسن کاری ، دل کشی ، صفائی و سلاست ہر جگہ نظر آتی

---

۱ - اوراق نو (عبدالقادر نمبر) ص ۹۸ - ہمایوں (سالنامہ ۱۹۵۸ء) ص ۱۲۳ -

ہے لیکن ان کی انشا سنجیدہ قسم کے علمی موضوعات کا ساتھ نہیں دیتی ۔ آزاد مرقع نگاری ، واقعہ نگاری اور جزئیات نگاری میں ثانی نہیں رکھتے ۔[1]

پروفیسر آلِ احمد سرور کہتے ہیں کہ ''تمثیلی انداز بیان سنجیدہ موضوعات کے شایانِ شان نہیں ۔ اس سے تاریخی واقعات اور فیصلے مسخ ہو جاتے ہیں ۔ آزاد کا اسلوب اس لیے درست نہیں ۔''

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سی شخصیت ہے جس کا اسلوبِ نگارش ہر کسوٹی پر پورا اترتا ہے ۔ اس امر کا فیصلہ ناقدین پر چھوڑتا ہوں کیونکہ یہ اُن کا کام ہے لیکن اتنا عرض کیے دیتا ہوں کہ 'مخزن' کا اجرا دراصل ایک تحریک کا اجرا تھا ۔ اپنی تحریک کے اجرا کے ساتھ شیخ عبدالقادر نے خود بھی لکھنا شروع کر دیا اور اس طرح اردو نثر کو ایک ایسے اسلوب سے آشنا اور روشناس کرایا جو اپنی سادگی اور دل کشی دونوں میں بے مثال تھا ۔ وہ جس زبان میں باتیں کرتے تھے اسی زبان میں لکھتے بھی تھے اور اپنی تحریر میں انھیں کوئی تکلف ، رکھ رکھاؤ یا تصنع برتنا نہیں پڑتا تھا ۔ ان کا موضوع خواہ ادبی ہو یا سیاسی ، خارجی ہو یا داخلی ، تاریخی ہو یا ثقافتی وہ ایک یکساں مہارت اور ایک ہموار انداز سے اسے بیان کرتے چلے جاتے تھے اور ان کے ناظرین کو ان کے سمجھنے میں کبھی کسی دقّت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا ۔ یہ اسلوب سادگی ، سلاست اور ہمواری کے علاوہ ایک خاص قسم کی لطافت اور دلآویزی بھی رکھتا تھا ۔ شیخ عبدالقادر نے اردو نثر کو

۱ ۔ مشعل ، مجلہ دیال سنگھ کالج لاہور ، ص ۲۶-۲۷ ۔

وہ سلاست ، سادگی ، روانی ، زور ، فصاحت اور شگفتگی اور وہ علمیت ، وقار اور ادبی شان و عظمت عطا کی جس سے اس سے پہلے وہ مجموعی حیثیت سے نا آشنا اور ناواقف تھی ۔ یہ تمام خوبیاں اور صفات اس سے قبل کسی واحد شخصیت میں مرتکز نہیں ملتیں ۔ شیخ عبدالقادر بہت سی خوبیوں کے جامع تھے لیکن سب سے علاحدہ اور سب سے الگ اپنا ایک خاص میدان رکھتے تھے ۔ جس میں سادگی ، سلاست ، روانی اور صفائی غالب ہیں اور شگفتگی ، تازگی ، علمی شان اور وقار ان کے دوش بدوش ملتے ہیں ۔

شیخ عبدالقادر کا اسلوب نگارش اگرچہ اپنی جگہ ایک مستقل حیثیت اور قدر و قیمت رکھتا ہے ، لیکن اس نے اپنی ادبی تحریک کو کامیاب و کامران بنانے میں بھی ایک بہت بڑا حصہ لیا ۔ انھوں نے انگریزی داں نوجوانوں کے سامنے اپنی نگارش کے نمونے رکھ کر ان کے دلوں سے وہ جھجک یکسر دور کر دی جو انھیں اردو لکھنے کے لیے قلم اٹھانے میں محسوس ہوتی تھی ۔ چنانچہ انھوں نے اپنے انداز تحریر سے ثابت کر دیا کہ روزمرہ کے ادبی اور تہذیبی مسائل پر اظہار خیال کے لیے بس ایک ذرا سے سلیقے کی ضرورت ہوتی ہے ۔ عربی اور فارسی کا جید عالم ہونے کی چنداں ضرورت نہیں ۔

شیخ عبدالقادر نے 'مخزن' کے ذریعے سے جو ادبی تحریک جاری کی وہ اقبال اور اقبال کے ساتھ سینکڑوں اور اکابر ادب منظر عام پر لانے میں حد درجہ ممد و معاون ثابت ہوئی ۔ اس نے نہ صرف شاعروں اور ادیبوں کے جواہر طبع کو نمایاں طور پر کھلنے کا موقع دیا بلکہ ان جواہر کی نمود کا باعث ثابت ہوئی اور یوں چراغ سے

چراغ جلتا رہا اور دیکھا دیکھی 'مخزن' کے بعد 'زمانہ' اور 'زمانہ' کے بعد ہمایوں ، نگار ، نیرنگ خیال ، عالم گیر ، ادبی دنیا ، ادب لطیف ، ساقی اور اردو کے بیسیوں اور بلند پایہ رسائل و جرائد افق ادب پر ابھرے - اور ادبی گلشن میں یہ بہار اب بھی اپنا جلوہ دکھا رہی ہے - اس کی قدرو قیمت کا صحیح اندازہ ہم آج نہیں لگا سکتے - یہ کام مستقبل کا مؤرخ ہی انجام دے گا - البتہ آج کی صورت حال کا اظہار مولانا حالی کے اس شعر سے بخوبی ہو جاتا ہے اور اس کا سہرا سر شیخ عبدالقادر کے سر ہے :

بہار اب جو گلشن میں آئی ہوئی ہے
یہ سب پود اسی کی لگائی ہوئی ہے[1]

شیخ عبدالقادر مرحوم کو ایک ادبی رہنما کی مسلمہ حیثیت حاصل ہے - جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ انھوں نے خود کوئی بلند پایہ ادب تخلیق نہیں کیا وہ تنگ نظری اور تعصب کی وجہ سے ایسا کہتے ہیں - ادب کے لیے ترق کی راہ کھولنا اور قلم سے مشعل راہ کا کام لینا ایک ایسے ہی ادیب کا کارنامہ ہو سکتا ہے جس نے ہر لفظ اور ہر سطر ایک اعلیٰ و ارفع مقصد کے لیے لکھا ہو - اس میں کلام نہیں کہ ادب زندگی کا ترجمان ہوتا ہے - اس حقیقت کے پیش نظر ادبی رہنمائی کے لیے جس قدر علم ، تجربہ ، مشاہدہ ، تفکر و تجسس اور سوچ بچار درکار ہے وہ محتاج بیان نہیں اور جس تحریر میں یہ تمام عناصر موجود ہوں اس کی ادبی اہمیت و افادیت سے کون انکار کر سکتا ہے -[2]

شیخ عبدالقادر کے مضامین ، مقالات اور مقدمات کے مطالعے سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ان کا قلم ہمیشہ

۱- ہمایوں (سالنامہ ۱۹۵۸ع) ، ص ۱۷۷ -
۲- اوراق نو (عبدالقادر نمبر ۱۹۵۰ع) ، ص ۲۰ -

ارتقائی اقدار کا محافظ اور وقت کے تقاضوں کا نقیب رہا ہے ۔ انھوں نے اردو ادب میں بہت سی ایسی نئی معلومات اور نئے افکار کا اضافہ کیا جو اُس وقت اس میں معدوم و عنقا تھے ۔ اس لحاظ سے انھوں نے ادب کا جو سرمایہ چھوڑا ہے اس کی قدر و قیمت ہمیشہ وہی رہے گی جو اعلیٰ درجے کے ادب کی ہوا کرتی ہے ۔

شیخ عبدالقادر نے ہمارے ادب اور قومی زندگی کو مزین کرنے کے عظیم اور اعلیٰ مقصد کو کبھی ایک لمحے کے لیے بھی نظر انداز نہیں کیا ۔ ان کا ادب ، ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کی کماحقہ ترجمانی کرتا ہے ۔ انھوں نے قاری کو لفظی یا معنوی طلسم میں مبتلا کر کے اپنی عظمت کا قائل بنانے کی کبھی کوشش نہیں کی ۔

شیخ عبدالقادر کے مضامین ، مقالات اور مقدمات کے بارے میں اتنا کہنا کافی ہے کہ جب بھی انھوں نے کوئی مضمون تحریر کیا یا کسی ممتاز ادیب کی تصنیف کا دیباچہ لکھا اس کی ایسی خوبیاں اجاگر کیں ، ایسی خصوصیات گنوائی ہیں اور ایسی مثالیں منتخب کیں جو مدتوں تک اس مصنف کی تخلیقات کے ضمن میں عام نقادوں کے لیے مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہیں اور ان کی یہ خوبی ایک بلند تنقیدی صلاحیت کا پتہ دیتی ہے ۔ تجزیہ تنقید کا ذریعہ ہے ، خود تنقید نہیں ۔ تنقید کے معنی تو مضمون اور مصنف کی شخصیت کی روح تک پہنچنے کے ہیں ۔ بہترین تنقید صرف بتاتی نہیں سمجھاتی بھی ہے اور سمجھا سکنے کی اہلیت و قابلیت ہر بلند پایہ تنقید کا طرۂ امتیاز ہے ۔ اور اس خوبی کو اگر تنقید کی امتیازی خصوصیت تصور کیا جائے تو شیخ عبدالقادر کے مضامین و مقدمات اس کسوٹی

پر پورے اترتے ہیں ۔[۱]

مشتے نمونہ از خروارے شیخ عبدالقادر کے مضامین اور مقالات کے چند اقتباسات پیش کرتا ہوں تاکہ ان کے طرز نگارش ، اسلوب اور انشا کے خصائص کسی قدر واضح ہو جائیں ۔

''شباب سے پہلے'' کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے ۔ کس قدر شوخی ، ظرافت اور صفائی کا مرقع ہے :

''پطرس نے ایک دفعہ لاہور کا جغرافیہ لکھا تھا اور طنزاً یہ کہا تھا کہ جغرافیہ لاہور میں آب و ہوا کا باب نہیں ، کیونکہ لاہور میں آب و ہوا ہی نہیں ہے ۔ اسی طرح میرے بچپن کی کی تاریخ انوکھی ہے ۔ اس میں بچپن کا باب ہی نہیں ملتا ۔''

ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو ۔ یہ آپ کے قلمی اور غیر مطبوعہ مضمون ''جب آتش جواں تھا'' سے لیا گیا ہے :

''لکھنؤ کے مشہور شاعر آتش کی زندگی میں اگر ریڈیو ایجاد ہو چکا ہوتا اور ریڈیو کے کار پرداز آتش کو اپنی نشرگاہ تک لانے میں کامیاب ہو جاتے تو وہ کہانی ضرور سننے کے لائق ہوتی جب آتش جواں تھا ۔ جوانی یونہی ہوتی ہے ۔ آتش جیسے شاعر کی جوانی اور بھی بلا ہوگی ۔ مگر ہر پیر مرد کی جوانی ایسی نہیں ہوتی جسے افسانہ بنایا جا سکے ۔''

ایک اور اقتباس ''دو ملنگ'' سے ماخوذ ہے اور اپنی مثال آپ ہے ملاحظہ فرمائیے :

۱- اوراق نو (عبدالقادر نمبر ۱۹۵۰ء ، ص ۲۲ -

"بیسویں صدی عیسوی میں بر اعظم ہند کی سیاسیات نے جو رنگ اختیار کیا اس میں دو شخصیتیں بہت نمایاں طور پر ابھریں - ان میں ایک ہندو بزرگ تھے جو مہاتما گاندھی کے لقب سے ملقب ہوئے اور جن کو ہمارے سرحدی صوبے کے سرخ پوشوں نے ملنگ کے نام سے مشہور کیا - انھوں نے ہندو فقیروں کا روپ دھارا اور وضع قطع میں بھی ملنگ بن گئے - دوسرے بزرگ ہمارے قائداعظم علیہ الرحمۃ محمد علی جناح صاحب تھے - یہ بھی اپنی دھن کے انھی کی طرح پکے اور مضبوط ارادے کے مالک تھے - ان کے مزاج میں بھی درویشانہ یا قلندرانہ رنگ تھا مگر اس کو انھوں نے اپنے اوپر غالب نہیں ہونے دیا اور ہمیشہ خوش پوش ملنگ رہے - جب کبھی انگریزی لباس پہنتے تھے تو وہ اس فیشن کا بہترین نمونہ سمجھا جاتا تھا اور جب اچکن اور تنگ پاجامہ یا اس کے بعد اچکن اور شلوار کو زیب تن کیا تو اس وقت ان کی جامہ زیبی مسلم تھی - ان کی سیاسی جد و جہد ہمیشہ آئینی رہی اور اسی کی بدولت آخر کار حکومت انگریزی ہندوستان کی تقسیم پر مجبور ہو گئی -"

مندرجہ ذیل اقتباس "حضرت دل کی تعریف" میں سے ماخوذ ہے - پڑھیے ، سر دھنیے اور داد دیجیے - اس میں سلاست ، سادگی ، آب رواں کی سی روانی ، شگفتگی ، علمیت اور ادبی عظمت و شان بدرجۂ اتم موجود ہے :

"دل مٹھیوں میں - دل چٹکیوں میں - دل عاشق - دل معشوق - دل بادشاہ - دل نازوں بھرا - دل نیازمند - دل بے وفا - دل با فا -

دل دلدار ۔ دل دلسوز ۔ کہیں دل کی اس قدر تعریف ہے کہ اس کو رفیع المنزل مانا جاتا ہے ، کہیں دل اگر پست ہے تو اتنا کہ ٹھوکروں میں ٹھکرایا جاتا ہے ۔ ایک دل ہے اور اس ہی ایک میں لاکھوں قوتیں ، لاکھوں شگوفے ، ہزاروں رنگ ، ہزاروں خوشبوئیں ۔ جوڑ جوڑ میں دل ، رونگٹے رونگٹے میں دل ، عضو عضو میں دل ۔ جہاں نشتر چبھوئیے دل موجود ہے ۔ جہاں زخم آئے سینہ سپر ہے ۔ آہ کرو تو دل سے اٹھے ۔ زاری کرو تو دل رو دے ۔ پیار کرے تو دل کرے ۔ بیزار ہو تو دل ہو ۔ دل سے سب مانوس ۔ دل سب سے مانوس ۔ دل سب کچھ جانتا ہے ۔ دل کو ہر شخص مانتا ہے ۔ مگر آج تک کسی کو یہ نہیں معلوم کہ دل کی حقیقت کیا ہے ؟ دل کہاں رہتا ہے ؟ دل پیدا ہوا تو کیونکر ؟ اور ہمیں ملا تو کہاں سے ؟

دل نے سینکڑوں گھر آباد کیے ۔ ہزاروں خانہ ویران ہوئے ۔ دل کے ہاتھوں رسوائیاں ہوئیں ۔ دل نے سینکڑوں شادیاں دیکھیں ۔ دل نے دل سے بگڑ کرائے ۔ پھر بھی دل سے دل کو آگاہی آج تک محال ہے ۔"

ملاحظہ فرمایا آپ نے کیا شوخی و شگفتی ، سادگی و سلاست ، روانی و صفائی اور عامیت و برجستگی کا عمدہ مرقع ہے ۔ دل نشینی ، دلکشی ، دلفریبی اور اس پر طرہ یہ کہ اختصار ہے ۔ ایسا زور بیان شاید ہی کہیں اور ادیب یا انشاء پرداز کے ہاں مل سکے ۔

غالب اور اقبال میں بہت سے خصائص شعری مشترک ہیں ۔

ابن اشتراک کا اظہار عبدالقادر نے کس قدر لطیف اور عمدہ انداز میں کیا ہے ۔ لکھتے ہیں :

''اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا تو ضرور کہتا کہ مرزا اسد اللہ خان غالب کو اردو اور فارسی شاعری سے جو عشق تھا اس نے ان کی روح کو عدم میں جا کر بھی چین نہ لینے دیا اور مجبور کیا کہ وہ پھر کسی جسد خاکی میں جلوہ افروز ہو کر شاعری کے چمن کی آبیاری کرے اور اس نے پنجاب کے ایک گوشے میں جسے سیالکوٹ کہتے ہیں ۔ دوبارہ جنم لیا اور محمد اقبال نام پایا ۔''[۱]

''تیغ و آتش فاتحان دنیا کے ہاتھ میں بڑی طاقتیں رہی ہیں ۔ ان سے انھوں نے سرکشان جہاں کو نیچا دکھایا ۔ زبان تیغ نے بڑے بڑے بدزبانوں کے منہ پر مہر سکوت لگائی ۔ زبان تیغ کا اثر دو پر ، چار پر ، دس پر ہوا تو تیغ زبان نے دو ہزار ، چار ہزار ، دس ہزار کو ایک وقت میں مطیع کیا ۔ جو فتوحات پیغمبروں کی مبارک زبانوں کی آب دار تلواروں نے دنیا کے مختلف حصوں اور مختلف زمانوں میں حاصل کی تھیں وہ آج تک قائم ہیں بلکہ دن بدن بڑھتی جاتی ہیں حالانکہ فاتحان دہر کے نام و نشان تک رفتہ رفتہ صفحۂ دہر سے محو ہوتے جاتے ہیں ۔ یوں تو ہر زبان میں مادۂ فصاحت ہے اور ہر زبان کو فصاحت سے بولنے والے گزرے ہیں مگر ایشیائی زبانوں میں یہ قوت بالطبع دوسری زبانوں سے بڑھ کر ہے ۔'' (فن تقریر)

۲۰۰۔ کلیات اقبال (اردو) ، ص ۹ ۔

''فن تقریر کی نسبت یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی دل سے اس کا شوق کرے تو یہ اسے کچھ نہ کچھ بنا دے گا ـ اس کا خاصہ ہے کہ میدانِ سخن میں بزدلوں کو دلیر کرتا ہے اور دلیروں کو شتر کرتا ہے ـ موجودہ زمانے میں فنِ تقریر شائستہ ممالک کے لیے ضروریاتِ زندگی میں داخل ہوگیا ہے ـ'' (فن تقریر)

''ہندوستان میں علوم و فنون کی ترقی کی راہ میں ایک رکاوٹ یہ رہی ہے کہ یہاں فنِ تنقید کا رواج نہیں تھا ـ آج کل بعض تحریرات میں کہیں کہیں ناقدانہ جھلک نظر آتی ہے مگر ایسی تحریریں ابھی تعداد میں اس قدر کم اور وہ جھلک ابھی ایسی خفیف ہے کہ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس فن کا رواج ہندوستان میں ہوگیا ہے - - - - مدرسوں میں بعض نیم مُلا ''کرٹسزم'' کے معنے ''نکتہ چینی'' پڑھاتے ہیں یا جھٹ بڑھے تو ''رائے زنی'' کہہ دیا ـ اس میں شک نہیں کہ ''کرٹسزم'' بعض اوقات نکتہ چینی ہوتی ہے مگر بعض اوقات تعریف بھی ہوتی ہے ـ اس لیے نکتہ چینی کچھ ٹھیک ترجمہ نہیں - - - - فن تنقید کے رواج کے لیے دو تدبیریں ہمارے ذہن میں ہیں ـ ایک تو یورپ کی بعض مشہور تصانیف میں سے وقتاً فوقتاً اس فن کی نسبت اقتباسات درج کرنا ، دوسرے فن تنقید کے اصول کے موافق آج کل کی بعض مشہور تصانیف کو تنقید کے ترازو میں تولنا اور نتیجہ بلا کم و کاست ظاہر کرنا - - - - یہاں مدت سے تقریظوں کا رواج رہا ہے ـ کوئی پرانا دیوان یا کتاب اُٹھا کر دیکھیے ، قلمی نسخہ ہو یا چھپا ہوا ، آخر میں صاحبوں کے صفحے

تقریظوں سے پُر ہیں - ہمیں یاد نہیں کہ آج تک کوئی ایسی تقریظ کسی کتاب کے ساتھ لگی ہو جس میں جہاں دس خوبیاں جتائی ہیں ایک آدھ نقص بھی جتا دیا گیا ہو - - - - - آپ ذرا کسی کتاب میں کوئی نقص بیان کیجیے - مصنف کے بیسیوں طرف دار آپ کی پگڑی آتارنے کو کھڑے ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ میں کتاب سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں - اس حالت میں آزادی سے تصانیف پر رائے دینے کا بیڑا اٹھانا ایک جہان سے دشمنی پیدا کرنا ہے - اس میں شک نہیں کہ رفتہ رفتہ تنقید کی برداشت لوگوں میں پیدا ہوتی جائے گی مگر ابتدا میں بہت سی مشکلات کا سامنا ہے -" (فن تنقید)

''اس سے بڑھ کر تصنع کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اکثر شعرا کو اس عظیم الشان اور وسیع ملک ہندوستان میں کوئی دو سچے عاشق و معشوق اہل ملک میں سے ایسے تلاش کرنے کا خیال نہ ہوا جن کی باہمی محبت کے قصوں سے وہ اپنی نظم میں کام لیں - چنانچہ ہم اپنے ملک کے دو جانبازان عشق کا ذکر کیا چاہتے ہیں اور ایک ایسے شاعر کا نام لیا چاہتے ہیں جس نے ان کے حسن و عشق کی داستان کو دوام کا خلعت بخش دیا ہے - افسوس ہے تو اتنا کہ اس شاعر نے زبان ایسی اختیار کی جو بدقسمتی سے علمی زبان نہیں ہے ورنہ سرزمین پنجاب کا یہ دلفریب قصہ شہرت کے پر لگا کر ہندوستان کے گوشے گوشے تک پہنچ گیا ہوتا -" (ہیر رانجھا)

ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے شیخ عبدالقادر کی تخلیقات کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہوگا - وہ خود اعلیٰ درجے کے محقق ، ادیب ، ماہر

تعلیم اور نقاد تھے - اُنھوں نے شیخ عبدالقادر کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا تھا :

''وہ ہماری قوم میں جامع حیثیات شخص تھے - اردو زبان کی جو بیش بہا خدمات اُنھوں نے کی ہیں وہ ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے - وہ اردو ادب کے اعلیٰ درجے کے ادیب اور نقاد تھے - انگریزی اور اردو دونوں زبانوں پر انھیں کامل قدرت تھی - اور جیسے وہ بہترین انشاء پرداز تھے ویسے ہی وہ مقرر تھے اور ہر موقع پر بے تکلف تقریر کرتے تھے - وہ بڑے زندہ دل ، خوش مذاق اور وسیع الاخلاق تھے - علاوہ ادب کے ان کی عام معلومات بہت وسیع تھیں - ان سے مل کر خاص مسرت ہوتی تھی اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ زندگی کے ہر موضوع پر نہایت بے تکلفی سے گفتگو کر سکتے ہیں -"[۱]

شیخ عبدالقادر کے مضامین و مقالات وغیرہ کی ترتیب و تدوین کا کام ان کی زندگی ہی میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے شروع کر دیا تھا - اس چیز کا پتہ اُس خط و کتابت سے چلتا ہے جو دونوں حضرات کے مابین ہوئی - اگرچہ ڈاکٹر زور کے خطوط دستیاب نہیں ہو سکے تاہم وہ خطوط موجود ہیں جو شیخ عبدالقادر نے جواب میں تحریر فرمائے - مثلاً ۷ ستمبر ۱۹۳۹ع کے خط میں شیخ عبدالقادر رقم طراز ہیں :

"مخزن کے بعد میں نے جو مضامین اردو میں لکھے انہیں اگر آپ جمع کر کے چھاپنا چاہتے ہیں تو ان کا پتہ بتانے میں آپ

---

۱ - اوراقِ نو (عبدالقادر نمبر ۱۹۵۰ع) ، ص ۳۰ -

کی مدد کرنے کو میں تیار ہوں ۔ صرف یہ بتا دیجیے کہ اس زمانے میں کئی دیباچے مصنفین کے اصرار پر ان کی کتابوں کے لیے لکھے گئے ۔ ایک سے ایک کا رنگ الگ ہے ۔ مثلاً سر اقبال" مرحوم کے اردو کلیات کا دیباچہ ، حفیظ صاحب جالندھری کے شاہنامے کا دیباچہ ، منشی سکھ دیو سنہا بسمل الہ آبادی کے دیوان کا دیباچہ ، مسٹر تلوک چند محروم کے دیوان کا دیباچہ ۔ اگر آپ ان کو شامل کرنا پسند کریں تو مجموعہ خاصا بڑا ہو جائے گا ، ورنہ بعض رسائل کے مضامین ہی ہیں اور بعض ان میں سے دیرپا بھی ہیں ۔"[1]

اسی طرح ڈاکٹر زور کے ایک اور مکتوب کے جواب میں شیخ عبدالقادر نے ۲۷ ستمبر ۱۹۳۹ع کو جو خط بھیجا اس میں لکھا :

"آپ نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اب میرے مضامین اور مقدمے الگ چھاپے جائیں ۔ میرے خیال میں مضامین اتنے نہ ہوں گے کہ ایک علیحدہ معقول جلد ان سے مرتب ہو سکے ۔ اس لیے دونوں کو یکجا چھاپنا بہتر ہوگا ۔[2] افسوس کہ میرے پاس کوئی یادداشت موجود نہیں ہے جس سے معلوم ہو کہ مضامین کہاں کہاں چھپے ہیں ۔ حافظے سے جو پتے اس وقت یاد ہیں وہ حسب ذیل ہیں ۔"[3]

چنانچہ اس خط میں شیخ عبدالقادر نے ڈاکٹر زور کو ایک طویل فہرست مضامین و مقدمات کے سلسلے میں ارسال فرمائی ، جس کو

---

۱ - نقوش مکاتیب نمبر (نومبر ۱۹۵۷ع) ، ص ۳۲۶ -
۲ - نقوش مکاتیب نمبر (نومبر ۱۹۵۷ع) ، ص ۳۲۶ -
۳ - نقوش مکاتیب نمبر (نومبر ۱۹۵۷ع) ، ص ۳۲۶ -

نقل کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا -

مندرجہ بالا خطوط سے مترشح ہوتا ہے کہ ڈاکٹر زور، شیخ عبدالقادر کے مضامین اور مقدمات وغیرہ کو الگ الگ مرتب کر کے شائع کرنا چاہتے تھے، لیکن بقول شیخ عبدالقادر اس وقت مضامین معقول تعداد میں انہیں دستیاب نہیں ہوئے تھے، چنانچہ انہوں نے ڈاکٹر زور کو مشورہ دیا کہ دونوں کو یکجا چھاپیں تو بہتر ہوگا - نیز سر شیخ عبدالقادر نے ڈاکٹر زور کو دیگر حوالہ جات کے علاوہ ان مضامین کی تفصیلات سے بذریعہ خطوط آگاہ فرمایا جو 'ادبی دنیا'، 'الپس نسواں'، 'شباب اردو'، 'نیرنگ خیال' وغیرہ میں شائع ہوئے تھے - علاوہ ازیں شیخ عبدالقادر نے ڈاکٹر زور کو لکھا ''مضامین عبدالقادر'' یا ''مقدمات عبدالقادر'' کچھ اچھا نام آپ کی مجوزہ کتاب کے لیے نہیں ہے - جب آپ اس کام کو شروع کریں گے تو کچھ اور نام سوچنا ہوگا -''[۱]

شیخ عبدالقادر نے ۴ دسمبر ۱۹۳۹ء کو ڈاکٹر زور کو جو خط نئی دہلی سے تحریر کیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ان کو منشی تلوک چند محروم کا دیوان اور ابوالاثر حفیظ جالندھری کے شاہنامے کی جلدیں بھی ارسال کیں - چنانچہ شیخ عبدالقادر اور ڈاکٹر زور کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا اور شیخ عبدالقادر انہیں مضامین و مقدمات وغیرہ کی نشاندہی کے علاوہ مطلوبہ مواد بھی فراہم کرتے رہے - ۱۷ ستمبر ۱۹۳۹ء کے خط میں شیخ عبدالقادر نے ابوالاثر حفیظ جالندھری مرحوم کے کتاب کے لیے مجوزہ نام

۱- نقوش مکاتیب نمبر (نومبر ۱۹۵۶ء)، ص ۳۲۸ -

"مضامین شیخ" یا "مضامین سر شیخ" سے ڈاکٹر زور کو مطلع فرمایا:

شیخ عبدالقادر کے جو مکاتیب ڈاکٹر زور کے نام سے دستیاب ہوئے ہیں ان سے یہی پتہ چلتا ہے کہ وہ مطلوبہ مواد کی نشان دہی کے علاوہ کتب و رسائل بھی فراہم کرتے رہے۔ تاہم ان سب باتوں کے باوجود بتیس سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے لیکن کوئی ادب پارہ منظر عام پر نہیں آیا۔ شیخ عبدالقادر ۹ فروری ۱۹۵۰ع کو راہی ملک عدم ہوئے، ڈاکٹر زور نے ۲۴ ستمبر ۱۹۶۲ع کو وفات پائی۔ ڈاکٹر زور کی دیگر موضوعات پر تصانیف و تالیفات تو ملتی ہیں لیکن شیخ عبدالقادر سے متعلق کوئی چیز نہیں ملتی۔ یہ خدمت شاید میرے مقدر میں تھی۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ یہ سعادت مجھے حاصل ہوئی۔ لیکن:

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

شیخ عبدالقادر نے ڈاکٹر زور کو یہ مشورہ دیا کہ چونکہ مضامین معقول تعداد میں نہیں ہیں اس لیے مضامین و مقدمات یکجا شائع کریں۔ لیکن میرے ساتھ یہ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ میرے پاس شیخ عبدالقادر کے دو سو سے زیادہ مضامین و مقالات موجود ہیں اور مکاتیب (جو ایک جلد پر مشتمل ہیں) الگ ہیں اور محترم پروفیسر حمید احمد خان صاحب مرحوم اور محترم جناب احمد ندیم قاسمی صاحب کے ارشاد کے مطابق میں نے ان مضامین اور مقالات کا انتخاب کیا ہے، جو ہدیۂ ناظرین ہے اور وہی اس بات کا فیصلہ فرمائیں گے کہ اس انتخاب میں میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں۔

سب سے پہلے مجھے شیخ عبدالقادر کے فرزند ارجمند جناب میاں[1] منظور قادر صاحب مرحوم ہلال پاکستان سابق وزیر خارجہ پاکستان و سابق چیف جسٹس مغربی پاکستان ہائی کورٹ، لاہور کا شکریہ ادا کرنا ہے جنھوں نے از راہ لطف و کرم نہ صرف میرا حوصلہ بڑھایا بلکہ ہر ممکن مدد کا یقین بھی دلایا۔ میاں صاحب موصوف نے مطبوعہ و غیر مطبوعہ مضامین و مکاتیب اور دیگر معلومات فراہم کرنے میں جس دریا دلی کا ثبوت دیا اس کے لیے میں ان کا جس قدر بھی شکریہ ادا کروں کم ہے۔ میں نے ایک طویل عرصے تک شیخ عبدالقادر اور میاں منظور قادر صاحب کی مشترک لائبریری سے پورا پورا استفادہ کیا۔ میاں صاحب موصوف نے جن مضامین و خطبات کی دو دو تین تین نقول تھیں ان کی ایک ایک نقول مرحمت فرمائی اور جن مضامین و خطبات کی نقول میں بآسانی نہ کر سکا، انھوں نے اپنے سٹینو گرافر سے ان کی نقول مہیا فرما دیں۔ ان سب باتوں کے لیے میں میاں منظور قادر صاحب مرحوم کا دلی طور پر ممنون ہوں۔

میں محترم جناب شیخ محمد نصیر ہمایوں صاحب مرحوم کا بھی ممنون ہوں کہ انھوں نے نہ صرف میاں منظور قادر صاحب سے ملاقات کا اہتمام کروایا بلکہ شیخ عبدالقادر کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مضامین و مکاتیب بھی فراہم کیے۔ نیز وہ قدم قدم پر میری رہنمائی کرتے رہے۔

محترم بزرگ جناب شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی مرحوم نے بھی مواد کی فراہمی میں مدد فرمائی۔ اس کے لیے میں شیخ صاحب موصوف

[1] - جناب منظور قادر مرحوم "شیخ" کہلوانے کی بجائے "میاں" کہلوانے کو ترجیح دیتے تھے۔

کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں ۔

میں محترم و مکرم جناب پروفیسر حمید احمد خاں صاحب مرحوم کا ازحد ممنون احسان ہوں کہ ان کی ذاتی دلچسپی ، توجہ اور اہتمام سے زیر نظر کتاب کا مسودہ مجلس نے اشاعت کے لیے منظور کیا ۔

محترم جناب احمد ندیم صاحب قاسمی بھی میرے خصوصی شکریے کے مستحق ہیں کہ ان کی ذاتی دلچسپی اور توجہ سے کتاب زیور طبع سے آراستہ ہو کر آپ کے ہاتھوں میں ہے ۔

میں محترم نواب مشتاق احمد خاں ، پروفیسر منظور الحق صدیقی ، قاضی افضل حق قرشی ، انوار قمر ، مناظر عالم اور محمد اسلم صاحب کا بھی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مواد کی فراہمی میں میری معاونت فرمائی ۔ میں عزیز دوست مقبول جہانگیر صاحب اور احمد رضا صاحب کا بھی احسان مند ہوں کہ انھوں نے مضامین کی ترتیب کے سلسلے میں مفید مشورے دیے ۔

مجھے امید ہے کہ اردو زبان و ادب سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب بہت مفید ثابت ہوگی ۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

محمد حنیف شاہد
۲/۳ - خالد بن ولید روڈ ، سمن آباد
لاہور

* * *

شباب سے پہلے[1]

یادش بخیر ! پطرس[2] نے ایک دفعہ لاہور کا جغرافیہ لکھا تھا اور طنزاً یہ کہا تھا کہ جغرافیہ لاہور میں آب و ہوا کا باب نہیں کیونکہ لاہور میں آب و ہوا ہی نہیں - اسی طرح میرے بچپن کی تاریخ انوکھی ہے - اس میں بچپن کا باب ہی نہیں ملتا یعنی بچپن کا زمانہ آیا اور گزر گیا -

بچپن کا زمانہ عجیب بےفکری کا زمانہ ہوتا ہے - جو لوگ اسے بادشاہی کا زمانہ کہتے ہیں بجا کہتے ہیں - ماں ، باپ ، خویش و اقارب سب بچے کی خبر گیری کرتے ہیں اور اسے خوش رکھنے اور بہلائے رکھنے کی کوشش کرتے ہیں -

بچپن کا اصل لطف اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب بچہ چلنے لگتا ہے اور کھیل کود کا وقت شروع ہوتا ہے - مجھے خدا نے زندگی کی بہت سی نعمتیں بخشیں مگر بچپن کی نعمت ذرا ادھوری سی رہی - میں اپنے ماں باپ کی آخری اولاد تھا اور ان کے بڑھاپے میں

---

۱ - سر شیخ عبدالقادر کا خود نوشت مضمون ''بڑوں کا بچپن ـــــ شباب سے پہلے'' تالیف آغا شیدا کاشمیری ، مطبوعہ مطبع عثمانی کراچی سے ماخوذ ہے -

۲ - سید احمد شاہ پطرس بخاری (یکم اکتوبر ۱۸۹۸ع ـــــ ۵ دسمبر ۱۹۵۸ع) اعلیٰ درجے کے ادیب اور مشہور و معروف مزاح نگار تھے - مضامین طنز و مزاح کا حسین و جمیل مرقع ہیں - نقوش کا پطرس نمبر ایک یادگار حیثیت رکھتا ہے -

پیدا ہوا تو اس لیے گھر بھر میں سب مجھ سے بڑے تھے اور میں اکیلا بچہ تھا ۔ میرے والد مرحوم اس وقت بسلسلۂ ملازمت لودھیانہ میں رہتے تھے اور ہمارا مکان شہر کے بیرونی حصے میں ایک ایسے محلے میں تھا جس کے قریب ہماری طرز کے لوگ نہیں رہتے تھے ۔ اس لیے کسی ہمسائے کے گھر ہمارے ہاں سے آنا جانا تھا اور نہ وہ لوگ یا ان کی عورتیں اور بچے ہمارے گھر آتے تھے ۔ دن میں جب میرے والد کام پر چلے جاتے تھے اور میری والدہ مرحومہ گھر کے کام کاج میں لگ جاتی تھیں تو میرے ساتھ کھیلنے والا یا مجھ سے بات چیت کرنے والا کوئی نہ ہوتا تھا ۔ میری دو بیاہی ہوئی بہنیں گھر میں تھیں مگر ان میں سے ایک مجھ سے کوئی بیس برس بڑی تھی اور دوسری کوئی پندرہ برس ۔ اس لیے سوائے اس کے کہ وہ کسی وقت ادھر آدھر آتے جاتے میرے سر پر ہاتھ پھیر جائیں انھیں اپنے کام رہتے تھے ۔ میں گھر کے صحن میں کسی ایک طرف تنہا بیٹھا اپنا دل بہلاتا رہتا تھا ۔ خیالی طور پر سوچتا تھا کہ میں بڑا ہو گیا ہوں اور میرے بہت سے دوست ہیں اور کبھی ان میں سے کوئی اور کبھی کوئی میرے ہاں بطور مہمان آتے ہیں ۔ کوئی گھوڑے پر ، کوئی گاڑی پر اور میں ان کے ٹھہرانے اور ان کے گھوڑے گاڑی کو جگہ دلانے میں مصروف ہوں ۔ یا کوئی اور اسی طرح کے خیالی پلاؤ پکاتا رہتا تھا ۔

جب میں چار برس چار مہینے اور چار دن کا ہوا تو میری بڑی بہن نے مجھے بغدادی قاعدہ پڑھانا شروع کیا ۔ میں چند دنوں میں حرف شناس ہو گیا اور مجھے ایک مولوی صاحب کے ہاں قرآن مجید پڑھنے کے لیے بھیجا جانے لگا ۔ میرا دن قدرے مصروف ہونا شروع ہوا

اور تنہا اکیلے کی جگہ مولوی صاحب کے گھر میں جانے اور وہاں سے پچھلے پہر واپس آنے کا ایک مشغلہ سا بن گیا ۔ میں نے چھ مہینے میں قرآن مجید ناظرہ پڑھ لیا اور اس کے ختم کے بعد شہر کے ابتدائی مدرسے میں داخل ہوگیا ۔ ان دنوں مدرسوں میں کھیلوں کا رواج کم تھا ۔ سارا وقت پڑھنے لکھنے میں ہی لگتا تھا ۔ اس لیے میرا معمول یہی رہا کہ نوکر کے ہمراہ مدرسے چلا گیا اور اس کے ہمراہ گھر آ گیا ۔ اس لیے بچپن میں جو کھیل کود کی مصروفیات اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ ہوتی ہیں ان سے میری ابتدائی زندگی خالی رہی ۔ نہ کسی سے لڑنے جھگڑنے کی نوبت آئی ، نہ کسی سے مار کھائی نہ کسی کو مارا ۔ اس سبب سے جسمانی ترقی اس زمانے میں خاطر خواہ نہ ہو سکی ، البتہ یہ ضرور ہوا کہ بڑوں کو زیادہ قریب سے دیکھنے اور بڑوں سے ملنے کے مواقع مجھے بچپن میں ہی اتنے ملے جتنے اکثر بچوں کو اس ملک میں نہیں ملتے ۔

میرے والد مرحوم اپنے وقت فرصت میں مجھے اپنے ساتھ رکھتے تھے ۔ شام کو وہ سیر کو نکلتے تو مجھے ساتھ لے جاتے اور مجھ سے باتیں کرتے جاتے تھے ۔ واپس آتے تھے تو میں ان کی تکان رفع کرنے کے لیے ذرا ان کے پاؤں دابتا تھا اور ان سے دعا لیتا تھا ۔ کبھی کبھی وہ صبح کو بھی باہر نکلتے تھے اور اپنی والدہ کی قبر پر جا کر فاتحہ پڑھتے تھے ۔ ان کی اس سعادت مندانہ زندگی اور ان کے مذہبی خیالات کا گہرا اثر اسی زمانے سے میرے قلب پر ہوگیا اور اس کا کچھ بقایا اب تک موجود ہے ۔

عجب اتفاق ہے کہ گھر میں بڑوں کی صحبت ملی تھی تو باہر بھی اسی قسم کا سلسلہ رہا ۔ شہر کے مشہور اور ذی مرتبہ لوگوں

میں والد صاحب کی ملاقات ہت تھی ۔ لودیانہ کابل سے آئے ہوئے
ایک پناہ گزین شاہی خاندان کے قیام کی جگہ تھی ۔ افغانستان کے
شاہ شجاع کی اولاد وہاں جاگزیں تھی ۔ ان میں شاہ زادہ شاپور ہت
وجیہ اور شاندار تھے ۔ ان کا بنگلہ اور اس کے گرد کا باغ ہت
خوب صورت اور پھولوں سے آراستہ تھا ۔ میں کبھی کبھی اپنے
ابا جی کے ساتھ شاہ زادہ صاحب کی خدمت میں جاتا تھا ، اور وہ
مجھے پاس بٹھاتے اور مہربانی کرتے تھے ۔ میرے دل میں اس خیال
سے کہ یہ ایک والی ملک کی اولاد اور اب بے وطن ہیں اور اس
امید میں بیٹھے ہیں کہ شاید دور زمانہ ایسا ہو جائے کہ وہ دوبارہ
اپنا کھویا ہوا تخت پا لیں ، ان سے ہت ہمدردی پیدا ہوتی تھی ۔
ان کی زبان سے فارسی بولی سن کر مجھے ہت فرحت ہوتی تھی ۔
کیونکہ میرے کان گھر میں بھی فارسی الفاظ سے آشنا تھے ۔ میرے
والد کتابی فارسی خوب جانتے تھے اور مجھ سے فرمایا کرتے تھے کہ
مدرسہ کے وقت کے بعد میں ان سے فارسی سیکھ لیا کروں ، کسی وقت
کام آئے گی ۔ اور گو فارسی میں نے ان سے بعد میں سیکھی مگر ان کی
زبان سے فارسی اشعار بچپن ہو میں سننے کا موقع ملتا رہا ۔ افغان
شہزادوں کے خاندان کے سوا لودیانہ میں دہلی اور نواح دہلی کے
کچھ شرفا اور بعض نواب پناہ گزین بھی آباد تھے ۔ ان کے گھر
ایسے آراستہ تو نہیں تھے جیسے کابل کے شہزادوں میں دو تین بڑے
شہزادوں کے تھے مگر پھر بھی ان کی رہائش ہت اُجلی تھی ۔ گھر
کے باہر ایک چھوٹا سا باغیچہ ہر ایک نے لگا رکھا تھا ۔ ان میں ایک
تخت پوش پر سفید چادر بچھی ہوتی تھی اور گاؤ تکیہ لگا ہوتا تھا ۔
صاحب خانہ شام کے قریب باہر نکل کر بیٹھتے اور اپنے دوستوں سے

خوش گپی کرتے یا کبھی کبھی اکیلے بیٹھے ستار بجاتے رہتے تھے۔ ان کے گھر کے قریب ہم جب کبھی گزرتے مجھے یہ منظر بہت ہی دل چسپ معلوم ہوتا تھا۔ یہ محلہ گویا اردو والوں کا خاص گھر تھا۔ اس کے سوا ایک اور جماعت جس کے بہت سے اراکین اور افراد لودیانہ میں سکونت رکھتے تھے، خطۂ کشمیر کے رہنے والوں کی تھی۔ ان کے تین طبقے اس شہر میں آباد تھے۔ کچھ حضرات تو خواجہ کے لقب سے ممتاز تھے۔ تجارت میں فروغ پا کر اچھے امیر ہوگئے تھے اور بہت آرام کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کے ایک گروہ کے ہاں میرے والد اکثر جاتے تھے اور میں ان کے ہمراہ ہوتا تھا اور تجارت میں ان کی اور ان کے خاندان بھر کی مصروفیات اور ان کی خوش حالی دیکھ کر مجھے خوشی ہوتی تھی۔ وہ سب اردو اور پنجابی بھی بولتے تھے، مگر آپس میں کشمیری میں بھی باتیں کرتے تھے۔ اور یہ طبقہ کشمیر کے لوگوں کا نان اور کلچے اور باقرخانی بنانے اور بیچنے کا کام کرتا تھا اور اپنے فن میں اچھا کمال رکھتا تھا۔ تیسرا طبقہ محنت مزدوری سے اپنا پیٹ پالتا تھا اور لکڑی کے چیرنے پھاڑنے کی مہارت رکھتا تھا۔

اس طرح ان مختلف طبقات آبادی کو دیکھنے، ان کی مدد کرنے اور ان کو سمجھنے کی صلاحیت مجھ میں پیدا ہوگئی اور میری طبیعت انواع و اقسام کے لوگوں سے مانوس ہوگئی اور ان کی بولیوں کو سننا مجھے دل چسپ معلوم ہونے لگا۔ یہ ذوق بعد میں میرے لسانی مذاق کی ہمہ گیری میں ممد ثابت ہوا۔ خاص کر زبان اردو سے مناسبت اور اس کا شوق اسی ابتدائی زندگی کی پیداوار ہے کیونکہ مختلف انواع کی آبادی، جو لودیانہ میں مقیم تھی، اردو کو ہی بطور

مشترکہ زبان کے استعمال کرتی تھی ۔

میں ابھی پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا اور میری عمر دس سال کے قریب تھی کہ میرے والد پنشن لے کر اپنے بزرگوں کے وطن قصور میں آ گئے جو ضلع لاہور میں ایک مشہور اور پرانا شہر ہے، اور میں وہاں کے مدرسے میں پڑھنے لگا ۔ اصل بچپن تو دس سال کی عمر تک ختم ہو چکتا ہے اور بچپن کا یہ مختصر سا حال یہاں ختم ہو جانا چاہیے مگر قصور کے ایک دو سال اور بچپن میں شامل کرنے بے جا نہ ہوں گے ۔

قصور کے مدرسے میں پڑھائی کے سوا ورزش اور کھیلوں کا بھی کچھ رواج شروع تھا لیکن چونکہ میرا ابتدائی زمانہ ورزش اور کھیل سے خالی رہا تھا اس لیے پڑھائی میں تو آتے ہی میرا شمار اچھے لڑکوں میں ہوگیا مگر کھیل میں شرکت برائے نام رہی ۔ ہمارے مدرسے میں گیند بلے کی ایک ٹیم تھی ۔ استاد نے اس میں شریک ہونے کو مجھے کہا مگر میں ہی ہچکچاتا تھا ۔ استاد نے مجھے اس ٹیم کا سکریٹری مقرر کر دیا اور اس سبب سے میرا ٹیم کے ہمراہ روز جانا تو ضروری ہوگیا مگر کھیل کود میں ڈرتا ہوا شریک ہوتا تھا اور اس میں کچھ ترقی نہ کر سکا ۔ شہر میں ہماری برادری کے گھر جس محلے میں تھے اس میں میرے ہم عمر بچے بہت سے تھے ۔ وہ اکثر شام کے قریب کھیل کود کے لیے اکٹھے ہو جاتے تھے ۔ انہیں اور کھیلوں کے علاوہ آنکھ مچولی کھیلنا پسند تھا ۔ میں بھی ایک کھلے سے میدان میں، جو ہمارے گھروں کے سامنے تھا، ان سے مل کر کھیلنے جاتا تھا ۔ مگر میری دل بستگی کھیلوں سے بہت کم تھی اور

یوں بھی مجھے میری والدہ مرحومہ کا حکم تھا کہ "سر شام گھر واپس آ جایا کرو" اور میں اس حکم کو پابندی کے ساتھ ماننے کی کوشش کرتا تھا۔

مدرسے کے معلموں میں ایک مولوی صاحب تھے جنھیں شوق تھا کہ لڑکوں کو تقریر کرنا سکھائیں ۔ آنھوں نے پرائمری کے اوپر کی جماعت اور مڈل کی جماعتوں کی ایک مجلس بنائی جس کے جلسے وہ ہفتے میں ایک بار کرتے تھے اور خود صدر جلسہ ہوتے تھے ۔ لڑکوں کو کوئی مضمون دیا جاتا تھا جس پر وہ اپنی بساط کے موافق کچھ لکھ کر لاتے تھے اور پڑھ کر سناتے تھے ۔ میں اس مجلس میں شریک ہوگیا اور جب میں نے پہلی دفعہ چھوٹا سا مضمون لکھا اور جھجک کے بغیر پڑھ کر سنایا تو مجھے بہت شاباش ملی اور مجھے تقریر کی مشق کا شوق پیدا ہو گیا جو بعد کو بڑے ہوکر بھی جاری رہا ۔ اس کی بدولت تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مجھے قومی مجالس میں تقریر کرنے کے بےشمار موقعے ملے ۔

میں کوئی تین برس تک قصور میں رہا اور وہاں سے مڈل پاس کر کے لاہور میں آ گیا ۔ میری جوانی لاہور میں شروع ہوئی اور لاہور میں بسر ہوئی اور بعد کو لاہور سے اتنے گہرے تعلقات ہوگئے کہ لاہور ہی میرا وطن ہوگیا ۔

* * *

جب آتش جواں تھا[1]

لکھنؤ کے مشہور شاعر آتش[2] کی زندگی میں اگر ریڈیو ایجاد ہو چکا ہوتا اور ریڈیو کے کار پرداز آتش کو اپنی نشرگاہ تک لانے میں کامیاب ہو جاتے تو وہ کہانی ضرور سننے کے لائق ہوتی جب آتش جواں تھا - جوانی یونہی ہوتی ہے - آتش جیسے شاعر کی جوانی اور بھی بلا ہوگی - مگر ہر پیر مرد کی جوانی ایسی نہیں ہوتی جسے افسانہ بنایا جا سکے -

میری جوانی ایسی ہی تھی جیسی اکثر یونیورسٹی سے ڈگری پانے والوں کی ہمارے زمانے میں ہوتی تھی - اس زمانے میں اور آج کل کے دور میں پچاس سال کا فرق ہے - پچاس سال میں دنیا بہت بدل گئی ہے - ان دنوں آج کل کی آزادیاں کہاں تھیں - تب لاہور کی ٹھنڈی سڑک پر یہ ہوٹل اور ریسٹوران نہ تھے - جہاں ہر سہ پہر اور ہر شام کے کھانے پینے کے ساتھ بازار رقص گرم ہوتا ہے اور نوجوان لڑکے لڑکیاں مل کر ناچتے کودتے اور ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کرتے ہیں - سنیما کی بولتی ہوئی تصویریں ابھی وجود

۱- سر عبدالقادر مرحوم کا یہ قلمی اور غیر مطبوعہ مضمون موصوف کے فرزند ارجمند جناب منظور قادر صاحب ، ہلال پاکستان ، سابق وزیر خارجہ پاکستان و سابق چیف جسٹس مغربی پاکستان ہائی کورٹ لاہور نے مرحمت فرمایا -

۲- خواجہ حیدر علی آتش (۱۷۷۸ع—۱۸۴۷ع) اردو و فارسی کے شاعر - آتش کا سرمایۂ شاعری ان کی غزلوں کے دو دیوان ہیں جو لکھنؤ سے یکے بعد دیگرے ۱۸۴۵ع اور ۱۸۵۲ع میں شائع ہوئے -

میں نہیں آئی تھیں ۔ پینے والے خال خال تھے اور جو تھے وہ چھپ کر پیتے تھے ۔ زیادہ سے زیادہ تفریح یہ تھی کہ کوئی ناٹک کمپنی پھرتی پھراتی آ نکلی تو مہینہ دو مہینے چھل پہل رہتی تھی ۔ نوجوانوں کی بھیڑ بھاڑ ناٹک کے عارضی منڈووں کے گرد نظر آتی تھی ۔ بعض کالجوں کے طالب علم ، جو کالج کے ہوسٹلوں میں رہتے تھے ، اپنے نگران افسر کی اطلاع کے بغیر راتوں کو کھڑکیوں میں سے کود کر کھیل دیکھنے جاتے تھے اور آدھی رات کے بعد چپکے سے واپس آ کر اپنے کمروں میں سو رہتے تھے اور یہ ان کی طالب علمانہ زندگی میں ایک قابل یاد واقعہ ہوتا تھا ۔ اس زمانے میں طالب علم زیادہ وقت مطالعے اور کتب بینی میں صرف کرتے تھے اور کالج کے بعد کے اوقات بھی عموماً امتحانوں کی تیاری میں صرف کرتے تھے ، اس لیے وہ طلبہ جسمانی لحاظ سے عموماً کمزور ہوتے تھے ۔

آن دنوں چند بے تکلف دوستوں کے سامنے میں نے اس بارے میں یہ رائے ظاہر کی تھی کہ کالجوں میں پڑھے ہوئے نوجوانوں کو آن نوجوانوں کے مقابلے میں ، جو کالج کی چکی میں نہ پسے گئے ہوں، جوانی کی دولت کا ایک چوتھائی حصہ ملتا ہے ۔ اور میرا اب بھی یہ خیال ہے کہ اس وقت کے حالات کے مطابق یہ رائے غلط نہ تھی ۔ میری جوانی یہی محدود سرمایہ ساتھ لے کر زندگی کے عملی دور میں داخل ہوئی ۔ جو کام پہلے اختیار کیا وہ ایک انگریزی اخبار کی سب ایڈیٹری تھی۔ اس میں وقت بہت دینا پڑتا تھا اور تنخواہ قلیل تھی اس لیے : ''یاراں فراموش کردند عشق''

کا مضمون حسب حال تھا ۔ یہ غنیمت تھا کہ اس کام میں دل لگتا

تھا اور جسمانی اور دماغی کوفت کی تلافی اطمینان قلب سے ہوتی رہتی تھی ۔ یہ محسوس ہوتا تھا کہ میں کچہری یا دفتر کے محرروں کی طرح مزدورانہ طور پر قلم نہیں گھساتا تھا بلکہ قلم کے ہر رشحہ سے اپنے ملک یا قوم کی خدمت کر رہا ہوں ۔ کسی کا خیال بدل رہا ہوں اور کسی کو گمراہی سے بچا رہا ہوں ۔ یہ مشغلہ بجائے خود دلچسپ تھا اور جب میری سب ایڈیٹری ترقی کرتے کرتے ایڈیٹری سے بدل گئی تو اور بھی دلچسپ معلوم ہونے لگا ۔ مگر کبھی کبھی طبیعت میں بے چینی سی پیدا ہوتی تھی جو غالباً اس ۲۰/۱ نوعمری کے سبب تھی جو میرا سرمایۂ جوانی تھا ۔ اس بے چینی کی تسکین کے لیے میں نے اپنے گرد و پیش اپنے ہم عمر نوجوانوں کا ایک مختصر سا حلقہ جمع کیا جن کے پاس بیٹھ کر میں اوقات فرصت گزارتا تھا ۔ مجھے فرمائش ہوتی تھی کہ جو اشعار مجھے یاد ہوں انھیں سناؤں ۔ مجھے گانا تو نہیں آتا تھا مگر ایک سیدھی سی لے آتی تھی جو مجھے خود بھی بھاتی تھی اور میرے دوست بھی اسے پسند کرتے تھے ۔ میں لے میں غزل خوانی کرتا تھا ۔ دوستوں میں بھی دو ایک خوش آہنگ تھے ۔ وہ بھی غزلیں اور گیت سناتے تھے ۔ اس مشغلے میں کئی سالوں کی نشست آدھی رات تک یا اس کے بعد تک رہتی تھی ۔ بسا اوقات یہ بھی ہوتا تھا کہ ہم لوگ جہاں بیٹھے ہوں وہیں سو جاتے تھے کیونکہ اپنے اپنے گھروں میں جانے کا وقت نہیں رہتا تھا ۔ اگر کئی چارپائیاں نہیں ہوتی تھیں تو فرش پر دراز ہو جاتے تھے ۔ ایسے موقعوں کو یاد کر کے مجھے اب حالی کا یہ شعر اکثر یاد آتا ہے :

خواب راحت میں وہ تیری لذت اے پیری ہی تھی
جو جوانی میں مزا دیتی تھیں شب بیداریاں

آسی زمانے کے واقعات میں ایک دن کا ذکر ہے کہ ہمارے حلقۂ احباب نے یہ فیصلہ کیا کہ تھیٹر کا ایک تماشا دیکھنے امرتسر چلیں ۔ ایک مشہور پارسی کمپنی وہاں ناٹک کے تماشے دکھا رہی تھی ، اور چونکہ اس نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ لاہور نہیں آئے گی بلکہ وہیں سے دہلی یا کسی اور مقام کو چلی جائے گی ، اس لیے شائقین بہ کثرت راتوں کو لاہور سے امرتسر جاتے تھے اور صبح کو واپس آتے تھے ۔ ہم نے بھی یہی کیا ۔ بارہ ایک بجے تک کھیل دیکھا ۔ پھر ایک دوست کے ہاں رات چند گھنٹے گذارنے کا بندوبست کیا اور صبح کی پہلی گاڑی میں سوار ہو کر لاہور واپس آئے ۔ جب لاہور اسٹیشن پر اترے تو سینکڑوں اور لاہوری نظر آئے جن میں کئی ہمارے ملاقاتی تھے ۔ ان میں سے کسی نے مجھے دیکھ کر اخبار کے ایڈیٹر کی حیثیت سے مجھ پر طعن آمیز لہجے میں آوازہ کسا کہ ''لیڈران قوم کہاں سے تشریف لائے ہیں ؟'' میں نے جواب میں یہ نعرہ لگایا ''لیڈر یہ دیکھنے گئے تھے کہ قوم دوسرے شہر میں کیا کرنے گئی تھی'' ۔ معترض صاحب تو چپکے سے گھر کو چل دیے اور میں غالب کا یہ شعر اپنے ہمراہیوں کو سنا رہا تھا :

کہاں میخانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

جوانی کی دل چسپیوں میں ایک نہایت قابل یاد دل چسپی اقبال مرحوم کی دوستی سے پیدا ہوئی جس نے دور تک ساتھ دیا ۔ وہ اُس وقت کالج میں پروفیسر تھے ۔ انھوں نے شہر میں میرے پرانے مکان کے قریب ایک چھوٹا سا مکان کرایہ پر لیا ۔ ہماری ملاقات تو پہلے ہو چکی تھی ، شہر کی ہمسائیگی نے ہم نشینی کے مزید مواقع فراہم کر

دیے - میں شام کو ان کے ہاں جا بیٹھتا - ان کے دو تین اور دوست وہاں موجود ہوتے تھے - ان میں ایک تو ان کے استاد مولانا میر حسن[1] کے فرزند سید محمد تقی[2] تھے - ان کی دوستی بہت پرانے تعلقات پر مبنی تھی - شیخ اقبال بھی اور سید تقی بھی حقے کے بہت شائق تھے - سیالکوٹ کے ایک اور صاحب سید بشیر حیدر بھی تھے جو اس وقت طالب علم تھے - بعد ازاں ڈپٹی ہو گئے تھے - ایک اور طالب علم سردار عبدالغفور تھے جو ابو صاحب کہلاتے تھے - یہ سب اقبال کی شاعری کے مداح تھے - میں جاتا تو سلسلۂ شعر شروع ہو جاتا - میں کوئی شعر یا مصرع اقبال کو سنانے کے لیے ڈھونڈ رکھتا جو طرح کا کام دے جاتا - وہ حقہ پیتے جاتے اور شعر کہتے جاتے تھے - ابو صاحب کاغذ اور پنسل لے کر لکھنا شروع کر دیتے - اقبال کے ابتدائی کلام کا بیشتر حصہ اسی طرح لکھا گیا - ابو صاحب ایک مجلد بیاض میں اپنی پنسلی یادداشتیں صاف کر کے لکھ لیتے تھے - اگر ابو صاحب کا تیار کیا ہوا رسالہ موجود نہ ہوتا تو ہمارے مرحوم دوست کا بہت سا کلام چھپنے سے رہ جاتا کیونکہ وہ اس زمانے میں اپنے پاس کوئی مسودات نہیں رکھتے تھے - جو اشعار ہمارے سامنے کہے جاتے تھے انھیں شیخ اقبال ترنم سے پڑھتے تھے - ان کی خوش نوائی سننے سے تعلق رکھتی تھی - لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتی - یہ دل چسپی جوں جوں بڑھتی گئی اس میں اور میرے

۱- علامہ اقبال کے استاد گرامی - شمس العلما کا خطاب سر اقبال کے ایما پر مرحمت ہوا تھا - آپ ایک جید عالم اور فارسی کے بہترین استاد تھے -

۲- جناب سید محمد تقی گورنمنٹ ہاؤس کے سکول کے منتظم تھے - شمس العلما کا تمغہ آپ نے بھی وصول کیا تھا -

دوسرے حلقۂ احباب کے مشاغل میں تصادم ہوا - اب زیادہ شامیں اقبال کے ہاں صرف ہونے لگیں -

اسی زمانے میں ادب اردو کی خدمت کا شوق پیدا ہوا اور خواب جوانی کی تعبیر نے ادبی رسالے کی صورت میں جنم لیا اور "مخزن"[1] نام پایا - انگریزی اخبار کے ساتھ ساتھ اردو مضامین کی فکر ہونے لگی - سارے ہندوستان کے ادیبوں اور شعرا سے خط و کتابت شروع ہوئی - سب نے اس تجویز کا محبت اور جوش سے خیر مقدم کیا اور نظم و نثر کے اچھے نمونے بھیجے - جب کہیں سے اچھا مضمون ڈاک میں آتا تھا تو ایسی خوشی ہوتی تھی جیسے کوئی بیش بہا چیز ہاتھ آگئی ہو - کبھی کبھی بعض مجالس میں شرکت کی غرض سے دور دور مقامات تک جانا ہوتا تھا - میں جہاں جاتا ماہران ادب کی تلاش رہتی - ان سے ملتا تھا اور ان کے حسن طبیعت سے لطف اندوز ہوتا تھا - حسن طبیعت حسن صورت سے کم پُر اثر نہیں ہوتا - ایک ایک ملاقات کا نشہ مدتوں رہتا تھا - حضرت مونس[2] لکھنوی کے کلام کا ایک مشہور بند ان ملاقاتوں پر خوب چسپاں ہے -

---

۱ - "مخزن" کا پہلا شمارہ اپریل ۱۹۰۱ء میں لاہور سے منظر عام پر آیا - سر عبدالقادر کا انگریزی اخبار آبزرور سے بحیثیت سب ایڈیٹر ۱۸۹۴ء میں تعلق ہوا - ۱۸۹۵ء میں موصوف اس کے ایڈیٹر ہوگئے اور یہ تعلق ان کے ولایت جانے یعنی ۱۹۰۴ء تک رہا -

۲ - میر محمد نواب مونس لکھنوی (متوفی ۱۸۷۵ء) میر انیس کے چھوٹے بھائی - مرثیہ گوئی میں میر انیس سے کم نہ تھے لیکن گوشہ نشینی کی وجہ سے شہرت حاصل نہ کر سکے -

بندہ نہیں ایسا کہ مرے گنبدنوں پر
یا ہو متوجہ کبھی غنچہ دہنوں پر
یا میل کرے عطر فشاں پیرہنوں پر
ہاں طبع جو مائل ہے تو رنگیں سخنوں پر
شاہد ہے خدا ، یار موافق ہوں تو اُن کا
شیدا ہوں تو اُن کا ہوں جو عاشق ہوں تو اُن کا

رنگیں سخنوں کی تلاش ایسی جاری تھی کہ آب و دانہ کی کشش مجھے انگلستان لے گئی - انگریزی اخبار تو اپنی ملکیت کی چیز نہ تھی ، بہ یک انکار اپنے نائب کے حوالے کیا - اردو رسالہ اپنا تھا ، اسے جاری رکھا اور اس کے لیے نئے مضامین سفر و سیاحت کے دلوں میں بھی لکھے - جو وقت اور حالات لندن کی سیر و تفریح میں کٹا وہ ہندوستان کے اخباری مشاغل کی نظر ہونے لگا ---- میں نے وہاں سے "مخزن" میں ایک سلسلہ مضامین لکھا جس کا عنوان تھا "نت نئے نظارے"[۱] یورپ کے اور ممالک بھی اس دوران میں دیکھے - وہاں کے قدرتی مناظر بہت دل کش ہیں - جی نہ چاہا کہ میں تنہا ان کا لطف اٹھاؤں - ان کا حال لکھ کر بہت سے اپنائے وطن کو ان کی نا مکمل سی تصویر دکھادی (یہاں "مقام خلافت" یعنی سفر استانبول کی طرف اشارہ ہے) -

انگلستان میں جو زمانہ گزرا اس کے سلسلے میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ اقبال مرحوم بھی مجھ سے ایک سال بعد وہاں پہنچے اور

۱ - یہ سر عبدالقادر کی پہلی اردو تصنیف ہے جس میں استانبول کے علمی ، ادبی ، ثقافتی اور معاشرتی حالات بالتفصیل بیان کیے گئے ہیں - اس کا پہلا ایڈیشن مخزن پریس لاہور سے ۱۹۰۶ع میں چھپا تھا -

دو سال کے مشاغل میں میری اور ان کی معیت رہی - وہ کیمبرج میں رہتے تھے اور میں لندن میں مگر وہ جب لندن آتے تو میرے ہاں ٹھہرتے یا میرے قریب کسی مکان میں کمرہ لیتے تھے - اور میں کبھی کبھی ان سے ملنے کیمبرج جاتا تھا - ان کی نشست ان دنوں زیادہ تر مولوی سید علی بلگرامی[1] مرحوم کے ہاں رہتی تھی جو ہندوستانی طلبہ کی علمی اور ادبی صحبتوں کا مرکز تھا - میں جب آخری مرتبہ وہاں گیا تو میرے ایک دوست نے میرے لیے چائے کی دعوت کی - ہم سب دریائے کیم کے کنارے ، جس سے کیمبرج کا نام بنا ہے ، سیر کے لیے گئے - ایک خاتون کے پاس (فوٹو کا) کیمرا تھا - وہ ہمارے مجمع کی تصویر لینے لگیں - مجمع کیمرے کے سامنے ترتیب پا رہا تھا کہ روشنی نے دھوکا دیا اور آفتاب نے بادل کا نقاب منہ پر ڈال لیا - یوں تو دھوپ چھاؤں بدلتے رہتے ہیں لیکن مشرقی ملکوں میں تو پھر بھی برسات کے سوا ان کا کچھ ٹھکانا ہوتا ہے اور ان کے وقتوں پر انحصار ہوسکتا ہے مگر انگلستان میں آفتاب اکثر نایاب ہوتا ہے - کسی دن صبح کو شکل دکھاتا ہے تو شام کو ندارد اور کسی دن شام کے قریب ذرا سی جھلک دکھاتا ہے - جس دن پورا وقت حاضر ہے وہ دن گویا ایک جشن کا دن ہے - آفتاب کو منہ چھپاتے دیکھ کر

---

۱ - مشہور زبان داں - آپ ۱۰ نومبر ۱۸۵۱ء کو پیدا ہوئے اور ۳ مئی ۱۹۱۱ء کو وفات پائی - آپ لاطینی ، انگریزی ، جرمن ، فرانسیسی ، عربی ، فارسی ، اردو ، سنسکرت ، بنگالی ، ہندی ، تلنگی ، مرہٹی اور گجراتی زبانوں کے ماہر تھے - تصانیف و تراجم : اصول قانون طب ، کلیلہ و دمنہ ، تمدن ہند ، تمدن عرب -

اقبال نے فی البدیہہ یہ دو مصرعے موزوں کیے :

ماہروئے بر لبِ جو مے کشد تصویر ما
منتظر باشیم ما تا آفتاب آید بروں

یہ مجھے اب یاد نہیں کہ آفتاب پھر نکلا اور وہ خاتون تصویر کھینچ سکی یا نہیں ۔

* * *

ادبی زندگی[1]

زمانے کے اثر سے ہر چیز اپنا رنگ بدلتی ہے - ادبی زندگی نے بھی ہمارے دیکھتے دیکھتے کئی رنگ بدلے - جو تغیرات میں نے دیکھے ان میں سے کچھ شخصیتوں سے متعلق ہیں اور کچھ طرز تحریر اور مذاق سخن سے تعلق رکھتے ہیں - پہلے ان استادانِ فن کا ذکر سنیے جنھیں دیکھنا مجھے نصیب ہوا -

ابھی میں مدرسے کے ابتدائی درجوں میں پڑھتا تھا کہ مولانا آزاد کی تصنیف "قصص ہند" میں نے پڑھی اور اس کی دلکش نثر کے مزے لیے - آزاد کی سلیس زبان اور ان کی نثر میں الفاظ کی موزوں نشست کا گہرا اثر میرے دل پر ہوا - جب میں ہائی سکول میں داخل ہونے کو لاہور آیا تو مجھے شوق تھا کہ میں مولانا آزاد کو دیکھوں - وہ ان دنوں گورنمنٹ کالج میں پروفیسر تھے اور انھوں نے رفاہ عام کے لیے دہلی دروازے کے باہر شاہ محمد غوث رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کے قریب ایک بنگلے میں لائبریری قائم کی ہوئی تھی - میں اپنے ایک ہم جماعت کے ساتھ جو میری طرح حضرت آزاد کے ادبی کمالات کا گرویدہ تھا، اس لائبریری میں گیا - ہم جا کر باہر برآمدے میں ابھی بیٹھے ہی تھے کہ از راہِ خلق و نوازش آزاد مرحوم خود باہر آ گئے اور دیر تک ہم سے باتیں کرتے رہے -

---

۱ - ہفت روزہ "حمایتِ اسلام" لاہور، ۱۶ جنوری ۱۹۷۱ع ، ص ۳ ، ۱۰ - یہی مضمون لاہور ریڈیو سٹیشن سے نشر ہوا اور پھر رسالہ "انیسِ نسواں" میں چھپا -

افسوس کہ اس ملاقات سے چند سال بعد اردو کی بدقسمتی سے آزاد کے دماغ کی خدمات سے دنیا محروم ہوگئی ۔ یوں تو وہ اور کئی برس جیسے مگر کثرت کار و افکار سے دماغ مختل ہوگیا تھا ۔ اس سے کچھ برس پہلے انھوں نے لاہور میں ایک ادبی مجلس قائم کی تھی جہاں انھوں نے اور مولانا حالی نے جدید طرز شاعری کی بنا ڈالی ۔ میں نے آزاد کو تو شعر پڑھتے نہیں سنا البتہ مولانا حالی مرحوم کو کئی مرتبہ سنا ۔ ان کا کلام سادہ تھا مگر ان کا ایک ایک لفظ اثر میں ڈوبا ہوا ہوتا تھا ۔ پڑھنے کا طریق بھی سادہ تھا مگر نہایت پُر اثر ۔

مولانا حالی کو اگر اردو کی جدید شاعری کا بانی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا ۔ انھوں نے اردو شاعری کو گل و بلبل کے حسن و عشق کے جال سے نکل کر نئے حالات کا آئینہ اور نئے خیالات کی ترقی کا زینہ بنایا اور اس سے سوتی ہوئی قوم کو جگانے اور اس میں قوت عمل پیدا کرنے کا کام لیا ۔

اس دور کا ایک اور شاعر جس کا احسان اردو ادبیات پر کسی سے کم نہیں ، اکبر الہ آبادی مرحوم ہے ۔ اپنے وقت کے مسائل پر نکتہ چینی کر کے حضرت اکبر نے مغرب کی بڑھتی ہوئی رو کو بہت حد تک روک دیا اور ملک کو مشرقی تہذیب کی خوبیوں کے قائم رکھنے کی طرف متوجہ کیا ۔ ظرافت کی چاشنی ان کے کلام کی امتیازی صفت ہے ۔

اس دور کے کئی نامور ادیبوں کے دیکھنے کا مجھے موقع ملا ۔ بوجہ اختصار ان میں سے صرف دو کا ذکر کرتا ہوں ۔ اول تو

سر سید احمد خاں مرحوم جو خود بھی نثر کے استاد تھے مگر اُس سے زیادہ ان کا ادب اردو پر یہ احسان ہے کہ انھوں نے بہت سے اور لکھنے والوں کو اپنے رنگ میں رنگ دیا ۔ دوسرے مولانا نذیر احمد مرحوم ۔ ان کو میں غائبانہ طور پر ان کی ہر دل عزیز کتابوں کے ذریعے سے جانتا تھا ، مگر ان کو دیکھا نہ تھا اور دیکھنے کا بے حد مشتاق تھا ۔ میں نے پہلی مرتبہ انھیں لاہور میں دیکھا جب وہ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں لیکچر دینے آئے ۔ ان کی تقریر کے وقت یہ معلوم ہوتا تھا کہ فصاحت کا ایک دریا ہے کہ اُمڈا چلا آتا ہے ۔ سننے والے کبھی روتے تھے اور کبھی ہنستے تھے ۔ گویا بولنے والا ایک جادوگر ہے جب چاہے ہنسا دے جب چاہے رُلا دے ۔ دو دو گھنٹے یا زیادہ تک تقریر کرتے تھے ، اور توجہ اور تاثیر کی یہی حالت رہتی تھی ۔

ان حضرات کے سوا اسی دور میں اور بھی بہت سے ادیب تھے جو اپنی اپنی جگہ باکمال تھے ۔ مگر ان روشن تر ہستیوں کے سامنے ان کی چمک نسبتاً مدھم رہتی تھی ۔ ان میں مرزا ارشد گورگانی کا ذکر کرنا ضروری ہے ۔ ارشد صاحب اپنی غزلوں اور قومی نظموں کی وجہ سے مشہور تھے ۔ وہ اپنا کلام تحت اللفظ پڑھتے تھے اور خوب پڑھتے تھے ۔

مرزا ارشد مرحوم کی شہرت ابھی زوروں پر تھی کہ لاہور کے آسمان ادب پر ایک نیا ستارہ نمودار ہوا جس کی ضیا رفتہ رفتہ عالمگیر ہونے کو تھی ؛ یعنی علامہ شیخ محمد اقبال مرحوم کی شاعری کا آغاز ہوا ۔ وہ بعد ازاں ڈاکٹر سر محمد اقبال کے لقب سے ملقب ہوئے اور اب اُن کے متعلق نقادوں کا یہ اندازہ ہے کہ دنیا کے بہترین

سخنوروں میں ان کا شمار ہے ۔ اور آن کے آنے سے اردو کی دنیائے شاعری میں بڑا تغیر ہوا ۔ ان کی شاعری کا رنگ شروع ہی میں اوروں سے جدا تھا اور رفتہ رفتہ بالکل الگ ہوتا گیا ۔ یہاں تک کہ آخر میں ان کے اس جہان سے رحلت فرمانے سے پیشتر ان کا رنگ اوروں پر اس درجہ غالب آ گیا تھا کہ ان کا ہر ہم عصر دانستہ یا نادانستہ ان کی پیروی کرتا تھا ۔ ان کا یہ شعر مصداقِ حال ہے :

اڑا لی قمریوں نے طوطیوں نے، عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فغاں میری

اقبال کا اثر کئی طرح سے نمایاں ہوا ۔ نہ صرف ان کا اسلوب بیان مقبول ہوا بلکہ ان کے مطالب و مضامین بھی لوگوں کو بھا گئے ۔ کئی مضمون جن پر پہلے کسی نے اردو میں طبع آزمائی نہیں کی تھی ان کی بدولت عام پسند ہو گئے ؛ مثلاً سرمایہ دار و مزدور کی کشمکش ۔ اقبال نے پہلے اس مضمون پر قلم اٹھایا ۔ اب ہر کہ و مہ اسے لکھ رہا ہے ۔ اسی طرح آزادی اور غلامی کا ملکی خیالات اور خصائل پر کیا اثر ہے ۔ اس مضمون پر بھی اقبال نے پہلے توجہ کی اور اب یہ ہر ایک کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے ۔ مغرب کی مادیت اور مشرق کی روحانیت کا تقابل ۔ یہ اقبال کے کلام کی خصوصیت ہے اور اب بہت سے اور لکھنے والے اس مضمون پر خامہ فرسائی کر رہے ہیں ۔ اقبال کے اثر سے طرزِ شعرخوانی میں بھی بہت فرق آیا ۔ اس نے اپنی شاعری کی ابتدا میں ترنم سے شعر خوانی کی ۔ پہلے تحت اللفظ پڑھنا زیادہ پسند کیا جاتا تھا ۔ اقبال کے ترنم نے بہت لوگوں کو اس طرز شعر خوانی کی طرف مائل کر دیا ۔ نئے شعرا میں حضرت حفیظ جالندھری ، جنھوں نے اقبال سے دوم درجے پر سب سے زیادہ

ناموری حاصل کی ہے، طرزِ ترنم کے قائل ہیں اور اس سے بہت کام لیتے ہیں۔

حضرت جوش ملیح آبادی کو بھی میں نے سنا ہے۔ خوب کہتے ہیں اور خوب پڑھتے ہیں۔ بعض باتوں میں اقبال سے ان کی مشابہت ہے مگر ایک چیز ان کی شاعری کو اقبال کی شاعری سے بالکل متمیز کرتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اقبال مذہب کا دلدادہ ہے اور جوش صاحب مذہب کے خلاف ہیں۔[1]

مذاقِ سخن میں جو تغیرات ہوئے ہیں، وہ شخصیتوں کی تبدیلیوں یا اسلوب بیان کے تغیر سے بھی زیادہ ہیں۔ مذاقِ سخن چند سالوں میں ایسا بدلا ہے کہ اگر انیسویں صدی کے اواخر یا بیسویں صدی کے آغاز تک کا دیکھنے والا کوئی شاعر یا ادیب، جو اس جہان سے جا چکا ہو، پھر یہاں آ جائے اور آج کل کی ادبی مجالس میں شریک ہو تو پہچان نہ سکے کہ یہ اسی کے وطن کی صحبتیں ہیں؛ مثلاً اس زمانے کے مشاعروں اور آج کل کے مشاعروں کا مقابلہ کیجیے۔

پہلے مشاعروں میں نشست فرش پر ہوتی تھی۔ اب اکثر کرسیوں پر ہوتی ہے۔ پہلے یہ جلسے عموماً شب کو ہوتے تھے اور شمع گردش کرتی ہوئی ہر شاعر کے سامنے آتی تھی۔ اب زیادہ تر دن کو ہوتے ہیں۔ پرانے شعرا کی ایک خاص وضع تھی۔ وہ اپنے آپ کو بہت لیے دیے رہتے تھے۔ ایک دوسرے سے آداب و سلام میں بہت تکلف برتتے تھے۔ اس میں ذرا سی بھی کمی پر ان کی طبع

۱۔ شیخ عبدالقادر مرحوم نے آج سے اکتیس برس قبل جوش صاحب کے بارے میں جو رائے ظاہر کی، وہی آج بھی درست معلوم ہوتی ہے۔

نازک برہم ہو جاتی تھی - اپنے کلام کی داد چاہتے تھے مگر سلیقے سے - داد لے کر بار بار آداب بجا لاتے تھے - نظم و تعلی اور زبانی باتوں میں بے حد الکسار سے کام لیتے تھے - اب مشاعروں کا یہ حال ہے کہ اکثر میں داخلہ ٹکٹ سے ہوتا ہے - ٹکٹ کبھی مفت اور کبھی مول کے ہوتے ہیں - اس پر ہجوم عموماً اس قدر ہوتا ہے کہ کمروں کے دروازے ٹوٹ جاتے ہیں - شور مشکل سے فرو ہوتا ہے اور بسا اوقات وہ بھی جب کہ کوئی اچھی آواز سے پڑھنے والا پڑھ رہا ہو ، داد کا اظہار تالیاں بجانے سے ہوتا ہے - کسی کو چپ کرانا ہو تو فرش پر پاؤں مارنے یا طنزاً تالیاں بجانے سے چپ کرا دیتے ہیں - کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سننے والوں میں سے اکثر کو دفعتاً کھانسی آنے لگتی ہے - یہ اشارہ ہوتا ہے پڑھنے والے کے لیے کہ اب جانے دیجیے - غرض اب مشاعرہ مشرقی تمدن کا وہ نفیس نمونہ نہیں رہا جو کسی زمانے میں تھا - مگر اب بھی زندہ دلی کا اچھا مشغلہ ہے اور اردو کو مقبول اور ہردلعزیز بنانے کی خدمت بخوبی سرانجام دیتا ہے - اس کے بغیر اردو کی ادبی زندگی مکمل نہیں سمجھی جاتی -

یہ تو مشاعرے کی صورت میں تغیر ہوا مگر معنوی تغیرات اس سے زیادہ اہم ہیں - پہلے الفاظ اور بندش اور صنعت کی طرف زیادہ توجہ تھی - اب مضامین کی عمدگی اور تخیل کی بلندی زیادہ پسند کی جاتی ہے - اس کے علاوہ اکثر مشاعروں میں اب صرف غزلیں ہی نہیں پڑھی جاتیں بلکہ پُرلطف اور نتیجہ خیز نظمیں بھی پڑھی جاتی اور رغبت سے سنی جاتی ہیں ، اور سیاسی اشعار جن میں آزادی کے سبق ہوں لوگوں کو بہت مرغوب ہیں -

اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ غزل کی گرمیٔ بازار اب بالکل

جاتی رہی ۔ اُنیسویں صدی کے اخیر میں داغ اور امیر مینائی لکھنوی نے غزل کو نئی زندگی بخشی ۔ امیر مینائی کو تو میں نے نہیں دیکھا مگر داغ سے میں حیدرآباد میں ملا تھا ۔ شاندار آدمی تھے اور وضع قدیم کے پابند ۔ ان کے بہت سے ممتاز اور نامور شاگردوں سے بھی ملنے کا مجھے اتفاق ہوا ہے ۔ سب کی غزلوں میں استاد کا رنگ ہے ۔

حضرت شاد عظیم آبادی کو بھی میں نے دیکھا تھا ۔ انھوں نے غزل میں یہ خوبی پیدا کی تھی کہ زبان کی رنگینی کے ساتھ اخلاق اور فلسفیانہ مضامین بہ کثرت غزل میں کھپ جائیں ۔ انھیں اس طرز میں بہت کامیابی ہوئی ۔ موجودہ مشاہیر میں مرزا یگانہ اس طرز میں بہت مہارت رکھتے ہیں ۔

حضرت جگر مراد آبادی جدید غزل گو شعرا میں ایک خاص مرتبہ رکھتے ہیں ۔ ان کا کلام دلآویز ہے اور ان کا ترنم سے پڑھنا اسے اور بھی دل آویز بناتا ہے ۔ ترنم سے پڑھنے والے نوجوان شعرا میں حضرت ساغر نظامی اور حضرت احسان بن دانش[1] کو بہت مقبولیت حاصل ہے ۔

اب نظم کو چھوڑ کر نثر کی طرف پھر آئیے ۔ جیسے مذاق شعر میں تغیرات ہوئے ہیں ایسے ہی نثر کا مذاق بھی بہت بدلا ہے ۔ مولوی نذیر احمد صاحب کی کتابیں اردو ناول کی ابتدا تھیں مگر صحیح معنوں میں ناول کا آغاز پنڈت رتن ناتھ سرشار کی کتاب 'فسانۂ آزاد'

۱ ۔ حضرت احسان دانش ابتدا میں اپنا نام اسی طرح لکھا کرتے تھے ''احسان بن دانش'' اس پر جب معاصرین نے ''دانش کے بغیر'' کی پھبتی کسی تو انھوں نے ''بن'' کو خارج کردیا اور احسان دانش کہلانے لگے ۔ ان کے والد کا اسم گرامی دانش علی تھا ۔

سے اور مولوی عبدالحلیم شرر کے ناولوں سے ہوا۔ سرشار سے تو میں نہیں ملا مگر مولانا شرر کو جانتا تھا ۔

اب ایک عرصہ سے مختصر افسانوں کا رواج ہماری ادبیات میں ہوگیا ہے اور بہت لوگوں نے مختصر افسانے لکھے ہیں ۔ ان میں منشی پریم چند نے ایک امتیازی حیثیت حاصل کی تھی ۔

ڈرامہ نویسی سے گو ہندوستان پرانے سنسکرت کے ناٹکوں کے ذریعے آشنا تھا مگر اس کا رواج اردو میں نہ تھا ۔ سب سے پہلے لکھنؤ میں امانت نے ''اندر سبھا'' لکھی جسے ڈرامہ تو نہیں مگر اوپرا کی نقل کہہ سکتے ہیں ۔ اس کے بعد ڈرامے کی کمپنیاں بنیں اور ان میں احسن اور طالب اور دیگر حضرات نے اردو ڈرامے لکھے جو سٹیج پر دکھائے گئے اور مقبول ہوئے ۔ ان کے بعد آغا حشر نے اس فن میں خاص شہرت پیدا کی، مگر افسوس کہ متحرک اور بولتی ہوئی تصویروں کی ایجاد نے ڈرامے کا بازار پھیکا کر دیا ہے ۔ اب ڈرامے اکثر کتابی صورت میں یا ریڈیو کے لیے لکھے جاتے ہیں ۔ اس فن کے موجودہ ماہرین میں سید امتیاز علی تاج اور حکیم احمد شجاع صاحب خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں ۔

اردو ادبیات میں اخباروں اور رسالوں نے بھی خاصا تغیر پیدا کیا ہے ۔ ایک وقت تھا کہ انگریزی الفاظ اور محاورات اردو میں بہت کم مروج تھے ۔ اب یہ حال ہے کہ اردو اخبارات میں انگریزی اخبارات کے ترجمے بکثرت چھپتے ہیں ۔ ان میں کئی محاورات ایسے ہیں جن سے اردو زبان بالکل غیر مانوس ہے مگر وہ اس میں کھپتے چلے جاتے ہیں اور ان میں سے بعض جزوِ زبان بن گئے ہیں ۔

ترجمے کی راہ سے نئے خیالات اور محاورات داخل زبان ہونے کے علاوہ ایک اور بھی سبب ان کی کثرت کا ہے - اب سے تیس چالیس برس پہلے انگریزی پڑھے ہوئے ہندوستانی اردو کی کتابیں پڑھنے یا اردو میں مضامین لکھنے کی طرف مشکل سے راغب ہوتے تھے - اب یہ بات نہیں رہی ہے - اب انگریزی خواں خوشی سے اردو میں مضامین لکھتے ہیں - اور چونکہ انھوں نے زیادہ تر انگریزی ادبیات کا مطالعہ کیا ہے اور ان کی بیشتر معلومات کا ذخیرہ انگریزی زبان میں ہے ، وہ اس کی مدد سے لکھتے ہیں - اس سے اردو نثر میں اتنا تغیر آیا ہے کہ اگر گزشتہ نسل کے کسی ادیب کے سامنے ، جو مدت تک یہاں کے رسائل یا اخبار نہ پڑھتا رہا ہو ، یہ رسالے یا اخبار رکھ دیں تو وہ بہت سے فقروں کا مطلب سمجھنے سے قاصر رہ جائے گا -

اردو ادبیات پر بعض ہماری ملکی زبانوں کا اثر بھی پڑا ہے - خاص کر بنگالی زبان کا - اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ٹیگور کی ہمہ گیر شہرت ، جو ہندوستان کی حدود سے نکل کر یورپ اور امریکہ تک پہنچ گئی ہے ، اس کے وطن کے ہر حصے سے خراج تحسین حاصل کرتی ہے - اردو کے ادیبوں نے بھی ٹیگور کی نظموں کے انگریزی ترجمے پڑھے ہیں اور بعض نے اردو ترجمے کیے ہیں ، اور وہ قدرتی طور پر ان کے کلام کی خوبی کے معترف ہیں اور ان کی طرز تحریر کی پیروی کرتے ہیں - اس میلان نے اردو نظم پر بھی اثر ڈالا ہے اور اردو نثر میں بھی بہت سا تغیر پیدا کیا ہے -

تغیرات کا یہ مختصر تذکرہ ختم کرنے سے پہلے ایک اور تغیر کا ذکر ضروری ہے اور وہ خود محکمۂ ریڈیو کے اثر سے پیدا ہوا ہے - ریڈیو اب ایک بولتی ہوئی زبان اور بڑھتے ہوئے علم و ادب

کا مرکز بن رہا ہے ، ریڈیو کے ذریعے تقریریں ہوتی ہیں ، غزلیں گائی جاتی اور نظمیں پڑھی جاتی ہیں ۔ مختصر ڈرامے سنائے جاتے ہیں اور نئی طرز کے مشاعرے منعقد ہوتے ہیں جن میں پڑھنے والے حاضر اور سننے والے غائب ہوتے ہیں ۔ مگر پھر سوچو تو بالکل غائب بھی نہیں ہوتے کیونکہ دور دور کے شہروں میں جہاں کہیں ریڈیو کا سیٹ ہے اس کے قریب کئی سننے والے چپ چاپ سن رہے ہوتے ہیں اور کلام کی داد دیتے ہیں ۔ یہ سب سے بڑا تغیر ہے جو میری آنکھوں نے دیکھا ہے ۔ اگر غالب کے مزاج کے کسی پرانے زمانے کے شاعر سے کہا جاتا کہ ایسے مشاعرے میں آ کر غزل سرائی کریں تو میرا خیال ہے کہ وہ اس دعوت کو قبول نہ کرتے، مگر اب تو اچھے اچھے ''صاحبان فن'' اس بزم مختصر میں شریک ہو جاتے ہیں جن میں یا شاعر رنگیں نوا ہوتے ہیں یا ساقی ۔ آپ ساقی کے لفظ سے متعجب نہ ہوں ۔ اگر ریڈیو کے عملے کو اس بزم کے ساقی کہا جائے تو کچھ بے جا نہ ہوگا ۔

* * *

وہ حضرات جن کا اثر مجھ پر ہوا[1]

انسان کی زندگی مختلف اثرات کا مجموعہ ہے - پہلا اثر ہر شخص پر اس کے ماں باپ کا ہوتا ہے - پھر ان حالات کا جو اس کے گرد و پیش ہیں - پھر استاد کا جس سے پڑھنا لکھنا یا کوئی ہنر سیکھے - ان اثرات کے علاوہ اکثر ہوتا ہے کہ آدمی کی اخلاقی یا علمی نشو وہ نما پر اُس وقت کے بڑے بڑے آدمیوں کا اثر ہوتا ہے جن کے حالات وہ سنتا ہے یا جن کے کمالات وہ دیکھتا ہے اور اُن سے متاثر ہوکر اس کے دل میں قدرتی طور پر یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ وہ ان کی مثال کی کسی حد تک پیروی کرے - خوش قسمتی سے مجھے بہت سے ایسے بزرگوں کو دیکھنے اور ان کی باتیں سننے کا موقع ملا جن کی اچھی خصلتوں کا گہرا نقش میرے دل پر ہے -

یہ تو ممکن نہیں کہ ایک مختصر صحبت میں ان سب بزرگوں کا تذکرہ ہوسکے جن کا اثر مجھ پر ہوا ، اس لیے بہ غرض اختصار میں نے چھ نام چنے ہیں - ان میں ہر شخص امتیازی حیثیت رکھتا تھا اور سینکڑوں اور ہزاروں اشخاص پر اپنا اثر چھوڑ گیا ہے -

اب وہ سب اصحاب دنیا سے رحلت فرما چکے ہیں - اس وقت کے زندہ مشاہیر میں بھی کچھ اصحاب ایسے ہیں جن کی خوبیوں کا میں مداح ہوں اور ان کے اثر سے میں مستفید ہوا ہوں - لیکن زندہ مشاہیر کی تعریف کی بجائے "نام نیک رفتگاں" کا تذکرہ میں نے زیادہ مناسب سمجھا ہے -

---

۱ - ماہنامہ ادبی دنیا ، جولائی ۱۹۴۲ء ص ۲۳ تا ۲۶ - یہ مضمون آل انڈیا ریڈیو دہلی سے بھی نشر ہوا -

ابھی میں اپنی زندگی کی ابتدائی منزلیں طے کر رہا تھا ۔ جب ایک موقع پر تعلیمی کانفرنس کے لیے سر سید احمد خاں مرحوم لاہور تشریف لائے ۔ یہ وہ بزرگ تھے جن کی شہرت میں نے اپنے بچپن ہی میں سنی تھی کہ بڑے محب وطن ہیں اور مسلمانوں کی تعلیمی کشتی کے ناخدا ہیں ۔ میرے دل میں شوق ہوا کہ ان کو دیکھنا چاہیے ۔ ایک بنگلے کے وسیع احاطے میں شامیانہ نصب کر کے اور اس کے گرد قناتیں لگا کر جلسے کا انتظام کیا گیا تھا۔ چھوٹی جماعتوں کے طالب علموں کو جلسے کے اندر تو کون جانے دیتا تھا ۔ میں انھیں دور سے دیکھنے کی امید سے دور جا کھڑا ہوا ۔ اتنے میں دیکھا کہ کچھ لوگ قناتوں کے رخنوں میں جھانک رہے تھے ۔ میں نے بھی ایک رخنہ ڈھونڈ کر جھانکنا شروع کیا ۔ اندر جلسہ گاہ کے وسط میں ایک بزرگ جلوہ افروز تھے جن کی لمبی سفید ڈاڑھی تھی اور جن کے چہرے سے شانِ بزرگی عیاں تھی ۔ کسی نے بتایا کہ یہی سر سید احمد خاں ہیں ۔ یہ دیدار ان کی بڑائی کا پہلا اور بیرونی نقش تھا جو میرے صفحۂ دل پر کھنچ گیا ۔ گفتار سننے کی نوبت کئی برس بعد آئی ۔ جب میں سکول سے کالج میں گیا اور کالج سے فارغ ہو کر اخبار لکھنے لگا تو مجھے شاہجہاں پور کے جلسۂ کانفرنس میں پہلی دفعہ سر سید صاحب سے ملنے کا موقع ہوا ۔ اور اس کے بعد کئی اور ملاقاتیں میرٹھ کانفرنس میں ہوئیں ۔ ان ملاقاتوں کا اثر آج تک جاگزیں ہے ۔ سر سید کے پاس بیٹھنا اور ان کی باتیں سننا گویا ایک درس میں شریک ہونا تھا ۔ ان کی طبیعت میں ظرافت تھی مگر متانت کے ساتھ ۔ ملک و قوم کا جذبہ جو ان کے دل میں تھا، رنگ رخ اس کی ہر وقت غمازی کرتا تھا ۔ اگر امید غالب ہوتی تو چہرے

پر بشاشت ہوتی ۔ اگر مایوسی کا غلبہ ہوتا تو چہرہ بھی افسردہ ہوتا تھا ۔ محنت کی عادت اس قدر تھی کہ کام کرتے کرتے صبح سے شام ہو جاتی تھی اور وہ کام سے نہ تھکتے تھے ۔ مضامین لکھتے تھے ، خطوط لکھواتے تھے ۔ کالج اور کانفرنس کے نظم و نسق میں مصروف رہتے تھے ۔ دن رات دوسروں کی بھلائی کی فکر رہتی تھی ۔ اتنی شہرت اور کامیابی کے باوجود بھی اپنی کوئی جائداد نہ بنائی ۔ یہاں تک کہ وہ جب اس جہان سے گزرے تو ان کے پرانے دوست اور رفیق نواب محسن الملک نے ان کی تجہیز و تکفین کا خرچ ادا کیا ۔ سر سید کے مضامین اور خطوط علمی اور ادبی لحاظ سے اردو میں اعلیٰ درجے کی کتابیں ہیں ۔ غالب کے رقعات کی نثر کو چھوڑ کر اردو نگاری میں طرز نو کی ایجاد کا سہرا سر سید صاحب ہی کے سر پر ہے ۔

سر سید کے ہمراہ اردو کے مصنفین کا ایک گروہ جمع ہو گیا تھا جن میں مولوی نذیر احمد صاحب نثر نگاروں میں ، مولانا شبلی کتب سیر و تاریخ میں اور مولانا حالی قومی شاعری میں ممتاز تھے ۔ مجھے ان تینوں کی خدمت میں نیاز حاصل تھا اور میں تینوں سے کئی طرح اثر پذیر ہوا ۔ مگر یہاں فقط مولانا حالی کا ذکر آ سکے گا کیونکہ ان کا تخیل شاعری اور اس پر ان کا عمل میرے مذاق شاعری کے لیے دلیل راہ ثابت ہوئے ۔ حالی کے اشعار نے مجھے سادگی زبان کا دلدادہ بنایا اور مجھے یہ سکھایا کہ شعر میں جاذبیت کے علاوہ تاثیر اور مقصد ضروری ہے ۔ ان کے کلام نے اس زمانے کا انداز شاعری بدل دیا ۔ مولانا حالی کے معاصروں میں سید اکبر حسین صاحب الہ آبادی بھی اسی اصول پر کاربند رہے ۔ ان کی شاعری میں ظرافت کا عنصر غالب تھا ۔ ان کے بعد کی پود میں سر محمد اقبال مرحوم نے

اس اصول کو اور بھی قابل عمل بنا دیا - مولانا حالی پرانے علما کی بہترین صفات کا مجموعہ تھے - ان کی طبیعت انکسار پسند تھی اور شیخی اور بے جا تعلی سے وہ نفور تھے - اپنے "کلیات" میں اگر کہیں "سخن گسترانہ" بات کسی مقطع میں کہی بھی ہے تو انکسار کا پہلو ہاتھ سے جانے نہیں دیا - مثلاً فرماتے ہیں :

گرچہ حالی اگلے اُستادوں کے آگے ہیچ ہیں
کاش ہوتے ملک میں ایسے بھی اب دو چار ہیچ

یہ دونوں بزرگ ہمارے ملک کے علما میں سے تھے - اب جس عالم کا ذکر کروں گا وہ ہندوستان کے رہنے والے نہ تھے بلکہ سمندر پار کے باشندے تھے - یہ ڈاکٹر جے - سی - آر - ایونگ (Dr. J. C. R. Ewing) تھے - مجھے لاہور کے فورمن کالج میں ان کی شاگردی کا فخر حاصل ہوا - وہ کالج کے پرنسپل تھے اور ایک بے نظیر معلم ادب و اخلاق - آپ غیر معمولی طور پر ذہین اور طباع تھے - قدرت نے انہیں شکل و شباہت بھی رعب دار عطا کی تھی - ان کے ساتھ کے پروفیسر بتاتے تھے کہ اگر وہ چاہتے تو امریکہ میں، جہاں سے وہ آئے تھے، پبلک معاملات یا کاروباری زندگی میں اعلیٰ مدارج تک پہنچ سکتے تھے مگر انہوں نے اتنی دور آ کر ہندوستان کی تعلیمی خدمت اختیار کی اور ساری عمر بہت معمولی معاوضہ پر کام کرتے رہے جس سے بہ مشکل بسر اوقات ہو سکتی تھی - پنجاب کی تعلیمی ترقی میں ان کی کوششوں کا خاص حصہ ہے - وہ کئی سال یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے اور یونیورسٹی کی ترقی بھی ان کی مساعی کی ممنون ہے - ڈاکٹر ایونگ بڑے منتظم تھے مگر انتظام کرتے نظر نہیں آتے تھے - ان کی ایک نگاہ کسی اور کی جھڑکی

یا تشدد سے زیادہ ،مؤثر تھی - میں ان کے سامنے کھڑے ہوئے یہ محسوس کرتا تھا کہ میرے دل کا حال پڑھ رہے ہیں - انھیں اپنے شاگرد کے حالات سے بےحد دلچسپی رہتی تھی اور ہر وقت اس کو صلاح و مشورہ اور امداد دینے کے لیے آمادہ رہتے تھے - ان کو ہندوستان کی ترقی سے دلی ہمدردی تھی اور ہمارے ملک کو اپنے وطن کی طرح عزیز رکھتے تھے - ۱۹۰۷ع میں وہ رخصت پر ہندوستان سے امریکہ جاتے ہوئے لندن سے گذرے - میں ابھی وہیں تھا - کئی برس ہندوستان سے باہر رہنے کے بعد ان سے ملاقات ہوئی تو ڈاکٹر ایونگ صاحب نے نہایت خوشی کے لہجے میں یہ مژدہ مجھے سنایا کہ جب وہ ہندوستان سے روانہ ہوئے تو انھیں یہ محسوس ہو رہا تھا کہ سارے ملک میں آزادی کی نبض میں حرکت پیدا ہوگئی ہے - میں اس کے بعد جلدی اپنے وطن میں واپس پہنچا اور میں نے خود بھی مشاہدہ کیا کہ ہندوستان میں آزادی کی لہر دوڑنے کو تھی جو اس دن سے آج تک روز افزوں زور سے بڑھ رہی ہے -

یہ تینوں بزرگ جن کے اثر کا اعتراف میں نے کیا ہے ، میدان علم کے شہسوار تھے - اب میدان سیاست کے ایک یکہ تاز کا حال سناتا ہوں جس کی فراست ، حبّ الوطنی اور بےمثل جذبات کا میں خصوصیت سے قائل ہوں یعنی مسٹر گوکھلے آنجہانی - آپ نہایت خوش رو اور خوش خو تھے اور ہندوستان کی ترقی کے دلدادہ - افسوس کہ ان کی عمر نے وفا نہ کی اور وہ عین اُس وقت ہم سے جدا ہوئے جب ملک کو ان کی بے حد ضرورت تھی - میرا خیال ہے کہ اگر وہ چند سال جیتے رہتے تو ہندوستان جدید کی سیاسی تاریخ کچھ اور ہی ہوتی - مسٹر گوکھلے اپنی جوانی میں مسٹر جسٹس راناڈے

کے اثر سے مستفید تھے اور انھوں نے اپنی زندگی وطن کی خدمت کے لیے وقف کردی تھی ۔ پہلے فرگسن کالج پونا میں برائے نام معاوضے پر پروفیسری کرتے تھے ۔ پھر جب سیاست کی طرف میلان بڑھا تو سیاسیات میں استاد مانے گئے ۔ انہوں نے آئینی جد و جہد کے فن کو ایسے درجے پر پہنچایا کہ اس سے بلند تر پہنچنا مشکل ہے ۔ واضعانِ قانون کی بڑی کونسل میں ان کی تقریریں ، بیان کی خوبی ، دلائل کی پختگی اور معلومات کی درستی کا نمونہ ہوتی تھیں ۔ ان کی تقریروں نے بارہا لارڈ کرزن جیسے خود پسند وائسرائے سے داد تحسین حاصل کی ۔ ۱۹۰۵ء میں وہ ہندوستان کے معاملات کی طرف انگلستان کے مدبرین کو متوجہ کرنے کے لیے کانگرس کی طرف سے بھیجے گئے تھے ۔ لارڈ مارلے ان دنوں وزیر ہند تھے ۔ ان سے ملے اور چند مطالبات پیش کیے ۔ ان میں ایک یہ تھا کہ انگلستان کی پارلیمنٹ میں چند ممبر ہندوستان کی طرف سے منتخب ہوا کریں ۔ یہ بات تو نہ مانی گئی مگر ان کی دو تجویزیں منظور ہوئیں ، یعنی وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبروں میں ہندوستانیوں کا حصہ اور وزیر ہند کی کونسل میں ہندوستانیوں کی شرکت ۔ لارڈ مارلے نے مسٹر گوکھلے کو دونوں میں سے ایک کی ممبری سب سے پہلے پیش کی مگر انھوں نے شکریہ ادا کر کے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور یہ کہا کہ وہ اپنے لیے کچھ مانگنے نہیں آئے ۔ ان کے مطالبات اپنے ملک کے لیے ہیں ۔ اور یہ بھی کہا کہ اگر مدبرین برطانیہ بخوشی ان کے سب مطالبات منظور کر لیتے ، جو بہت اعتدال کے ساتھ پیش کیے گئے تھے ، تو کچھ عرصے کے لیے ہندوستانی ان پر شاید قناعت کر لیتے ، مگر اب اس سے بہت زیادہ مطالبات کی منظوری بھی ان کو مطمئن

نہیں کر سکے گی ۔ میں اس زمانے میں لندن میں تھا اور بیرسٹری کے ساتھ انگریزی اخبارات میں مضمون نگاری بھی کیا کرتا تھا ۔ ایک دوست کے ذریعے میں مسٹر گھوکھلے سے ملا اور ان کے دوران قیام میں کئی ملاقاتیں ہوئیں ۔ پبلک جلسوں میں ان کی کئی تقریریں سنیں اور کئی مسئلوں پر ان سے گفتگو اور بحث ہوتی رہی ۔ ہندوستانیوں کے ایک جلسے میں ، جو مسٹر دادا بھائی نارو جی کی زیر صدارت منعقد ہوا ، اس بات پر گفتگو تھی کہ ہندو مسلمانوں میں اتحاد کس طرح پیدا کیا جائے ۔ میں نے کہا کہ سیاسی رہنماؤں کو اس مقصد کے حصول کے لیے خاص طور پر کوشش کرنی چاہیے ۔ اور اس سلسلے میں مسٹر گھوکھلے سے میں نے درخواست کی کہ وہ اپنی خدا داد قابلیت کو اس کام کے لیے کچھ عرصے تک وقف کر دیں ۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ وطن واپس جا کر اور چند ضروری کاموں کو ختم کر کے اس مقصد کو اپنا بنا لیں گے ۔ مگر افسوس کہ انھیں انھیں دیگر مصروفیتوں سے فراغت پانے کا وقت نہیں ملا تھا کہ ان کو پیغام اجل آ گیا اور ہندوستان ان کی خدمات سے محروم ہو گیا ۔

ایک اور بزرگ جن کی سیاست دانی اور طریق کار کی پسندیدگی سے میرا دل متاثر ہوا ، وہی مشہور پارسی مدبر ہیں جن کا نام ابھی لیا گیا ہے ؛ یعنی مسٹر نارو جی ۔ یہ سب سے پہلے ہندوستانی ہیں جو انگلستان کی پارلیمنٹ میں ممبر ہوئے مگر انہیں انگریزوں کی لبرل پارٹی نے اپنے ایک حلقے کی طرف سے اور اپنے ووٹوں سے منتخب کرا کے وہاں بھیجا تھا ۔ مسٹر گھوکھلے نے جو جگہیں ہندوستان کے لیے مانگی تھیں وہ ایسی تھیں کہ ہندوستان کا حق تسلیم کیا جائے اور اس کے اپنے انتخاب کیے ہوئے نمائندے اس مجلس میں

شریک ہوں جو ہندوستان کے نظم و نسق کے اہم امور کا فیصلہ کرتی ہے - مسٹر ناروجی کو دوسرے راستے سے پارلیمنٹ میں گئے مگر انھوں نے اپنے حلقے کی نمائندگی بھی خوب کی اور ہندوستانی ہونے کا حق بھی اچھی طرح ادا کیا - وہ اپنی تقریروں سے ہندوستان کے حالات اور خیالات پر ہمیشہ روشنی ڈالتے تھے اور ہندوستان کے متعلق اراکین پارلیمنٹ کی معلومات میں انھوں نے بہت اضافہ کیا - ان کے علاوہ نوجوان ہندوستانی طلبہ کے معاملات میں انھیں گہری دلچسپی تھی - ان کی مجالس میں شریک ہوتے تھے اور ان کی ہر طرح حوصلہ افزائی کرتے تھے - اس لیے سب ہندوستانی جو انگلستان میں مقیم تھے ان کی عزت کرتے اور ان کا اثر مانتے تھے - ان کے متعلق ایک دلچسپ بات قابل ذکر ہے کہ جب وہ منتخب ہوئے تو انگلستان کے وزیر اعظم لارڈ سالسبری نے کسی جلسے میں یہ کہہ دیا کہ ناروجی پہلا black man یعنی کالا آدمی ہے جو پارلیمنٹ میں بیٹھے گا - اس پر خود انگریزوں کے اخباروں میں خوب لے دے ہوئی اور ہندوستانیوں کو لارڈ سالسبری کا یہ فقرہ قدرتی طور پر ناپسند ہوا - ایک انگریزی باتصویر رسالے نے لارڈ سالسبری اور مسٹر ناروجی کی تصویریں ایک صفحے پر ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو چھاپ دیں اور اس فقرے کی ہنسی اڑائی - اس تصویر میں مسٹر ناروجی لارڈ سالسبری سے ذرا صاف نظر آتے تھے اور ان کی تصویر کے نیچے یہ لفظ لکھے تھے : "ذرا دیکھیے ! یہ لارڈ سالسبری کا کالا آدمی ہے -" مسٹر ناروجی پارسی نژاد ہونے کے باعث تھے بھی گورے چٹے اس لیے یہ چوٹ اور بھی زوردار ہوگئی -

آخر میں مجھے ایک ایسی بزرگ ہستی کا ذکر کرنا ہے جس سے میں روحانی طور پر اثر پذیر ہوا۔ جب میں ۱۹۰۶ء میں تعطیلات گرما میں لندن سے استنبول گیا، مجھے معلوم ہوا کہ ایک صاحب وہاں رہتے ہیں جو سلطان عبدالحمید خان کے پیر طریقت ہیں اور تصوف میں رفاعی مسلک رکھتے ہیں۔ ان کا نام نامی حضرت ابوالہدیٰ تھا۔ آپ سادات عرب میں سے تھے اور آپ کا وطن مالوف بغداد تھا۔

معلوم ہوا کہ سلطان اعظم نے اپنی تخت نشینی کے بعد انہیں بغداد سے بلوایا اور نہایت اعزاز و اکرام کے ساتھ ایک شاہی محل اور اس کا باغ انہیں رہنے کو دیا۔ اس وقت انہیں کوئی تیس سال استنبول (قسطنطنیہ) میں رہتے گذر چکے تھے اور اپنی زبان عربی کے علاوہ ترکی میں بھی اچھی مہارت ہو گئی تھی۔ سلطان کے مزاج میں انہیں بہت دخل تھا مگر انہیں اس اثر کا کوئی فخر یا کوئی غرور نہ تھا۔ باوجود ہر قسم کی آسائش مہیا ہونے کے وہ درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے اور ان کے گرد اہل دل کا ہجوم رہتا تھا۔ وہ اس وقت بھی خود لکڑی کے ایک بنچ پر بیٹھتے تھے جس پر کوئی گدیلا وغیرہ نہیں تھا۔ دن رات یاد الٰہی ان کا مشغلہ تھا۔ صرف تین چار گھنٹے سوتے تھے۔ مذہبی علوم اور رفاعی طریق تصوف پر عربی میں کئی کتابیں ان کی تصنیف کردہ تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ ترکی کے اس انقلاب کے وقت جو ۱۹۰۸ء میں ہوا جب جوان سال ترک جماعت کی طرف سے آئینی حکومت کا مطالبہ پیش ہوا تو سلطان اعظم نے اپنے وزرا کو جمع کیا اور ان کے ساتھ شیخ الاسلام کو اور حضرت شیخ ابو الہدیٰ کو بھی مشورے کے لیے بلایا۔

ان کو اپنی رعایا کے مطالبے سے آگاہ کیا اور پوچھا کہ آپ لوگوں کی کیا رائے ہے؟ سب کے دلوں میں یہ خیال ہوگا کہ آئینی حکومت دینے کی صلاح دیں مگر کسی کو یہ کہنے کی جرأت نہیں پڑتی تھی ۔ حضرت شیخ سب سے پہلے لب کشا ہوئے اور فرمایا کہ اس اصلاح کا وقت آ گیا ہے ، دینی چاہیے ۔ پھر بعض اور مشیروں نے بھی یہی خیال ظاہر کیا اور جدید ترکی کا وہ انقلاب بغیر کشت و خون کے برپا ہوگیا ۔ حضرت شیخ اس واقعے کے کچھ عرصے بعد اس جہان فانی سے سفر کر گئے مگر مشرق وسطی کے بہت سے ممالک میں ان کی یاد باقی ہے اور ان کی طریقت کے بے شمار پیرو ہیں ۔ آہ ! کیا لوگ تھے جو جب تک زندہ تھے لوگوں کے لیے شمع ہدایت تھے اور جب وفات پا گئے تو ان کی روشن مثالیں ہزاروں لاکھوں کے لیے دلیل راہ ہیں ۔

* * *

کاروانِ ادب کی رفتار میری زندگی میں[1]

قیامِ پاکستان کے بعد مارچ ۱۹۴۸ع کے آخری ہفتے میں پنجاب یونیورسٹی کے زیر اہتمام لاہور میں ایک سہ روزہ اردو کانفرنس منعقد ہوئی تھی - اس کانفرنس میں پاکستان کے مختلف علاقوں کے نمائندوں کے علاوہ بھارت سے بھی کچھ مندوبین شامل ہوئے تھے - ڈاکٹر مولوی عبدالحق کانفرنس کی صدارت کے لیے بھارت سے یہاں تشریف لائے تھے - خطبۂ استقبالیہ ڈاکٹر عمر حیات ملک ، وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی نے پیش کیا تھا - کانفرنس کے جنرل سیکرٹری ڈاکٹر سید عبداللہ تھے - یہ ایک تاریخی اجتماع تھا جس میں نوواردان ادب کے علاوہ اردو زبان و ادب کے اُن معماروں نے بھی حصہ لیا تھا جن کی زندگی کا چراغ ، اب چراغِ سحری کی مانند ٹمٹما رہا تھا اور جو ڈوبتے ہوئے سورج کی طرح دنیا پر آخری نگاہ ڈال رہے تھے -

شیخ (سر) عبدالقادر بھی ادب کے انہی معماروں میں سے تھے - اردو کانفرنس کے اجلاس مقالات (دوسری نشست) میں جو ۲۷ مارچ کو منعقد ہوا ، انھوں نے رات کے آٹھ بجے یہ تقریر ارشاد فرمائی جس میں اپنے عہد کی ادبی تحریکات کا جائزہ لیا تھا - اس اجلاس کی صدارت ڈاکٹر محمد دین تاثیر نے کی تھی - شیخ صاحب بوجہ ضعیفی مقالہ لکھنے سے قاصر تھے ، اس لیے انھوں نے

---

۱ - صحیفہ اکتوبر ۱۹۶۸ع (نمبر ۴۵) ، صفحہ ۲۱۱ -

تقریر کو تحریر پر ترجیح دی ۔ تاہم کانفرنس کے منتظمین نے شیخ صاحب کی تقریر کو ریکارڈ کرنے کا بندوبست کیا ہوا تھا ۔ افسوس کہ اس زمانے میں ٹیپ ریکارڈر کا انتظام نہ تھا ۔ مختصر نویسی (شارٹ ہینڈ رائیٹنگ) کا بھی قحط تھا ۔ اس لیے دو تین کارکنوں نے یہی فریضہ انجام دیا ۔ تقریر بخوبی ریکارڈ ہوگئی ۔ البتہ چند ایک مقامات پر خلا رہ گئے ۔ خصوصاً شعروں کو ٹھیک طور پر قلم بند نہ کیا جا سکا ۔ شاید اس لیے کہ جس وقت شعر پڑھے گئے ، اس وقت ''کرام الکاتبین'' خود بھی داد سخن دینے میں مصروف ہوگئے ۔ بہرکیف خلاؤں کو پُر کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور ان مقامات پر چھوٹی قوسین ( ) استعمال کی گئی ہیں ۔ جہاں تک بڑی قوسین [ ] والی عبارتوں کا تعلق ہے ، یہ تقریر ہی کا حصہ ہیں ، البتہ یہ ضمنی باتیں ہیں یا جملہ ہائے معترضہ کے طور پر کہی گئی ہیں ۔ جو اشعار مطبوعہ نسخوں سے مل گئے ان کی تصحیح متن میں کر دی گئی ہے ، باقی نامکمل اشعار میں نقطے ڈال دیے گئے ہیں اور ان کے ساتھ ''ناتمام'' لکھ دیا ہے (مرتب)

جنابِ صدر ، خواتین و حضرات !

مجھے سب سے پہلے ایک غلط فہمی رفع کرنی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ میں کوئی مقالہ نہیں پڑھوں گا ، جیسا کہ صدر محترم نے پروگرام دیکھ کر فرمایا ہے ۔ میں نے اپنی معذوری بتا دی تھی کہ میرے پاس نہ تو وقت ہے اور نہ ہی اب محنت کر سکتا ہوں ۔ تاہم میں نے زبانی گفتگو میں ہی باتیں کہنی مناسب جانیں ۔ میں نے تمام عمر یہی دیکھا کہ جو کچھ بغیر لکھے کہا جائے وہ ہمیشہ بہتر

ہوتا ہے ۔ مقرر حاضرین کو دیکھ بھی سکتا ہے ، آن سے آنکھ بھی ملا سکتا ہے ۔ لکھے کو ٹھیک طور سے پڑھا بھی نہیں جا سکتا ۔ مجھ سے اب لکھے ہوئے کی امید نہ کریں ۔ کوئی صاحب قلم بند کرتے جائیں اور بعد میں مجھے دکھا دیں ۔ یہ امر قابل افسوس ہے کہ اردو شارٹ ہینڈ اور ٹائپ موجود ہیں لیکن ان کا رواج عام نہیں ۔ یہ بہت ضرورت کی چیزیں ہیں ۔ ان میں اگر کوئی نقص اور خامی موجود ہے تو وہ دور کی جا سکتی ہے ۔ ہمارے ادبا و فضلا کی ایک سے ایک عمدہ تقریر ہوئی اور وہ بھی فی البدیہہ ، بغیر کسی تیاری کے ، لیکن افسوس کہ ریکارڈ نہ رکھنے کے باعث وہ تلف ہوئیں اور یہ کمی پوری نہیں کی جا سکتی ۔

دوسرے مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ مضمون یا عنوان جو کچھ بھی آپ کہیں ، میرا منتخب کردہ نہیں ہے ۔ یہ ہمارے دوست ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب ، آپ کی کانفرنس کے جنرل سیکرٹری کا تجویز کردہ ہے ۔ [سنیے ! علامہ صدیقی صاحب کیا فرما رہے ہیں کہ بعض جگہ آواز سنائی نہیں دیتی اور میں کرسی پر بیٹھ جاؤں اور مائیکروفون کو پاس ہی رکھ دیا جائے تاکہ سب مستفید ہوسکیں ۔ اگر آن کی یہی رائے ہے تو صدر صاحب کو دوسری کرسی پر Promote کر دیجیے ۔ لیکن میں اس تجربے کے نتائج کا ذمہ دار نہیں ہوں گا ۔] انتخاب تو خوب ہے ۔ میں اس پر نکتہ چینی نہیں کر رہا لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ مضمون تو ایسا دیا کہ اس پر آسانی سے ایک کتاب لکھ دی جائے لیکن وقت اتنا دیا کہ کیا عرض کروں ۔ کل جس وقت خواجہ محمد شفیع صاحب تقریر کر رہے تھے تو سید عابد علی صاحب نے دریافت کیا تھا کہ کتنا وقت درکار ہوگا ۔

ساتھ ہی میرے کان میں آواز آئی کہ دیگر مقررین کے لیے بس بس منٹ کی مہلت کافی سمجھی گئی ہے ۔ میں نے دل میں سوچا کہ وقت کا انحصار تو اس بات پر ہے کہ جب تک آواز کام دے ، سامعین سنیں اور اکتا نہ جائیں ۔ لیکن سید صاحب سے ڈرتے ہوئے میں نے اتنا ہی وقت بتانا مناسب سمجھا جتنا وہ سہہ سکیں ۔ اب آپ کے صدر صاحب فرماتے ہیں کہ مجھے اختیار ہے ۔ حضرات ! کام تو بتلا دیا بلند اور نارسا دی ہے کمند ـــ تذکرہ چھیڑے پر تو بہت کچھ کہنے کو ہے ۔ خیر ، میں حضرت مولانا محمد حسین آزاد مرحوم سے آغاز کرتا ہوں ۔

جب میں یہاں سکول میں داخل ہوا تو وہ اُس وقت نہ صرف حیات تھے بلکہ اُن کی شہرت کا ڈنکا بج رہا تھا ۔ ادب کی بدقسمتی سے وہ جنون میں مبتلا ہوگئے اور سچ پوچھو تو وہ ادب کی خدمت اس حالت میں بھی کر گئے ۔ میں جب انٹرنس کی پہلی جماعت کا طالب علم تھا ، وہ اُس وقت انتہائے شہرت پر تھے ۔ میں نے "قصص ہند" بڑے مزے لے لے کر پڑھی ، اُس کے ہر فقرے کو ایسا پایا جیسے جڑاؤ زیور میں نگ ، کہ اگر اپنی جگہ سے ہٹ جائے تو کمی پوری نہیں کی جا سکتی ۔ ایک انسپکٹر کو اُن کا ایک فقرہ اتنا پسند تھا کہ ہر امتحان میں وہ مرحوم کا ذکر کرتے ہوئے ضرور دہراتا : "اب ترکی خانہ برباد ہوئے یا یوں کہیے کہ غریب کے نصیب کی گردش نے نقل مکان کیا ۔" غرض کہ اُن کا یہ مضمون یاد تھا ۔ خیر ، اس کے بعد 'آب حیات' سے سیر ہوئے تو اشتیاق دید پیدا ہوا ۔ مرحوم اُس وقت دہلی دروازے کے باہر مقیم تھے ۔ وہ کمیٹی کا دفتر بنا ۔ بعد کے آنے والے زمانے نے میرا مسکن اور "مخزن" کا دفتر

بھی اسی جگہ دیکھا ۔ مولانا کا کتب خانہ بھی وہیں تھا ۔ میں اور میرے ایک ہم سبق زیارت کو گئے ۔ اب ذرا اُن کی بزرگی اور اخلاق دیکھیے ؛ ہم دونوں طالب علم گئے اور باہر برآمدے میں بیٹھ گئے ۔ انہوں نے دونوں کو دیکھ پایا ۔ اُردو کے دو اخبار لیے باہر تشریف لائے اور کہا کہ میاں اخبار پڑھیے ، کیسے آنا ہوا ؟ ہم نے کہا کہ آپ کی زیارت کو ۔ دل اُن کو دیکھ کر باغ باغ ہوگیا ۔ فی الحقیقت وہ صوفی تھے اور صوفیوں میں اُن کی کافی وقعت ہے ۔ لیکن ادیب بھی جانتے ہیں کہ مردِ کامل کی نگاہ کیا تھی ۔ ایسے حضرات کی نگاہ سے نگاہ ملتے ہی آدمی انسان بن جاتا ہے ۔ بعض ایسے واقعات دیکھنے میں آئے جن سے میں بہت متاثر ہوا ۔

اس کے بعد مولوی نذیر احمد مرحوم کا ذکر کروں گا ۔ وہ پہلی مرتبہ انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں تقریر کے لیے لاہور آئے تھے ۔ لیکن بعد، تو تقریباً ہر سال اپنے لیکچروں کے فیض سے سیراب کرتے رہے ۔ تین تین گھنٹے لگاتار ہنساتے ، رولاتے ، لیکن حاضرین نے کبھی تھکن محسوس نہ کی ، اور ایک ایک لیکچر سے وہ کچھ حاصل کرتے کہ مہینوں میں اور کہیں سے حاصل نہ کر پاتے ۔ ہر سال ان کے لیکچروں میں سامعین کی تعداد بڑھتی گئی ۔ لیکن دھیان سنگھ کی حویلی کے ہال میں ہم نے اُن کی خوش بیانی ، ادب دانی اور ظرافت کے وہ وہ نمونے دیکھے کہ میسر ہونے میں نہ آتے تھے ۔ اصل جزو (؟) جو ادب کو ڈھالتے ہیں ، انھی لوگوں کے فیض صحبت سے نصیب ہوئے ۔

ان کے بعد ایک اور بزرگ سے تعارف کراؤں جو انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں اکثر تشریف فرما ہوتے تھے ۔ وہ مرزا ارشد

گورگانی تھے - خدا بخشے شاہان مغلیہ کی یادگار تھے - غدر میں شاہی خاندان پر آفتاد پڑنے سے بے خانماں ہوکر پنجاب تشریف لائے - اُن کی فارسی دانی اور شوق ادب کا کیا بیان کروں - لیکن وقت کی بات ہے کہ ہوں تو فرزند شاہ ابن شاہ ابن شاہ لیکن زندگی بسر کرنی پڑے بحیثیت ایک معمولی معلم اردو کے [غنیمت ہے کہ اب قیام پاکستان کے بعد آپ حضرات نے بھی ایک تجویز ان اساتذۂ اردو کی حق تلفی کے ازالے کے لیے پاس کر دی ہے] - آن کے شوق ادب کا کیا کہنا - تمام عمر خدمت خلق میں بسر کی - وقت ادب دانوں کو ادب سکھانے میں گزرا - آن کے کچھ اشعار یاد ہیں - ان میں ایک پاکستان کی موجودہ امت کے حسب حال ہے - وہ اسلام کے مسائل باتوں باتوں میں سکھا جاتے تھے - ان کا کلام پُرمطلب اور پُرگو تھا ، مگر افسوس کہ تلف ہوگیا اور کچھ باقی نہ رہا - اکثر فرماتے کہ السلام علیکم سے بہتر طرزِ سلام کوئی نہیں - بچوں کو بجائے سلام ''گڈ مارننگ'' سکھایا جانا شروع ہوا تو اس پر چوٹ کرتے ہیں :

کبھی گر اہل اسلام سے ملو تم ، کہو السلام علیکم
. . . . صبح اچھی یا سلام اچھی
(ناتمام) . . . .

ایسے انگریزی دان تو نہ تھے ، مگر اپنے وقت کے طلبہ کو شیکسپئر اور ملٹن کا مداح پایا تو خود بھی پڑھا - فرماتے ہیں :

ملٹن ہو یا شیکسپئر یا ہوں ٹینی سن
. . . . مانا کہ
مانا کہ اس زمین کے ہو تم آسمان (ناتمام)

گو کہ گا سکتے تھے لیکن تحت اللفظ پڑھتے - غزلیں بہت ہی عمدہ اور بہترین سلجھی ہوئی ہوتیں - یہ ایک مرض ہو چلا ہے [خدا کرے کہ ختم ہو] کہ ہر انجمن میں لڑائی ہوتی ہے - اس ضمن میں ایک ہی شعر میں نااتفاقی اور اختلاف کا ذکر کرتے ہیں :

کنکوے کی مثال ہے اپنی ارشد
چڑھنے ہیں بلندی پر پونچ لڑانے کے لیے

غرض کہ اس رنگ کے آدمی . . . . آن کے پاس . . . (ناتمام)

ایسے ایسے استاد فن اس ملک کے لوگوں کو اپنے فیض سے مستفید کرتے رہے - آن حضرات کی مخلصانہ اور بے لوث محنتیں پھل لائیں - دوسرے صوبے والوں حتیٰ کہ اردو کے مراکز کے باشندوں نے سنا ، اپنا سر دھنا اور داد دی - دیکھی آپ نے آس وقت کے ادب کی رفتار -[۱] عورتوں کے لیے نصیحت کے دریا 'بنات النعش' ، 'مرآۃ العروس' جیسی کتب میں افسانوں کے رنگ میں بند کیے - مستورات کے لیے ایسے لٹریچر نے تعلیم نسواں کا شوق ہر ایک کے دل میں پیدا کر دیا - سب آن کی محنت کا نتیجہ ہے - جہاں وہ کتابیں عورتوں کے لیے مفید ہیں اور ہندوستانی روزمرہ اور محاورات خوب ملتے ہیں ، وہاں طرز بیان ، روانی کلام سیکھنے کے لیے سب کو یکساں مفید ہیں - یعنی ایک معنی میں انھوں نے زبان کی بلندی اور خوبی کا معیار ایسی معیاری حد تک پہنچا دیا جس تک پہنچنا بہت مشکل ہے - آس وقت کا ایک رنگ قابل ذکر ہے - مشاعروں کا شوق آس وقت بہت تھا - جیسے آج کل اچھے بُرے دونوں طرح کے

---

۱ - ارشد گورگانی کے بعد یہاں پھر مولوی نذیر احمد کا تذکرہ ہورہا ہے -

مشاعرے ہوتے ہیں ، ویسے ہی اُس وقت کے بعض مشاعرے بہت اچھے ہوتے تھے ، بعض خراب بھی - آج کل تو لوگ سیز اورکرسیوں کو سجاتے ہیں اور اسے بھی سینما ہال کا نمونہ سمجھتے ہیں - کیونکہ وہ پیسے دے کر آتے ہیں اور (مشاعرے کو) تفریح کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں - البتہ اُس وقت کا رنگ جدا تھا ؛ ٹکٹ نہ ہوتے تھے ، سامعین معقولیت پسند ہوتے اور دلچسپی سے سنتے - یہ ترقی کا زمانہ ہے ، دنیا تماشا دیکھنے دکھانے آتی ہے - یہ تھی اُس وقت کے مشاعروں کی فضا -

ہمارے ایک دوست احمد حسین خاں نے پنجاب کا خوب نام کیا - اُن کے ناولوں اور نظموں میں ایک خصوصیت تھی روانی اور آسانی - اپنی نظموں میں موتی اور لڑی کا ذکر اکثر کرتے - اُن کی نظم ''موتیوں والی'' مشہور تھی - وہ اپنی کہہ جاتے اور لوگ چٹخارے لیتے رہ جاتے - ابتدا میں سوسائٹی میں کبھی مضمون اور کبھی نظم سے نوازتے - اس زمانے اور اقبال کے زمانے کا موازنہ کیا (؟) -

اقبال مرحوم نے ''ہمالہ'' لکھی اور جلسے میں پڑھی - میں نے چھیننی چاہی لیکن وہ یہ کہہ کر کہ ابھی اصلاح کرنی ہے ، لے گئے - میں بھی اس اصلاح سے اچھی طرح واقف تھا - اصلاح ہوتے ہوتے وہ چل جاتی - میں تاک میں رہا اور کسی نہ کسی طرح چھین لایا ، اور ''مخزن'' نکلتے ہی چھاپ دی - خیر ، یہ تو مقامی رنگ تھا - سوسائٹی کے جلسوں میں اقبال اور احمد حسین خاں اور کبھی کبھی چودھری خوشی محمد ناظر بھی تشریف لاتے - وہ پنجاب کے ادیب تھے - شریف ، خلیق ، ملنسار اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حالی کے شاگرد -

طرزِ بیان سادہ ، مناظرِ قدرت کے بیان میں وہ رنگینی چھائی کہ سب کچھ رنگین ہو جاتا ۔ آن کا کلام 'نغمہ' فردوس' کے نام سے چھپا ۔ چند نظمیں ہوں گی ۔ پبلک کو معلوم ہی نہیں ۔ آن کا ابتدائی طالب علمی کا زمانہ علی گڑھ میں بسر ہوا ۔ انہوں نے ایک واقعہ منظوم کیا ؛ ایک سادہ سی بات تھی کہ دہلی میں ''ساقی'' ہوتے ہیں ۔ ابھی تو کچھ دیکھنے والے موجود ہیں اور جانتے ہیں کہ ساقی 'حقہ پلانے والے کو بھی کہتے ہیں ۔ خیر ، تو آن کا کام یہ تھا کہ میلے ٹھیلے یا رونق کے وقت 'حقے پر سبز سرسوں اگائی ہوتی تھی ۔ گرمیوں میں 'حقے کو بالکل تازہ دم رکھتے تھے ۔ ہاں تو یہ طالب علمی کے ایام کا واقعہ ہے :[1]

سیرِ دہلی کو ایک دن ناظر
چاندنی چوک سے جو جانے لگا
ایک ساقیِ سال خوردہ و ضعیف
آ کے 'حقہ مجھے پلانے لگا
اس کے حقے پہ سرسوں پھولی تھی
سبزہ و گل کا لطف آنے لگا
نام پوچھا کہا ''مبارز خاں''
نام سن کر میں مسکرانے لگا

---

۱ ۔ نظم کا عنوان ہے ''تصویرِ عبرت'' ۔ خوشی محمد ناظر نے آغاز میں یہ وضاحت کی ہے :

''یہ نظم یہاں تک تو اصلیت پر مبنی ہے کہ ایک ساقی نے مجھے چاندنی چوک میں ایسا حقہ پلایا اور معلوم ہوا کہ وہ ایک سابق شاہی خاندان کا وارث تھا ۔ باقی مکالمہ زبانِ حال کی تقریر ہے ۔''
(نغمۂ فردوس ، ص ٦٥)

میرے ہنسنے پہ رو دیا ساقی
اور یوں دردِ دل سنانے لگا

میں نے کئی دفعہ ارادہ کیا کہ اس پر ایک حاشیہ لکھوں اور آنے والی نسلوں کو بتاؤں کہ حقہ، ساقی، سرسوں، سبزہ و گل کا لطف کیا چیز تھی - ایک دن آنے والا ہے کہ سرسوں بھی ہوگی، گل بھی ہوگا، مگر جماعت میں جب کہیں ذکر آ گیا تو پروفیسر عینک لگا کر کہے گا "یہ شعر ایسے ہی لکھے ہوئے ہیں - بھلا حقہ اور سبزہ اور ساقی کا کیا جوڑ --- ساقی تو شراب کے ساتھ درست ہے - یہ تو صرف استعارات و تشبیہات ہیں، صرف رنگ مراد ہیں -"

آن کی طالب علمی کے زمانے کی ایک اور چیز بہت مشہور ہوئی "کشمیر" - کبھی پھرتے پھراتے آگرہ آ گئے، بعدہ ایک مسدس اور ایک نظم لکھی اور خوب لکھی :

کیوں نظر آتا ہے فرصت سے آنا تیرا
. . . .
. . . . (ناتمام)

اس رنگ میں بند لکھے اور آخر تک یہی رنگ قائم رہا - ایک شعر ان کا قابلِ پسند اور حسبِ حال ہے - آن کو نظر آ رہا تھا کہ کیسا زمانہ آ رہا ہے :

آن کی اپیل جو منظور . . . . . . (ناتمام)

یہاں ایک مشاعرہ تھا - میاں بشیر احمد بھی تھے - اس دن عمدہ ترین غزل پر انعام ملنا تھا - انعام تو کیا ملتا، نام تھا - پلیٹ

فارم کیا تھا، ہندو مسلم اتحاد کا پروپیگنڈا منتر - آپ نے سیاست اور روش زمانہ کا اندازہ کر کے فرمایا :

گائے آج ،الگ ہی ہے گھر بار کی (کذا)
اونٹ کا بھی کچھ ٹھکانا چاہیے

ایک ہی شعر میں سب کچھ کہہ گئے - جنھوں نے وہ آنکھیں دیکھیں ، اُس ادب کے فیض سے مستفید ہوئے ، وہ مجسّم ادیب بن گئے - اب دورِ اقبال و دور ''مخزن'' کے بعد یہ زمانہ آ گیا - پنجاب کے ادب کے معیار کو قائم رکھنے اور بلند کرنے میں جس ہمت و محنت کی ضرورت ہوتی ، اور اس میں جو حصہ اقبال مرحوم کا ہے ، اُس کا آپ اندازہ کر سکتے ہیں - البتہ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ کلام میں پختگی آتی گئی اور رنگ جم گیا - پہلے کلام کا کچھ مجموعہ ''نیرنگ'' میں ملتا ہے - اُس کے بعد ''شوق خدمت'' رنگ لایا ، حتّیٰ کہ یہ کہنا پڑے گا کہ مجذوبیت کا رنگ بھی موجود ہے - نظم اور نثر نگاری کے کچھ نمونے موجود ہیں - اسی سلسلے میں مرزا اعجاز حسین صاحب انبالوی کا ذکر بھی کرنا ہوگا - ایک دوسرے کی طبیعت پر انھوں نے بہت اثر ڈالا - اس رغبت اور شوق میں ہم رنگ تھے - اُن کے کلام کا بہت کافی حصہ غیر مطبوعہ ہے - لکھا اور بہت خوب لکھا - تنقید بھی کرتے تھے - اور لوگ بھی ملک میں اس رنگ کے پیدا ہوئے - جب اقبال نے لکھنا شروع کیا تو غالب کا رنگ اختیار کیا - اُس وقت کے بعض یو - پی کے ہم عصروں میں سرور جہان آبادی [اُن کے کلام کا رنگ اس ڈگر پر تھا کہ اگر یہ آہ کہتے تو وہ بھی آہ کہتے اور یہ ہائے کہتے تو وہ بھی ہائے کہتے] کو خاص طور پر اتباع کا شوق تھا - لیکن افسوس تو یہ ہے کہ

جلدی فوت ہوگئے ۔ جتنا کلام ہے ، سب موزوں ۔ اسی رنگ میں رنگے ہوئے ایک اور بزرگ تھے ۔ نادر کاکوروی ، وہ بھی جلد فوت ہوگئے ۔

اس دور میں حسرت موہانی بہت مشہور ہوئے ۔ آن کی ذہانت اور شوق ادب کا کیا ٹھکانا ۔ ایک رسالہ 'اردوئے معلی' جاری کیا ۔ خوب پرچہ تھا ۔ ابتدا میں تو اقبال آن کو نہ بھایا ، البتہ بعد کو مداح ہوگئے ، آن کی ہر چیز میں [زبان کے اعتبار سے] ایک مخصوص اچھوتا پن تھا ۔ غزل میں تو رنگینی تھی لیکن نظم خشک ۔ اور آن کے کلام کی موزونی اور پختگی کا یہ عالم تھا کہ اقبال اور دیگر ہم عصر سب معترف تھے ۔ نیک نیتی اور عقیدے کے پکے ۔ ملک کی خدمت کے جذبے میں قید فرنگ میں چکیاں پیسیں اور دیگر تکالیف برداشت کیں ۔ میں آن دوستوں میں ہوں جن کو ہمیشہ آن کی خوبیوں کا اعتراف اور صعوبتوں کا رنج رہا ۔ کاش خدا کے ہاں آن کو پورا صلہ ملے ۔ وہ تمام عمر صرف ادب کی خدمت میں مصروف رہے اور ہمیشہ ادب کی تاریخ میں زندہ رہیں گے ۔

ایک اور دوست نظم طباطبائی تھے ؛ آن کے ضعف جسمانی کا ہمیشہ افسوس رہا ۔ آن کی ذہانت ، روانئی طبع ایسی کہ ہمیشہ بےساختہ اور فوراً نظم کہی ۔ وہ بھی ایسی کہ ہر مرتبہ اچھی اچھی باتیں ، نئے نئے محاورے اور نئے نئے اسلوب تو بےمثل ہیں ۔ آن کے تراجم بےنظیر ہیں ۔ خوب نام پایا اور واہ واہ لی ۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر اپنا سب وقت ادب کی خدمت میں ہی صرف کرتے تو موجودہ مقام سے بھی کہیں بلند تر ہوتے ۔ یہ بھی ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے رسالے اور اخبار کے ذریعے پنجاب میں اردو کو خوب

پھیلایا ۔ واقعی ایک بلند ہستی تھی ۔ یہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں ، اُن کی بلندی مقام کا اعتراف ہے ۔ وقت کے لحاظ سے آگے چل کر جو کچھ بھی کہنا ہے ، یہ فعل ارادی نہیں ۔ جن لوگوں نے خدمت کی ، اُن کا نام ہمیشہ برقرار رہے گا ۔

اس ضمن میں اُس شخص کا ذکر کرنا ہے جو نہ صرف خدمت پنجاب میں مصروف رہا ، بلکہ نوجوانوں کو ترغیب دلانے اور حوصلہ افزائی کرنے میں سب سے آگے ، یعنی میرے مرحوم دوست جسٹس میاں شاہ دین ، ہمایوں تخلص کرتے تھے ۔ رسالہ 'ہمایوں' اُنھی کی یادگار ہے ۔ اُن کے فرزند میاں بشیر احمد اس کے ذریعے ملک کی خدمت کر رہے ہیں ۔ سچے اور مخلص خادم ہیں ، چوٹی کے ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں ۔ کل جس وقت ملک صاحب خطبۂ استقبالیہ میں نام لے رہے تھے تو آواز آئی کہ میاں بشیر احمد بھی شامل ہونے چاہئیں ۔ میں یہ بتانے کو تھا کہ اس سے یہ مقصد نہیں تھا کہ وہ کسی شمار میں نہیں ، بلکہ موجودہ حضرات میں سے صرف وہی بوڑھے بوڑھے شامل کیے گئے ہیں جو جلد رخصت ہونے کو ہیں ۔ یہ سلسلہ اسی طرح ہوتا آیا ہے اور یوں ہی ہوتا رہے گا ۔ اسی طرح اور دیگر حضرات بھی ہیں ۔ میاں عبدالعزیز فلک پیما بھی اسی شہرت کے مالک اور انھی اراکینِ ثلاثہ و خمسہ میں سے ہیں ۔ نیرنگ و اعجاز اور یہ حضرت میرے خاص دوستوں میں سے ہیں ۔ اب واقعی فلک پیما ہیں ۔ زمین پر نہیں رہتے ۔

یہ شعریت نہیں ، قاعدہ ہے کہ جو نہیں سمجھتے ، وہ "بز اخفش" کی طرح سر ہلاتے رہتے ہیں ۔ اب ترقی پسند ادب کا دور ہے اور میری کیفیت بھی یہی ہے کہ سر ہلاتا رہتا ہوں ۔ یہ خطۂ زمین ہے

ہی ایسا - اس کے بعد یہ بھی اتفاق ہے کہ جب ولایت سے واپسی کے بعد "غالب" پر کام کے لیے دہلی میں مقیم ہوا تو "مخزن" بھی دہلی سے نکلتا تھا - یہ تو دیکھنے والے بتا سکتے ہیں کہ اس وقت اچھا تھا یا پہلے - معیار کے بارے میں کچھ شک نہیں کہ ہم نے قائم رکھنے کی کوشش کی - اس جگہ کچھ ہم رنگ حضرات مل گئے - یہ زمانہ "مخزن" کے لیے نہیں بلکہ خود میرے لیے سبق کا تھا - میں نے بہت کچھ سیکھا اور خوش رہا - وہ لوگ ملے جو اب منتشر ہیں - میں نہ تو مسن تھا اور نہ ہی نوجوان - خواجہ حسن نظامی ، قاری سرفراز (عظیم حسین ؟) وغیرہ جیسے خوش ذوق ، جدت پسند ناول نویس - راشد الخیری مرحوم [جو بہت عرصے تک ہمارے رسالے میں جوائنٹ ایڈیٹر رہے] مولوی نذیر احمد کے رنگ کے بڑے کامیاب متبع ہونے کے علاوہ ایک مخصوص رنگ کے مالک تھے جس نے انہیں "مصورِ غم" بنا دیا - عورتوں کے مصائب کو ایسے ڈھنگ میں پیش کرتے ہیں کہ رلا دیتے ہیں - صنفِ نازک کے خاص ہمدرد ہیں -

ایک اور صاحب جو اپنے زمانے میں بہت مدد دیتے رہے جن کے ساتھ بحث و مباحثہ میں بھی لطف اور فائدہ حاصل ہوتا تھا ، وہ حضرت ناصر نذیر فراق دہلوی تھے - ان کے علاوہ سلطان حیدر جوش ، بے خود ، نواب سراج الدین احمد سائل کو دیکھا - مؤخر الذکر یہاں بھی آتے تھے - خوب تن کر پڑھتے تھے - گویا کہ نثر نگار ، ناول نویس ، شاعر کا اچھا خاصا مجموعہ تھا - انہوں نے کیا کیا دیکھا ہوگا جنھیں ہم نے دیکھا - غرض کہ اس فیکٹری کو دیکھا جہاں سے ادب نکلا اور پھیلا -

دہلی پر بے انتہا شعر لکھے گئے ۔ آیسے 'دلی مرحوم' کہا گیا ، لیکن اب تو وہ فوائحتاجت اس سے زیادہ رحمت کی طلب گار ہے ۔ دو بار آجڑی ، وہاں کے ادیب عالم بھر میں بکھرگئے ۔ جیسے کل خواجہ محمد شفیع صاحب نے کہا تھا کہ کس چمن کی آبیاری کریں . . . .

حالی نے بھی دلی کا فسانہ سنایا :

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

اب تو ہم ہیں اور آن کا نوحہ ۔ یہ ایک نمونہ ہے آس رفتار ادب کا جو بیان کرنا تھا ۔

دیگر مقامات کے ادیب دیکھیے ، اور اب اس طرف آتے ہیں جس طرف رسائل کے ذریعے ادب پھیلا ۔ ''مخزن'' کا ذکر تو پہلے آ چکا ہے ۔ کچھ اس سے پہلے ، کچھ اس کے بعد اور کچھ اس کے ساتھ ہی شائع ہوتے رہے لیکن آن کی فہرست لمبی ہے ۔ بعض چلتے رہے ، بعض نہ چل سکے ۔ ایک خیال ہمیشہ میرے دل میں آتا رہا ، ممکن ہے میں نہ کر سکوں ، شاید کوئی عصر حاضر کا ادیب آس کو پسند کرے اور اپنا لے ، کام دے گا ؛ وہ یہ ہے کہ گزشتہ پچیس تیس سال میں کئی رسالے نکلے اور بند ہوئے ۔ ان میں امتیاز علی تاج کا میکش ، ہزار داستان ، کہکشاں اور دیگر دو چار ایسے رسالے ہیں جو جلدی بند ہوگئے ۔ اسی طرح 'ظریف' الہ آباد اور یو ۔ پی کے دیگر رسائل اس قابل ہیں کہ آن کے فائل دیکھیں ۔ آن میں کئی کئی مسائل مستقل حیثیت رکھتے ہیں ۔ ان سے بہت عمدہ مجموعہ پیدا کیا جا سکتا ہے اور آس کا نام ''آب رفتہ'' رکھ در جُو نمی آید باز)

مناسب رہے گا ۔ اسی سلسلے میں ایک اور چیز عرض کرتا ہے کہ پاکستان میں ایک "رسالہ لائبریری"، کی داغ بیل ڈالیں ۔ ہندوؤں نے الہ آباد میں ایک "رسالہ لائبریری" قائم کی تھی جس میں چن چن کر ہندی رسالوں کو جمع کیا گیا ۔ چند پرچے شاید 'مخزن' کے بھی تھے ۔ ہمارے ہاں بھی ایسی لائبریری ہونی چاہیے ۔ سید سلیمان ندوی کے 'معارف' سے ذرا پہلے سرسید کے اعزاز میں وحیدالدین پانی پتی نے رسالہ جاری کیا جو خشک تھا ۔ ایڈیٹر صاحب تو اچھے بھلے کو خشک کہہ دیتے ہیں، لیکن وہ سچ مچ خشک تھا ۔ اس کی اشاعت سو کے قریب تھی ۔ اس زمانے کے رسائل میں دو باتیں ہوتی تھیں جو ان کو مقبول عام نہ بنا سکیں ؛ یا تو خشک مضامین یا صرف مشاعرے کے ریکارڈ ۔ ایک "پیام یار" بھی تھا ۔ خدا غریق رحمت کرے اس کے ایڈیٹر کو ۔ اس میں شعرا کا تذکرہ ہوتا تھا، اچھے معیار کا پرچہ تھا ۔ ایک "خدنگ نظر" تھا ۔ بس یہ سمجھیے کہ جو خیال بھی پیدا ہوا ، قابل ذکر ۔

جب لکھنؤ میں اردو پر ہندی کی یورش ہوئی (تو) ایک تہلکہ مچ گیا ۔ نواب محسن الملک کی صدارت میں اجلاس ہوئے ۔ پنجاب سے میں ، لیرنگ اور مرزا اعجاز بھی گئے ۔ ہمارے جانے سے وہاں بڑی تشویش پیدا ہوئی ۔ سی ۔ آئی ۔ ڈی والے ان سے دریافت کریں کہ یہ تین پنجابی ، یو ۔ پی میں کیوں آئے ؟ ہمارے والد صاحبان کے نام دریافت کیے گئے ۔ حامد علی خاں صاحب سیکرٹری تھے ، انھوں نے نہ بتایا ۔ مجھے خیال آیا کہ کہہ دوں "وجہ یہ ہے ، جو یو ۔ پی کی اردو مقتول ہوئی تو اس نے پنجاب کی اردو کو آواز دی ، خبردار ! ہم تو اپنی مصیبت کے علاج کے لیے آئے ہیں ۔* مجھے ایک

انگریزی Stanza یاد آیا ، ہمارے مزار تو ذرا کم بولتے ہیں :

Remember me as you pass by,
As you are now once was I :
As I am now so you shall be,
So prepare yourself to follow me.

نواب محسن الملک مرحوم نے وہ دھواں دھار تقریر کی کہ جو ریکارڈ کیے جانے کے قابل تھی ۔ اور کہا کہ اردو نہیں مرے گی ۔ اگر مرے گی تو "عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے" کے مصداق اس کا جنازہ بھی دھوم دھام سے نکلے گا ۔ چونکہ نواب صاحب علی گڑھ کالج کے سیکرٹری تھے اور کالج کو گرانٹ ملتی تھی ، فوراً نوٹس آیا کہ علی گڑھ کالج کی گرانٹ بند ۔ گو حضور میکڈانلڈ کو بہت تکلیف ہوئی لیکن وہ جملہ کام کر گیا ۔ ہندی اردو یک جا کر دی گئی ۔ سرکاری کاغذات میں دو کالم بن گئے ۔ لیکن یہ چیز قابل ذکر ہے کہ وہاں اب بھی وہی حالت ہے ۔ اب پھر آس پر وار ہوا ہے ۔ اب بھی زندہ رہنے کی کوشش کرنی ہے ، خدا کامیاب کرے ۔

جالبین کی غلط فہمیوں اور بداعتدالیوں کے باعث آپس میں مغایرت پیدا ہو چکی ہے ۔ کبھی تو ایک دوسرے پر تنقید کرتے ہیں ، کبھی سیاست کو بیچ میں داخل کرتے ہیں ۔ شاید ذوق مرحوم کا واقعہ ہے کہ خواجہ نے دہلی میں استاد کے سامنے کچھ کہا تو فرمایا کہ کچوری کی بو آتی ہے ۔ ضرورت اس چیز کی ہے کہ رسالہ سیاسیات سے الگ ادب کی خدمت کرے ۔ دونوں کو (نہ) ملائیے ۔ اس کے لیے جوش اور کوشش درکار ہے ۔ میں جدید ادب کا اس حد تک مداح ہوں جہاں تک جزو مشترک ہے ۔ یعنی وہ مضمون باندھنا ہے جو دونوں یا ہر ایک کو [اپیل کرتا ہے] پسند آ سکتا ہے ۔

ایک واقعہ یاد آتا ہے کہ ایک نووارد پٹھان دہلی میں پہنچا ۔ کوئی اردو کی غزل گائی جا رہی تھی ۔ حاضران اس کی خوبیوں اور باریکیوں کے پیش نظر خوب داد دے رہے تھے ۔ لوگوں نے پوچھا "خان صاحب ! آپ بھی کچھ سمجھے ؟ بولے کہ ہاں خوب تھی ۔ چونکہ سب داد دے رہے تھے ، اس لیے خوب تھی ۔ یعنی جزوِ مشترک کارفرما تھا ۔

ایک ایک بند میں کیا کچھ بند ہوتا ہے ، غزل کو ہر ایک پسند کرتا ہے ۔ نظم میں کام کی بات ہوتی ہے ۔ ایک ایک شعر میں مفید باتیں ہوتی ہیں ۔ ہندوؤں کا عملی مذاق اس طرف مائل نہ تھا ، وہ پسند نہ کرتے ۔ ہمارے ہاں جو کچھ پسند ہے ، اس میں اقبال کا شکوہ سب سے بلند ہے ۔ اس نے بہت بڑا کام کیا ۔ مسلمانوں کی اصلاح ، احیائے قوم ۔ فارسی اگر اتفاقاً آ جائے تو خیر ، ورنہ فارسی کو اردو میں بری طرح نہ ٹھونسیے ۔ اب پاکستان میں ان باتوں کو چھوڑ دیں ۔ ایک پروگرام تیار کریں ، ترقی اردو کے مشورے کریں ۔ موہن سنگھ دیوانہ جیسے حضرات کو نظرانداز نہ کریں ۔ مشاعرے کرائیں تاکہ ہر دل عزیز بنا سکیں ۔ میرے کان میں اقبال کا یہ شعر بہت گونجتا ہے :

مدیرِ "مخزن" سے کوئی اقبال جا کے میرا پیام کہہ دے
جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں ، انھیں مذاقِ سخن نہیں ہے

مذاقِ سخن کی بجائے مذاقِ عمل پیدا کرو اور ترقی کے راستے پر گامزن ہو جاؤ ۔

* * *

نواب مرزا داغ دہلوی[1]

داغ دہلی کے قدیم سکول آف پوئٹری کے ایک شاعر ہیں ۔ گو ان کی تصانیف کا تعلق انیسویں صدی کے نصف آخر سے ہے مگر انھوں نے اپنے ممتاز ہمعصر امیر کی طرح جو لکھنؤ اسکول کے قابل فخر نمایندے تھے ، بڑی احتیاط کے ساتھ غزل کے قدیم استادوں کی روایات کو قائم رکھا اور زبان کی پاکیزگی کو مغربی اثرات سے ذرا بھی متاثر نہ ہونے دیا جو اس زمانے کی نمایاں خصوصیات بن رہے تھے ۔ وہ اسی انداز میں داد سخن دیتے رہے گویا ہندوستان خالص ایشیائی حکومت تھی ۔ مغربی تعلیم کی ترقی کے ساتھ ساتھ جو نئے نئے خیالات ملک میں پیدا ہو رہے تھے ان کی طرف بالکل متوجہ نہیں ہوئے ۔ انگریزی زبان کے جو الفاظ اردو میں داخل ہو رہے ہیں وہ ان کی شاعری میں بہت کم نظر آتے ہیں ۔ جو تراکیب انگریزی محاورات کے نمونے پر وضع کی گئی ہیں اور جن کا استعمال مسلمہ شہرت کے مصنفین بھی نظم و نثر دونوں میں کثرت سے کرتے ہیں ، وہ داغ اور امیر کے ہاں نظر نہیں آتیں ۔ ان کے کلام کا طرز اور خیالات کا انداز اخیر تک انھی اصولوں کے مطابق رہا جو انھوں نے زبان کے بارے میں شروع سے اختیار کر لیے تھے ۔ ممکن ہے ایک زمانے میں جب کہ

۱۔ نواب مرزا خان داغ (۲۵ مئی ۱۸۳۱ع تا ۳ اکتوبر ۱۹۰۵ع): منقول از ادبی دنیا ، ستمبر ۱۹۲۹ع ، جلد ۱ شمارہ ۵ ، ص ۳۰۷ تا ۳۰۹ ۔ اور ادبی دنیا اکتوبر ۱۹۲۹ع ، جلد ۱ شمارہ ٦ ، ص ۳۹۳ تا ۳۹۷ ۔ یہ رسالہ سر شیخ عبدالقادر کی زیر نگرانی چھپتا تھا ۔ مولانا تاجور نجیب آبادی اس کے چیف ایڈیٹر اور حنیف ہاشمی ایڈیٹر تھے ۔ اس کا پہلا شمارہ مئی ۱۹۲۹ع میں منظر عام پر آیا تھا ۔

نئے اثرات کا غلبہ ہو رہا تھا ، ان کی قدامت پرستی موروثی روایات اور ابتدائی تربیت کا نتیجہ ہو ، لیکن ایک بات ایسی ہے جو اس بارے میں خاص طور سے ان پر اثر انداز ہوئی ۔ وہ یہ کہ انھوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ رامپور میں بسر کیا جہاں کے حالات قدیم خیالات کے موافق تھے اور جہاں ان کو مغربی تعلیم اور مغربی علما سے دوچار ہونے کا موقع نہیں مل سکتا تھا ۔ داغ رامپور سے حیدر آباد چلے گئے مگر وہاں کی فضا بھی سر سے لے کر پیر تک ایشائی تھی ۔ یہ ضرور ہے کہ وہاں اپنے آخری ایام میں ان کا میل جول ایسے اصحاب کی تعداد کثیر سے ہوا ہوگا جنھوں نے مغربی تعلیم پائی تھی اور مغرب کا طرز زندگی اختیار کر لیا تھا ۔ مگر وہ اس وقت اس قدر سن رسیدہ ہو گئے تھے کہ ان میں کوئی تبدیلی پیدا ہونا ناممکن تھا ۔ مختصر یہ کہ وہ میر ، غالب اور ذوق کے ایک جانشین کی حیثیت میں زندہ رہے اور اسی حیثیت میں فوت ہوئے ۔

نواب مرزا خاں داغ ، شمس الدین خاں کے بیٹے اور نواب احمد بخش خاں کے پوتے تھے ۔ پرانے وقتوں کے دوسرے معزز خاندانوں کی طرح یہ بھی اپنی فوجی اور ادبی روایات کے لیے مشہور تھا ۔ نواب مرزا کی تعلیم قدیم طریق پر ہوئی ۔ انھوں نے فارسی غیاث اللغات کے مصنف مولوی غیاث الدین سے پڑھی ۔ خوشنویسی کی تعلیم اپنے زمانے کے دو بہترین خوشنویسوں ـــ یعنی میر پنجہ کش اور مرزا عباد اللہ بیگ سے پائی ۔ اس کے علاوہ شمشیر زنی ، شہسواری اور نشانہ بازی کی تعلیم بھی پائی ، اور اس طرح سے وہ اس زمانے کے معیار کے مطابق چھوٹی ہی عمر میں مکمل نوجوان بن گئے ۔ اس زمانے میں شعر لکھنے کا فن بھی شرفا کے لیے ضروری سمجھا جاتا

تھا - اس فن میں داغ نے دہلی کے مشہور شاعر ذوق کے سامنے زانوے تلمذ طے کیا جو شاہ دہلی کے ولی عہد کے بھی استاد تھے - اس تعلق سے انھیں نہ صرف اردو شاعری کے ایک مسلم الثبوت استاد کی رہنمائی حاصل ہوگئی بلکہ ولی عہد سے بھی ان کا میل جول ہوگیا جو شاعری کا بہت اچھا مزاج رکھتے تھے اور تن دہی سے اس فن کی تکمیل میں مصروف تھے - داغ ابھی لڑکے ہی تھے کہ انھیں ان مشاعروں میں شامل ہونے کا موقع ملنے لگا جو محل کے اندر منعقد ہوا کرتے تھے اور جن میں اس زمانے کے باکمال شعرا شرکت کیا کرتے تھے - ایک مشاعرے[1] میں جہاں بادشاہ بھی خود موجود تھے، داغ نے ایک غزل پڑھی جس سے بادشاہ اس قدر خوش ہوئے کہ انھوں نے ان کی پیشانی پر بوسہ دیا - تھوڑے ہی عرصے میں وہ ایک ایسے شاعر تسلیم کیے جانے لگے جس کو شاعری کا ملکہ

۱- قلعۂ معلی میں مشاعروں کی محفلیں اکثر ہوتی رہتی - امرا ، سلاطین ، متوسلین اور شہر کے شرفا ان میں شریک ہوتے - کبھی کبھی بہادر شاہ ظفر بھی رونق افروز ہوا کرتے تھے - ایسی ہی ایک بزم سخن میں داغ نے بھی غزل پڑھی تھی - چودہ برس کی عمر تھی ''دم نکلے ، ہم نکلے'' زمین تھی - اس میں غالب کی غزل مشہور ہے - انھوں نے پہلی بار اسی مشاعرے میں یہ غزل پڑھی تھی کہ :

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہوکر ترے کوچے سے ہم نکلے

داغ نے ذوق کے اشارے سے اپنی غزل سنائی - جب یہ شعر پڑھا :

ہوئے مغرور وہ جب آہ میری بے اثر دیکھی
کسی کا اس طرح یا رب نہ دنیا میں بھرم نکلے

تو سب نے بڑی داد دی - ظفر نے داغ کو اپنے قریب بلایا اور پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے کہا ''اللہ نظرِ بد سے بچائے - یہ عمر اور یہ شعر !''

قدرت کی طرف سے عطا ہوتا ہے اور جو محض حصول فن یا تکمیل رسم کے طور پر شعر گوئی نہیں کرتا ۔ اگرچہ ذوق اوج شہرت پر پہنچ چکے تھے ، اور غالب جو اول اول فارسی شاعر مشہور تھے ، اب ایک اردو شاعر کی حیثیت سے بھی نمایاں شہرت رکھتے تھے ، لیکن یہ امر قابل ذکر ہے کہ ۱۸۵۷ء میں داغ بھی بڑے بڑے شعرا میں شمار ہونے تھے ، گو ان کی عمر صرف ۲۶ سال کی تھی ۔

غدر اور اس کے بعد تباہی و بربادی کا المناک افسانہ محتاج بیان نہیں ۔ دہلی سے بہت سے علما و فضلا اپنا گھر بار چھوڑ کر ہندوستان کے دوسرے حصوں میں نقل وطن کرنے پر مجبور ہوگئے ۔ یہ بڑی بد قسمتی تھی لیکن اس سے قدیم دہلی کی تہذیب و علمیت ہندوستان بھر میں پھیل گئی ۔ بہت سے شعرا نے دہلی کی بربادی پر مرثیے لکھے ۔ داغ نے بھی ایک مسدس لکھا ۔ اس مدس کے اشعار ذیل سے معلوم ہوگا کہ دہلی کی بربادی سے ان کے دل کو کس قدر صدمہ پہنچا :

زمیں کے حال پر اب آسماں روتا ہے
ہر اک فراق مکیں میں مکان روتا ہے
گدا و شاہ و ضعیف و جوان روتا ہے
غرض یہاں کے لیے اک جہان روتا ہے

اس سلسلے میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ اگرچہ داغ کا دل اپنے پیارے شہر کی بربادی پر ماتم سرا تھا تاہم پیغمبرانہ شعاع امید سے خالی نہ تھا ۔ چنانچہ دوسرے شعرا کے برعکس انھوں نے اپنی نظم کو ذیل کے شعر پر ختم کیا :

الٰہی پھر اسے آباد و شاد دیکھیں ہم
الٰہی پھر اسے حسب مراد دیکھیں

اگرچہ بعد میں انھیں نو آباد شدہ دہلی کو دیکھنے کا موقع وقتاً فوقتاً ملتا رہا تاہم ان کے لیے، جو ہندوستان کے دارالسلطنت کا بہتر زمانہ دیکھ چکے تھے، یہ کافی نہ تھا۔ وہ ملک کے ایک دور دراز حصے میں فوت ہوئے جسے انھوں نے اپنا وطن بنا لیا تھا، اور جہاں وہ کامیابی کی انتہا تک پہنچ گئے تھے۔ لیکن داغ کے قیام دکن کی داستان بیان کرنے سے پیشتر ہم ان کی زندگی کے اس بہترین حصے کے متعلق کچھ کہنا چاہتے ہیں جو انھوں نے رام پور میں بسر کیا۔ اس مہمان نواز ریاست کے حکمران اپنے ادبی مذاق اور اپنی ادب پرستی کے باعث ہمیشہ سے مشہور رہے ہیں۔ انقلاب دہلی کے بعد داغ، نواب یوسف علی خاں[1] کے زمانے میں رام پور چلے گئے اور نواب کلب علی خاں کے زمانے تک، جو نواب یوسف علی خاں کے بعد گدی نشین ہوئے، بڑے راحت و آرام کے ساتھ مقیم رہے۔ انھیں شاہی اصطبل کا داروغہ مقرر کیا گیا۔[2] اگرچہ یہ عہدہ بظاہر غیر شاعرانہ تھا لیکن نواب

۱۔ نام یوسف علی خاں، ناظم تخلص، ریاست رام پور کے نواب تھے اور غالب کے شاگرد۔ داغ کی خالہ عمدہ خانم ان کی داشتہ تھیں، اس لیے داغ اکثر اپنی خالہ کے پاس رام جایا کرتے تھے۔ یا وہ نواب کے ساتھ دہلی آئیں تو داغ اور ان کی والدہ وزیر بیگم عرف معصومی بیگم سے ضرور ملنے آتیں۔ بچپن میں داغ کو نواب یوسف علی خاں نے کچھ پڑھایا بھی تھا۔

۲۔ اس کا لطیفہ بڑا مشہور ہے۔ اصطبل کے دروازے پر کسی نے یہ شعر لکھ دیا تھا:

شہر دہلی سے آیا اک مشکی
آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا

خود داغ نے شعر کی بڑی تعریف کی اور اعلان کیا کہ جس نے یہ شعر کہا ہے، وہ بلا تکلف آن کر ملاقات کرے، مگر کوئی نہ آیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ شعر مضطر خیر آبادی نے کہا تھا۔

کو ایک خود دار انسان کی طرح معاش کا ایک معقول وسیلہ مہیا کرنا مقصود تھا ۔ یہ اس بھی قابل لحاظ ہے کہ داغ شروع سے گھوڑوں کے شائق اور خود اچھے شہسوار ہونے کی وجہ سے اس عہدے کے لیے ہر طرح سے موزوں تھے ۔ پھر اس عہدے کی ذمہ داریاں بھی اتنی زیادہ نہ تھیں کہ انھیں اپنے عزیز ادبی مشاغل کے لیے وقت نہ مل سکتا ۔ انھوں نے اپنے فرائض کو نہایت اطمینان بخش طریق پر انجام دیا اور تا قیام رام پور اس عہدے پر ممتاز رہے ۔ انھیں والی ریاست کے مصاحبوں میں شامل ہونے کا فخر بھی حاصل تھا ۔ نواب صاحب ان کی صحبت کو ان کے ادبی مذاق کی وجہ سے بہت ہی پسند کرتے تھے ۔ رام پور میں بھی مشاعرے کثرت سے ہوا کرتے تھے کیونکہ نواب صاحب کے گرد غزل کہنے والوں کا ایک اچھا خاصا مجمع تھا ۔ ان میں سے تسلیم اور امیر خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ موخر الذکر بحیثیت شاعر داغ کے ایک زبردست حریف تھے ۔ داغ اور امیر کی شاعری کے موازنے پر دہلی اسکول اور لکھنؤ اسکول کے حامیوں میں جو ناخوشگوار بحث ہوتی رہی ہے ہم اس میں دخل دینا نہیں چاہتے کیونکہ اب عام طور پر یہ تسلیم کیا جانے لگا ہے کہ دور حاضرہ میں دونوں اردو غزل کے استاد ہوئے ہیں اور دونوں میں اپنی اپنی ممتاز خصوصیات تھیں ۔ اس خیال کو اس وجہ سے بھی بڑی تقویت پہنچتی ہے کہ دونوں استاد ایک دوسرے کا بڑا احترام کرتے تھے ۔ مشرق کے عام حریفانِ شہرت کے برعکس ، جو ایک دوسرے کی خوبیوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں ، یہ دونوں ایک دوسرے کی عزت کرتے اور زندگی بھر ایک دوسرے کے دوست بنے رہے ۔ یہاں تک کہ آج ان کی ہڈیاں بھی حیدر آباد کے ایک قبرستان

میں ایک ہی مرقد کے پاس ہی پاس آسودۂ خاک ہیں ، اور اس بات کی یاد دلا رہی ہیں کہ وہ اپنے زمانے کی اردو شاعری کے دو بہترین نمائندے ہیں ۔

زمانۂ قیام رام پور میں ادبی نقطۂ خیال سے داغ کی زندگی کا اہم ترین واقعہ امیر کے ساتھ ان کا مقابلہ تھا ۔ اسی مقابلے میں اس کے حقیقی جوہر کھلے ۔ مقابلے کی وجہ سے دونوں کو اپنی طبیعت پر بہت زور دینا پڑتا تھا ۔ انھوں نے اپنی غزلیات کا ایک مجموعہ "گلزار داغ"[1] کے نام سے شائع کیا اور میرا خیال ہے کہ یہ مجموعۂ غزلیات بحیثیت مجموعی داغ کے تمام مجموعہ ہائے غزلیات سے بہتر ہے ۔ یہ مجموعہ اس کے دوران قیام رام پور میں تیار ہوا اور اس میں اس کے امتیازی خصوصیات بدرجۂ اتم موجود ہیں ۔ اس میں جو غزلیں ہیں ان میں عشق و محبت کے مختلف پہلوؤں کو بڑے استادانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے ۔ زیادہ تر غزلیں موسیقی کے لیے بہت موزوں ہیں اس لیے ملک بھر کے مغنیوں میں ان کو بڑی مقبولیت حاصل ہوگئی تھی ۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے شعروں کی موسیقی بھی ان کی شہرت اور ہردلعزیزی کا موجب ہوئی ہے اور اس سے ان کا نام زبانِ زدِ عوام ہو گیا ہے ۔ بعض لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر موسیقی داں داغ کی غزلوں کو نہ لے اڑتے تو اس کی مقبولیت کا یہ عالم نہ ہوتا ۔ ان کی رائے میں یہ بات

۱۔ گلزار داغ ۱۸۷۸ع میں شائع ہوا اور مطبع انوار محمدی لکھنؤ میں منشی تیغ بہادر کے اہتمام سے چھپا ۔ اس میں ۳۹۱ غزلیں ہیں اور اشعار کی مجموعی تعداد ۴۹۶۸ ہے ۔ جناب عرشی رام پوری کی تحقیق کے مطابق ''گلزار داغ'' پہلی بار رام پور کے تاج المطابع میں چھپا ہے ۔

بحیثیت شاعر ان کی شان سے گری ہوئی ہے لیکن میں اس خیال سے متفق نہیں ۔ اگر داغ کو مغنی اور ماہران موسیقی پسند کرتے ہیں تو یہ اس کے نقص کمال کی دلیل نہیں ۔ ان کی غزلیں دیکھ کر مغنیوں کو خیال ہوا کہ عوام انھیں پسند کریں گے ۔ انھوں نے اس خیال کی آزمائش کی اور یہ صحیح نکلا ، یعنی ان کی غزلوں پر عالم گیر پسندیدگی کا اظہار کیا گیا ۔ اس طرح سے ان پر پسند عام کی مہر لگ گئی ۔ یہ غزلیں طرز بیان کی سادگی کے ساتھ اپنے اندر تاثیر بھی رکھتی ہیں ۔ اپنے رنگ میں فطرت کے عین مطابق ہیں اور زندگی اور محبت کے مختلف کیفیات کو تصویر کی طرح آنکھوں کے سامنے پیش کر دیتی ہیں ۔

داغ ، نواب کلب علی خاں کی وفات کے بعد بھی رام پور میں مقیم رہے ۔ لیکن ریاست کے اخراجات میں تخفیف ہو جانے کی وجہ سے اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ جو اسامیاں بعض شعرا کے لیے نکالی گئی تھیں ان کو زیر تخفیف لایا جائے ۔ تخفیف کے کلہاڑے کی ضرب داغ پر بھی پڑی ۔ اس طرح سے وہ اس وقت ، جبکہ ان کی عمر پینتالیس سال سے اوپر تھی ، ایک دفعہ پھر بے یار و مددگار اور قابل اعتبار ذریعۂ معاش سے محروم ہو گئے ۔ وہ واپس دہلی چلے آئے ۔ تھوڑا عرصہ یہاں قیام کرنے کے بعد انھوں نے ریاست حیدر آباد کا رخ کیا ۔ مرحوم نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ اس وقت حیدر آباد کے تخت پر جلوہ افروز تھے ۔ شاعری کے بڑے مشتاق اور خود بھی ایک سلیم المذاق شاعر تھے ۔ لیکن ان تک رسائی حاصل ہونا آسان نہ تھا ۔ یہ شرف حاصل کرنے کے لیے ہر شخص کو کافی طویل انتظار کی زحمت اٹھانی پڑتی تھی ۔ داغ پہلے پہل ۱۸۸۸ع میں

حیدر آباد گئے لیکن نظام کی خدمت میں شرف باریابی حاصل کیے بغیر واپس آ گئے ۔ مگر انہیں بہت جلد وہاں سے دلبی کا پروانہ آ گیا اور شاعری میں نظام کے استاد مقرر کر دیے گئے ۔ حیدر آباد میں ان کی زندگی کا آغاز ساڑھے چار سو روپے ماہوار کے گراں قدر مشاہرہ سے ہوا ۔ یہ تنخواہ بڑھتے بڑھتے آخرکار دو ہزار روپے ماہوار تک پہنچ گئی ۔ ہندوستان میں کسی اہل قلم کو بحیثیت اہل قلم اتنی تنخواہ آج تک کبھی نہیں ملی ۔ حضور نظام کی اس فیاضی سے داغ نہ صرف بقیہ زندگی کے لیے فکر معاش سے آزاد ہو گئے بلکہ ان کے بہت سے ہم عصر ان کو رشک کی نگاہوں سے دیکھنے لگے ۔ ان کی بے نظیر کامیابی اور خوش قسمتی نے ان کے بہت سے مخالف اور بد خواہ پیدا کردیے جو ان کے اشعار پر نکتہ چینی اور ان کی مقبولیت کا حسد کرنے لگے ۔ لیکن وہ ان کا کچھ بگاڑ نہ سکے ۔ ان کی شہرت ایسے حملوں سے بالا تر ہو گئی تھی ، اس لیے ان کو زوال نہیں ہو سکتا تھا ۔ دربار نظام میں بھی ان کی پوزیشن کا دار و مدار بیرونی رسوخ پر نہیں تھا جو ان میں اس قسم کے رکیک حملوں سے فرق آ جاتا ۔

حیدر آباد میں امیرانہ زندگی بسر کرتے ہوئے داغ نے اپنی قدیم سادگی اور خوش خلقی کو قائم رکھا ۔ ان کی زندگی کے آخری اٹھارہ سال حیدر آباد میں بسر ہوئے ۔ اس عرصے میں انہوں نے جو کام کیا اس کو تین عنوانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔ یہ کام ایک ایسے شخص کے لیے کافی سخت تھا جس نے اس کو عمر کے اس حصے میں انجام دیا جب کہ عام لوگ زندگی کی سرگرمیوں سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں ۔

سب سے پہلا اور سب سے اہم کام حضور نظام کی غزلوں میں اصلاح کرنا تھا - اس کو داغ کار سرکاری کہا کرتے تھے - حضور نظام کی غزلیں سر بمہر لفافوں میں پہنچتی تھیں - داغ سے تقاضا کیا جاتا تھا کہ آپ انھیں جس قدر جلد ممکن ہو اصلاح کرکے واپس بھیج دیں - جو اصحاب یہ جانتے ہیں کہ دوسروں کی نظموں پر اصلاح دینا اور اس کے ساتھ ہی یہ خیال بھی رکھنا کہ لکھنے والے کا انداز کلام قائم رہے ، کس قدر مشکل ہے - وہ اس کام کی دشواری کا احساس اچھی طرح کر سکتے ہیں - پھر بھی یہ خیال کر لیجیے کہ یہ غزلیں حضور نظام کی ہوتی تھیں جو خود اعلیٰ درجے کا مذاق ادب رکھتے تھے - اس سے یہ ظاہر ہے کہ داغ کو یہ کام سرانجام دینے میں کافی دماغ سوزی کرنی پڑتی تھی - اس کام سے جو وقت بچتا تھا اس میں یا تو وہ اپنی غزلیں لکھتے تھے یا اپنے ان بے شمار شاگردوں کی غزلوں پر اصلاح دیتے جو ہندوستان بھر میں پھیلے ہوئے تھے - وہ اپنی غزلیں ڈاک میں بھیج دیتے اور داغ ان کو اصلاح کر کے واپس کر دیتے - یہ بہت بڑا کام تھا جس کو اس خوش خلق اور نیک سیرت شاعر نے کمال بے غرضی سے اپنے اوپر لے رکھا تھا - جوں جوں ان کی شہرت بڑھتی گئی اسی طرح ان کے شاگردوں کی تعداد بھی زیادہ ہوتی گئی - اس طرح سے شاگردوں کے کلام کی اصلاح کا کام بجائے خود ایک انسٹی ٹیوشن بن گیا - ان کے بعض شاگرد ایسے بھی تھے جنھوں نے ان کو کبھی نہیں دیکھا تھا - وہ بذریعہ خط و کتابت ان کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوئے تھے - اس وسیع خط و کتابت سے عہدہ برآ ہونے کے لیے داغ نے اپنے زیر نگرانی ایک قسم کا دفتر قائم کر رکھا تھا جس میں اعزازی کام کرنے والے بھی

تھے اور تنخواہ دار بھی ۔ داغ شاگردوں کے خطوط پڑھتے اور ان کا جواب لکھواتے تھے ۔ غزلوں میں جہاں ضرورت ہوتی تھی اصلاح کرتے تھے اور جو غزلیں اصلاح طلب نہیں ہوتی تھیں ان کو ضروری ریمارکوں اور تنقیدی اشاروں کے ساتھ بجنسہ واپس بھیج دیتے تھے۔ اور اگر دوسری مصروفیتوں یا ناسازیٔ طبع کے باعث خطوط کے جواب بھیجنے یا غزلوں پر اصلاح دینے میں دیر ہو جاتی تھی تو شاگرد یاددہانی کراتے تھے جو بعض اوقات تلخ شکایات پر مشتمل ہوتی تھی ۔ اگر داغ کی بجائے کوئی اور ہوتا تو صاف لکھ دیتا کہ میں اس قسم کی تلخی کا متحمل نہیں ہو سکتا ، اس لیے آپ مجھے اس کام سے معاف فرمائیں ۔ مگر داغ کی طبیعت اس قدر شیریں واقع ہوئی تھی کہ وہ اکثر اوقات جواب میں معذرتی چٹھیاں لکھ دیتے تھے حالانکہ انھیں اصلاح کا کچھ معاوضہ نہیں ملتا تھا ۔

ایک مرتبہ جب مجھے حیدر آباد جانے کا موقع ملا تو خوش قسمتی سے حضرت داغ سے ملنے کا شرف حاصل ہوا۔ میں نے دربار دکن کے اس شہرۂ آفاق شاعر سے انٹرویو کیا۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ میرا تعلق ، جیسا کہ اس وقت تھا ، اخبار نویسی سے ہے تو وہ مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ جو بے شمار لوگ ان کے ساتھ بغرض اصلاح خط و کتابت کرتے تھے ان کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا :

"ایک میں ہوں اور ایک ہندوستان بھر لپٹا ہوا ہے ۔"

اس ملاقات میں داغ نے بڑے اشتیاق کے ساتھ اقبال کے متعلق دریافت کیا جنھوں نے اپنے زمانۂ طالب علمی ہی میں داغ کے ساتھ خط و کتابت کا سلسلہ قائم کر لیا تھا اور جن پر داغ قدرتی طور پر فخر

کرتے تھے ۔ اس زمانے میں اقبال کی شہرت بحیثیت شاعر ترقی کر رہی تھی ، اگرچہ اس بلندی پر نہیں پہنچی تھی جس پر اب پہنچی ہوئی ہے ۔ داغ نے فرمایا کہ مجھے اقبال کی ابتدائی غزلوں میں بھی ہونہاری کے آثار نظر آتے ہیں ، لیکن انھوں نے مغربی تعلیم کے زیر اثر اپنے لیے جو راہ نکالی ہے وہ کلیتہً ان کی اپنی ہے اور پرانی نسل کے لیے ایک انکشاف کی حیثیت رکھتی ہے ۔ اسی زمانے میں داغ نے اپنے آقا (حضور نظام) کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا تھا ۔ اس قصیدے پر ایک صاحب نے پنجاب کے ایک اخبار میں اعتراضات پر مشتمل ایک سلسلۂ مضامین لکھا تھا اور ایک ایک شعر کو لے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ ساری نظم میں ایک شعر بھی ایسا نہیں ہے جو اصولِ فن ، قواعدِ زبان اور محاورے کے نقائص سے پاک ہو ۔ میں نے داغ سے پوچھا کہ کیا آپ نے اس نکتہ چینی کو ملاحظہ فرمایا ہے اور اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے ؟ داغ نے فرمایا : "اگر معترض نے میرے بعض اشعار میں نقص دکھائے ہوتے اور باقی اشعار کو درست تسلیم کر لیا ہوتا تو ایک بات تھی لیکن اسے یہ محسوس کرنے کی توفیق بھی نہیں ہوئی کہ ایک معمر انسان ، جس کی ساری زندگی اشعار لکھنے میں گذری ہے ، اس کے سب کے سب شعر غلط نہیں ہو سکتے ۔

سید علی احسن احسن مارہروی نے ، جو داغ کے ارشد تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں اور ان کے بڑے مداح ہیں ، ان کی ایک مختصر سوانح عمری موسوم بہ "جلوۂ داغ"[1] لکھی ہے ۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر

---

۱ ۔ جلوۂ داغ ۱۹۰۲ء میں حیدر آباد کے مطبع شمسی میں چھپی اور شائع ہوئی ۔ احسن مارہروی نے قیام حیدرآباد کے زمانے میں استاد داغ

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

جناب احسن زیادہ تفصیل کے ساتھ لکھنے کی کوشش کرتے ۔ تاہم انھوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے اس سے داغ کی زندگی کے آخری ایام کی سرگرمیوں کا حال بہت اچھی طرح معلوم ہو سکتا ہے ۔ احسن حیدر آباد میں ان کے پاس رہا کرتے تھے ۔ اس قرب سے ان کا مقصد ایک چھوٹی سی ڈکشنری موسومہ ''فصیح اللغات'' مرتب کرنا تھا جس میں اشعار داغ سے اردو الفاظ اور اردو محاورات کا محل استعمال بتانا مقصود تھا ۔ احسن صاحب نے اس ڈکشنری کا یہ نام اس لیے رکھا تھا کہ داغ کو فصیح الملک کا خطاب حضور نظام کی طرف سے ملا ہوا تھا اور وہ عام طور پر اسی خطاب سے مشہور تھے ۔ اس سے داغ پر مزید کام کا بوجھ بڑھ گیا ۔ داغ کی تصانیف پہلے ہی بہت تھیں لیکن جب ان میں سے کسی لفظ یا محاورے کا طریق استعمال ظاہر کرنے کے لیے کوئی شعر نہ ملتا تھا تو حضرت داغ ایک نیا شعر کہہ دیتے تھے تاکہ لغات کی تکمیل کا کام پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے ۔ میرا خیال ہے اس لغت کی ترتیب کے ذریعے استاد اور شاگرد دونوں نے اردو زبان کی قابل قدر خدمت انجام دی اور ہمارے لیے ایسا قیمتی مواد مہیا کر دیا ہے جس سے زمانۂ آیندہ کے فرہنگ نویسوں کو بڑی مدد ملے گی ۔

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

سے فرمائش کرکے انھی کی زبانی حالات سن کر قلم بند کرنے شروع کیے تھے ۔ جب احسن لکھ لیتے تو داغ کو سناتے ۔ وہ سن کر کانٹ چھانٹ کرواتے ۔ چنانچہ بڑی محنت شاقہ کے بعد یہ کتاب مرتب ہوئی جس کا نام خود داغ نے ''جلوۂ داغ'' رکھا اور اس کی تاریخ بھی کہی :

زندگی کے مری احسن نے سوانح لکھے
عمر کے باغ کا یہ آنکھ سے جلوہ دیکھو
داغ نے مصرع تاریخ کہا یہ برجستہ
''جلوۂ داغ'' کا یہ آنکھ سے جلوہ دیکھو

حضرت داغ کی اُن غزلوں کا مجموعہ، جو انھوں نے زمانۂ قیام حیدر آباد میں تصنیف کیں، "مہتاب داغ" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ نفیس کاغذ پر نہایت عمدہ چھپا ہوا ہے اور بیرونی حیثیت سے بھی اس میں دکن کی خصوصیات نمایاں ہیں۔ داغ کے تین مشہور ترین دیوانوں کی خوبیوں کے متعلق آراء میں اختلاف ہے۔ "گلزار داغ" جیسا کہ ہم پہلے بھی ظاہر کر چکے ہیں، شاعر کی جوانی کے جذبات سے لبریز ہے، جب کہ عشق اس کے لیے محض پرواز تخیّل کا دوسرا نام نہیں تھا بلکہ حقیقت کا درجہ رکھتا تھا۔ "آفتاب داغ" بھی قریب قریب اسی زمانے کی تصنیف ہے اور یہ ذہنی کیفیات کی روشن تصویروں سے منور ہے۔ "مہتاب داغ" میں نہ تو "گلزار" کی سی مسحور کن خوشبو ہے اور نہ "آفتاب" کی سی خیرہ کن روشنی، تاہم یہ اپنے کام کی پوری پوری خوبیاں اپنے اندر رکھتا ہے اور چاند کی سی ٹھنڈی روشنی اپنے ارد گرد برساتا ہے، اور اس طرح سے بڑھاپے کی مطمئن زندگی کی پرسکون فضا پیش کر دیتا ہے۔ لیکن اس آخری تصنیف میں آپ کو ایک مسلّم الثبوت استاد کی پختہ مشقی کے نادر نمونے نظر آئیں گے۔ اس میں ان خوبیوں کی بھی کمی نہیں ہے جو غزلیات داغ کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ داغ کی اس آخری تصنیف کے علاوہ، جس کی ترتیب خود ان کی نگرانی میں انجام پذیر ہوئی، دو اور مجموعے ان کی وفات کے بعد پبلک کے سامنے آئے ہیں۔ ان میں سے ایک "یادگار داغ" ہے جس کی فراہمی اُس عقیدت کی مرہون منت ہے جو جناب احسن کو مرحوم کی ذات سے تھی۔ دوسرا مجموعہ لالہ سری رام ایم۔ اے کی مساعی جمیلہ کا شرمندۂ احسان ہے۔ یہ مجموعہ لالہ سری رام نے مہتاب داغ کے ایک نہایت ہی نفیس ایڈیشن کے ساتھ ضم کر کے خود طبع کرایا تھا۔

ایک اور مجموعہ انوار محمدی پریس لکھنؤ نے شائع کیا تھا ۔ اس کا نام "دیوانِ داغ" ہے اور اس میں داغ کے جملہ دیوانوں کے منتخب اشعار دیے گئے ہیں ۔ میرے نزدیک ان مجموعوں کی اہمیت جو حضرت داغ کے بعد مرتب کیے گئے، زیادہ تر اس مقصد پر مبنی ہے کہ ایسے شہرۂ آفاق شاعر کی تمام غزلوں کو کتابی شکل میں جمع کر دیا جائے ۔ کیونکہ داغ کے سینکڑوں مداح ، جو سارے ملک میں موجود ہیں ، یہ چاہتے تھے کہ مرحوم کی تمام تصنیفات محفوظ ہو جائیں ورنہ ان سے داغ کی اس شہرت میں بہت کم اضافہ ہو سکتا ہے جو پہلے تین دیوانوں کی اشاعت سے قائم ہو چکی تھی ۔ "یادگار داغ" کا ذکر کرتے ہوئے یہ بیان کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسی نام کی ایک اور چھوٹی سی کتاب سے بالکل مختلف چیز ہے جو آگرہ سے محمد اکبر علی خاں صاحب افسوں شاہجہانپوری نے شائع کی تھی ۔ اس کتاب میں مصنف کے حالات زندگی اور منتخب اشعار درج کیے گئے ہیں ۔ داغ کے حالات زندگی پر مشتمل جو مختصر رسالے لکھے گئے ہیں ان میں سے ایک چھوٹا سا رسالہ جو سید محمد فاروق کی تصنیف ہے ، حالاتِ داغ اور تصانیفِ داغ کا ایک قابلِ مطالعہ مختصر مجموعہ ہے ۔[۱]

داغ کی تصنیفات پر یہ تبصرہ نامکمل رہے گا اگر ہم "فریادِ داغ" کا ذکر نہ کریں ۔ یہ ایک مسلسل نظم ہے اور مثنوی کی طرز پر لکھی گئی ہے ۔ اس نظم کا تعلق حضرت داغ کی زندگی کے ایک

---

۱ ۔ رضا علی وحشت کلکتوی نے، جو داغ کے شاگرد تھے ، ۱۹۰۵ء میں استاد کی وفات کے فوراً بعد ان کی ایک مختصر سوانح خود شائع کی تھی ۔

خاص واقعے سے ہے ۔ میں نے اس بات کو خاص طور پر نوٹ کیا ہے کہ داغ کے تینوں سوانح نگاروں نے ، جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے ، اس واقعے پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے ۔ اس پردہ پوشی کی وجہ یہ ہے کہ اس واقعے کا تعلق اس زمانے سے ہے جب حضرت داغ اپنے آپ کو کلکتہ کی ایک مغنیہ کی طرف مائل پانے تھے ۔ یہ مغنیہ نہ صرف گانے کے فن میں ماہر تھی بلکہ شعر بھی کہتی تھی اور حجاب تخلص کرتی تھی ۔ معلوم ہوتا ہے کہ کشش کے متعلق خواہ کچھ فتویٰ صادر کیا جائے لیکن اس میں کوئی عجب بات نہیں تھی اور نہ یہ غیر اغلب تھی ۔ حجاب بحیثیت ایک مغنیہ کے لازمی طور پر داغ کی غزلوں سے مانوس ہوگی کیونکہ یہ گانے کے لیے بہت موزوں تھیں ۔ یہ عین ممکن ہے کہ وہ شعر لکھنے میں طرز داغ کی تقلید کرتی ہوگی ۔ داغ جب کلکتہ گئے ہوں گے۱ اور کسی مجلس سرود میں حجاب سے دو چار ہوئے ہوں گے تو دونوں پر ایک دوسرے کی خصوصیات کا انکشاف ہوا ہوگا ۔ حالانکہ دونوں کا میدان عمل ایک دوسرے سے الگ الگ واقع ہوا تھا ۔ معلوم ہوتا ہے کہ دوران قیام کلکتہ میں حجاب کے ساتھ داغ کی آشنائی ترقی کر گئی اور ان کے دل پر اس کے دوامی اثرات منقوش ہوگئے ۔ ان اثرات کا اظہار انہوں نے "فریاد داغ" میں اس قدر آزادی کے ساتھ کیا ہے کہ اس بارے میں کسی کو کسی قسم کی غلط فہمی نہیں ہو سکتی اور نہ ہونی چاہیے ۔

۱۔ داغ کی پہلی ملاقات حجاب سے کلکتے میں نہیں ، رام کے بے نظیر میلے میں ۱۸۸۹ع میں ہوئی تھی ۔ کلکتے میں حجاب سے جو ملاقات ہوئی ، وہ دوسری تھی ۔ اصل نام منی بائی ، حجاب تخلص تھا ۔ کلکتے کی ڈیرہ‌دار طوائفوں میں سے تھی ۔ حسین ، خوش ذوق ، خوش ادا ، خوش جمال اور خوش مقال عورت تھی ۔

'حجاب' نے داغ پر واضح کر دیا تھا کہ میں آپ کی سانولی رنگت اور آپ کے ناملائم مردانہ خد و خال کی وجہ سے آپ کی مداح نہیں بلکہ بطور شاعر آپ کو اپنا ممدوح سمجھتی ہوں ۔ داغ نے بھی اس امر کو کمال صفائی کے ساتھ اپنی نظم میں ظاہر کیا ہے ۔ دوسری طرف داغ جوان نہیں تھے کہ 'حجاب' کے ذاتی حسن سے مسحور ہو جاتے ۔ وہ بھی اس کے جذبۂ قدر شناسی ہی کے مداح تھے اور سمجھتے تھے کہ اس میں ادبیات سے لطف اندوزی کی اہلیت اور اہل جوہر سے واقفیت بڑھانے کی خواہش موجود ہے ۔ یہ آشنائی ناپائدار ثابت ہوئی اور داغ کے مختصر قیام کلکتہ کے ساتھ ہی اس کا بھی خاتمہ ہوگیا ۔ اس کے بعد اس سے پیشتر جب داغ کی زندگی خاتمے کے قریب تھی اس کے متعلق کچھ دیکھنے سننے میں نہ آیا ۔ اس وقت داغ کی عمر ستر سال سے متجاوز ہو چکی تھی اور مجھے بتایا گیا ہے کہ اس زمانے میں 'حجاب' ایک زن پیر کی حیثیت میں اپنے ممدوح شاعر کو خراج تحسین ادا کرنے کے لیے حیدر آباد آئی ۔ اگر اس سانحہ کو ان واقعات کی روشنی میں دیکھا جائے تو مجھے اس میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی جس کی وجہ سے شاعر یا اس کے سوانح نگاروں کو محجوب ہونے کی ضرورت ہو ۔ میں نے اس سانحے کا ذکر کرنا اس لیے ضروری سمجھا ہے کہ داغ کے بعض اشعار کا پورا پورا لطف اس وقت تک نہیں اٹھایا جاسکتا جب تک اس سانحے کے کچھ حالات معلوم نہ ہو جائیں ۔ کہا جاتا ہے کہ داغ نے اس سانحے کے متعلق جو مثنوی لکھی اس کے لکھنے میں انہیں زیادہ عرصہ نہ لگا ۔ اس معاملے کے اولین اثرات کو اشعار کی شکل میں قلم بند کرنا ان کے لیے قدرتی طور پر اس وقت بہت آسان تھا جب

وہ تازہ دم کلکتے سے واپس آئے تھے ۔ اس نظم میں سادگی کی شان اس حد تک نمایاں ہے کہ اس سے زیادہ ممکن نہیں ۔ لیکن اس کے باوجود ہر شعر میں ، جو صرف چند الفاظ پر مشتمل ہے ، جذبات اور محسوسات کا سمندر موجزن نظر آتا ہے ۔ ساری نظم میں آورد کا نشان تک نہیں ۔ اس لحاظ سے یہ پاکیزگی اور سادہ پن کا بہترین نمونہ ہے ۔ حتیٰ کہ اس کا وہ حصہ بھی ، جو محض رسمی ہے اور اس لیے بالکل خشک ہونا چاہیے تھا ، جدت کی شان اپنے اندر رکھتا ہے ۔ مثال کے طور پر شعراء کا یہ عام قاعدہ ہے کہ وہ اپنی تصنیف کا آغاز اپنے ادبی سرپرست کی تعریف سے کرتے ہیں جسے وہ ممدوح کہتے ہیں ۔ داغ نے بھی چند اشعار نواب رام پور اور ان کے دارالریاست کی تعریف میں لکھے ، جہاں انھوں نے اپنی زندگی کے کئی سال کمال راحت و آرام کے ساتھ بسر کیے تھے ۔ لیکن جہاں دوسرے مشرق شعراء عام طور پر مبالغہ اور غلو سے کام لیتے ہیں وہاں داغ نے سادگی ، صفائی اور زندہ دلی کا نمونہ پیش کیا ہے ۔ ملاحظہ ہو :

ہے عجب شہر مصطفیٰ آباد
اس کو رکھنا مرے خدا آباد

سب اسے رام پور کہتے ہیں
ہم تو آرام پور کہتے ہیں
خیر نواب کی مناتے ہیں
جس کا کھاتے ہیں اس کا گاتے ہیں

جن اشعار میں داغ نے عشق کا ذکر کیا ہے وہ اس قدر سادہ ، پرجوش اور موسیقانہ ہیں کہ ان کے کسی ہم عصر کی تصانیف میں ان کی مثال نہیں مل سکتی ۔

اس مختصر اور محدود مضمون میں اتنی گنجائش نہیں کہ میں ''فریاد داغ'' کی شاعرانہ خوبیوں پر کوئی طویل تبصرہ یا اس پر تفصیلی تنقید کر سکوں ۔ جن اصحاب نے اس نظم کو اب تک نہیں پڑھا ہیں ان سے سفارش کروں گا کہ وہ اس کو پڑھیں اور اس کے متعلق اپنے طور پر رائے قائم کریں ۔ اس کے متعلق میری اپنی رائے، جیسا کہ میں پہلے ظاہر کر چکا ہوں ، بہت بلند ہے ۔ میرا خیال ہے کہ اگر داغ اپنے پیچھے تین ضخیم دیوان نہ چھوڑ گئے ہوتے تو بھی یہ مختصر سی نظم انھیں ایک اردو شاعر کی حیثیت سے شہرتِ دوام کا حق دار بنا دیتی ۔

محاورات اردو کے مالک کی حیثیت سے ، نیز ایک ایسے شخص کی حیثیت سے ، جو سادہ ترین الفاظ کو ایک لڑی میں پرو کر ان میں انتہا درجے کا جوش اور اثر پیدا کر سکتا ہے ، موجودہ زمانے میں کسی ایسی ہستی کا ملنا مشکل ہے جو داغ سے بڑھی ہوئی ہو ۔ داغ کے اشعار جہاں ذوق کے انداز کلام کی بہترین خصوصیات کے حامل ہیں وہاں شوخی اور جدت کے اعتبار سے بدرجہا زیادہ بلند ہیں ۔

شعرائے قدیم میں سے بالاتفاق میر ، اثر ریز اور رقت انگیز ہیں اور سودا بھڑکدار اور مرعوب کن اشعار لکھنے میں سب سے بڑے استاد تسلیم کیے جاتے ہیں ۔ داغ کے اکثر اشعار میں ان دونوں قدیم استادوں کی خوبیاں یک جا نظر آتی ہیں ۔ محاورہ بندی کے اشتیاق میں ان کا انداز سخن بعض اوقات سوقیانہ ہو جاتا ہے ۔ یہ بات داغ جیسے ذیشان شاعر کی شان کے شایاں نہیں اور اکثر اوقات ایسے مخالفانہ تنقید کا نشانہ بھی بنایا گیا ہے لیکن داغ میں یہ عیب اس قدر کم ہے کہ اس پر بہت زیادہ سختی و سنجیدگی کے ساتھ لے دے کی ضرورت نہیں ۔

اسی طرح ان کے دیوانوں میں بعض اشعار ایسے ہیں جن کو معلمانِ اخلاق پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتے ۔ لیکن ایسے اشعار کی تعداد بھی بہت زیادہ نہیں اور اس امر واقعہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ داغ نے نہ تو کبھی اخلاق شاعر ہونے کا دعویٰ کیا اور نہ کبھی ایک معلم اخلاق کی حیثیت اختیار کی ، اس عیب کو نظرانداز کیا جا سکتا ہے ۔ پھر ان اشعار کو خارج کر دینے کے بعد بھی جن کو کسی حد تک قابل اعتراض سمجھا جا سکتا ہے ، ان دیوانوں میں کافی سے زیادہ مواد اس قسم کا باقی رہ جاتا ہے جو ادبی نقطۂ خیال سے بہت بلند اور محفوظ رکھنے کے قابل ہے ۔ وہ اشعار جن میں انھوں نے عدیم المثال کامیابی کے ساتھ یہ دکھایا ہے کہ انسانی دماغ کس طرح کام کرتا ہے یا جن میں نہایت مؤثر الفاظ میں انسانی ادراک و تجزیہ کے نتائج بیان کیے ہیں ، ان کی تصانیف میں کثرت سے پائے جاتے ہیں اور اردو نظم کے شائقین ان سے بے حد حظ اٹھا سکتے ہیں ۔

داغ کے پہلے تین دیوان اس قابل ہیں کہ ناظرین ان سے فائدہ اٹھائیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ داغ اور امیر اپنے زمانے کے بہترین غزل گو شاعر تھے ۔ دنیائے تغزل میں داغ کا درجہ ان کے تمام ہم عصروں نے بلند تسلیم کیا ہے ۔ چنانچہ حالی نے ایک غزل میں قدیم دہلی کی عظمت کا ماتم کرتے ہوئے لکھا ہے :

داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانہ ہرگز

امیر نے بھی اپنی ایک غزل کے مقطع میں ، جو داغ کی زمین میں لکھی گئی داغ کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین ادا

کیا ہے :

امیر اچھی غزل ہے داغ کی جس کا یہ مصرع ہے
بھویں تنتی ہیں ، خنجر ہاتھ میں ہے ، تن کے بیٹھے ہیں

داغ نے زندگی بھر جس انہاک کے ساتھ لٹریچر کی خدمت کی موجودہ زمانے میں اس کی مثال ملنی دشوار ہے ۔ وہ ایک مشرق شاعر کی حیثیت سے زندہ رہے اور اسی حیثیت میں مرے ۔ ۲۵ مئی ۱۸۳۱ء کو پیدا ہوئے اور ۱۴ فروری ۱۹۰۵ء[1] کو حیدر آباد میں وفات پائی ۔ انہوں نے عمر بھی بڑی پائی اور اعزاز و اکرام بھی بہت حاصل کیے ۔ ان کی وفات پر ملک بھر کے ادبی حلقوں میں عالمگیر ماتم کیا گیا اور بے شمار مرثیے لکھے گئے ۔ ان میں سے مؤثر ترین مرثیہ پنجاب کے شہرۂ آفاق شاعر ڈاکٹر اقبال کا تھا ۔ اس مرثیے میں ڈاکٹر اقبال نے لکھا ہے کہ انسانی دماغ کے عمل کا دقیق تجزیہ کرنے کی طاقت داغ کی شاعری کی نمایاں ترین خصوصیت ہے اور ذیل کے خوبصورت الفاظ میں بتایا ہے کہ دہلی کا یہ آخری باکمال شاعر جذبات عشق کی کیسی کیسی پاکیزہ تصویریں کھینچتا تھا :

اٹھیں گے آذر ہزاروں شعر کے بت خانے سے
مے پلائیں گے نئے ساقی نئے پیمانے سے
لکھی جائیں گی کتاب دل کی تفسیریں بہت
ہوں گی اے خوابِ جوانی تیری تعبیریں بہت

---

۱ ۔ داغ کی وفات ۱۴ فروری ۱۹۰۵ء کو نہیں ، ۱۶ فروری ۱۹۰۵ء کو ہوئی ۔ اور سن ہجری تھا ۱۳۲۲ھ ، ماہ ذی الحج ۔ وہ ہمیشہ آرزو کرتے تھے کہ خدا حج کے روز موت دے ، چنانچہ یہ آرزو پوری ہوئی ۔ عمر بحساب قمری ۷۶ سال اور بحساب شمسی ۷۴ سال تھی ۔ ولادت بھی ذی الحج میں ہوئی اور وفات بھی ۔

ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون
اٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون

اس مختصر سے مضمون میں داغ کے مختلف دیوانوں سے اس قدر منتخب اشعار پیش کرنا آسان نہیں جن سے اس خوبی اور تاثر کا کافی اندازہ ہو سکے جو غزلیات داغ کی نمایاں خصوصیت ہے ۔ البتہ چند غزلوں سے کچھ اشعار بطور نمونہ پیش کیے جا سکتے ہیں ۔

آفتاب داغ کے چند انتخابی اشعار صوفیانہ شاعری کے درخشاں نمونے ہیں اور اردو کے کسی پرانے یا نئے شاعر کے ایسے ہی اشعار سے کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا جا سکتے ہیں ۔ داغ کہتے ہیں :

اللہ رے مرتبہ مرے عجز و نیاز کا
گویا جواب ہے یہ ترے کبر و ناز کا
گو مُہر لب ہے حکم ترا، اس کا کیا علاج
دل بولتا ہے خود بخود آگاہ راز کا
عالم تمام چشم حقیقت نگر بنا
منہ دیکھتا ہے آئنہ آئینہ ساز کا
جل جل کے تیرے عشق میں گھل جائیں استخواں
مانند شمع لطف ہے سوز و گداز کا
دنیا بھی اک بہشت ہے اللہ رے کرم
کن نعمتوں کو حکم دیا ہے جواز کا
کونین جس کے ناز سے چکرا رہے ہیں داغ
میں ہوں نیازمند اسی بے نیاز کا

اگرچہ اخلاق شاعری داغ کے افتخار کا حقیقی سرمایہ نہیں اور نہ انہوں نے اخلاق آموزی پر زیادہ توجہ دی ہے ، تاہم ذیل کے اشعار سے ، جو مرحوم کے دیوان سے منتخب کیے گئے ہیں ، ظاہر ہوگا کہ وہ اس میدان میں اردو کے کسی شاعر کا مقابلہ نہایت آسانی سے کر سکتے ہیں :

ڈوبتے ہیں عرق شرم میں غیرت والے
ڈوب مرنے ہی نہ جب آئے تو دریا کیسا

خوبیاں لاکھ کسی میں ہوں تو پروا نہ کریں
لوگ کرتے ہیں بُری بات کا چرچا کیسا

جو ہو سکتا ہے اس سے وہ کسی سے ہو نہیں سکتا
مگر دیکھو تو پھر کچھ آدمی سے ہو نہیں سکتا

نہ رونا ہے طریقے کا ، نہ ہنسنا ہے سلیقے کا
پریشانی میں کوئی کام جی سے ہو نہیں سکتا

خدا جب دوست ہے اے داغ کیا دشمن سے اندیشہ
ہمارا کچھ کسی کی دشمنی سے ہو نہیں سکتا

ان کے بہت سے معمولی اشعار بھی اس قدر پُر معنی ہیں کہ ان کو تقریروں اور تحریروں میں ایسے موقعوں پر بھی چسپاں کیا جا سکتا ہے اور کیا جاتا ہے جن کے لیے وہ ابتداءً مقصود نہیں تھے - مثال کے طور پر ذیل کے ہر دو شعر موجودہ زمانے کی پولیٹیکل حالت کے بعض پہلوؤں پر نہایت مؤثر پیرائے میں چسپاں ہونے کے قابل ہیں :

وہ کچھ سنائیں کہ صیاد دردمند ہوا
قفس میں بند ہونے پر بھی میں نہ بند ہوا
مجھے تو شیوۂ آزادگی کمند ہوا
کہ دام قطع تعلق میں پائے بند ہوا

لیکن داغ کا مخصوص میدان عشق ہے ۔ اگرچہ اردو اور فارسی شاعری میں یہ میدان بہت پامال ہو چکا ہے ، تاہم 'داغ' نے اپنے جذبات کا اظہار ایسے خوش‌نما الفاظ میں کیا ہے اور ان الفاظ کو ایسی ندرت اور جدت کے ساتھ ترتیب دیا ہے کہ جو لوگ غزل کا مذاق رکھتے ہیں وہ داغ کے اشعار سے کبھی نہیں اکتا سکتے ۔ ذیل کے اشعار سے زیادہ خوبصورت اشعار اور کیا ہو سکتے ہیں :

مزا ہر ایک کو تازہ ملا ہے عشق جاناں کا
نگہ کو دید کا ، لب کو فغاں کا ، دل کو ارماں کا

کیا ہے ایک دست آرزو نے وار دو جانب
زلیخا کے جگر تک چاک ہے یوسف کے داماں کا

تری الفت کی چنگاری نے ظالم اک جہاں پھونکا
ادھر چمکی ، ادھر سلگی ، یہاں پھونکا وہاں پھونکا

کبھی بیٹھے ، کبھی اٹھے ، کبھی لوٹے کبھی تڑپے
تماشا دید کے قابل ہے تیرے بے قراروں کا

ہم ترے کوچے سے اے یار چلے جاتے ہیں
لے چلے جاتے ہیں ناچار چلے جاتے ہیں
گرچہ سو سو ہیں تغافل کہ نہ جانے کوئی
ان نگاہوں کے مگر وار چلے جاتے ہیں

ہم نہیں جانتے کچھ دیر و حرم کا رستہ
ہم مئے عشق میں سرشار چلے جاتے ہیں

ملتے ہی بیباک تھی وہ آنکھ شرمائی ہوئی
بھر گئی بجھتا کے پلکوں تک حیا آئی ہوئی

میرا یہ دعویٰ کوئی ان کے سوا دل میں نہیں
ان کا یہ الزام اچھی قید تنہائی ہوئی

داغ کی غزلوں سے ان اقتباسات کو ختم کرنے سے پیشتر میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کے ایک مخمس سے چند بند پیش کروں۔ اس مخمس سے انھوں نے نواب یوسف علی خاں والیٔ رام پور کی ایک غزل کو مرصّع کیا تھا۔ اس غزل میں، نواب صاحب نے ان خیالات کی تضحیک کی تھی جو غزل گو شعرا میں معشوق کے متعلق رائج ہیں اور اس طرح اپنی غیر معمولی جدت طرازی کا ثبوت دیا ہے۔ اس غزل میں معشوق عاشق کو مخاطب کر کے بتاتا ہے کہ اردو شاعری میں عشاق اپنے معشوقوں کی جو تعریفیں کرتے ہیں وہ بعض حالتوں میں کیسی لغو اور لچر ہوتی ہیں :

کہتے تھے وہ بشر کو جو دل دے بشر غلط
دیوانہ ہو کسی کا کوئی سربسر غلط
شامت جو آئی ان کا بیاں جان کر غلط
میں نے کہا کہ دعویٔ اُلفت مگر غلط
کہنے لگے کہ ہاں غلط اور کس قدر غلط

ہوتے ہیں ایک بات کی تہہ میں ہزار جھوٹ
تصدیق کیجیے تو بس انجام کار جھوٹ
اور پھر ڈرائیں بول کے بے اعتبار جھوٹ
تأثیر آہ و زاری شب‌ہائے تار جھوٹ
آوازۂ قبول دعائے سحر غلط

یا لب پہ کوئی قطرۂ مے جم کے رہ گیا
یا کچھ عیاں ہوا اثر گرمی غذا
یا جھوٹ بولنے کی خدا نے یہ دی سزا
سوز جگر سے ہوانٹ پہ تبخالہ افترا
شور فغاں سے جنبش دیوار و در غلط

اس مضمون کو ختم کرنے کے لیے ذیل کے چند اشعار حوالۂ قلم کیے جاتے ہیں کیونکہ ان میں اقبال نے، جو داغ کو بجا طور پر دہلی کے آخری شاعر کا خطاب دیتے ہیں، نہایت خوبصورتی کے ساتھ یہ دکھایا ہے کہ اس عالی مرتبہ شاعر میں انسانی جذبات کا دقیق تجزیہ کرنے کی غیر معمولی قدرت تھی:

چل بسا داغ آہ میت اس کی زیب دوش ہے
آخری شاعر جہاں آباد کا خاموش ہے

اور دکھلائیں گے مضموں کی ہمیں باریکیاں
اپنی فکر نکتہ آرا کی فلک پیمائیاں
تلخیٔ دوراں کے نقشے کھینچ کر رلوائیں گے
یا تخیل کی نئی دنیا ہمیں دکھلائیں گے
اس چمن میں ہوں گے پیدا بلبل شیراز بھی
سیکڑوں ساحر بھی ہوں گے صاحب اعجاز بھی

اٹھیں گے آذر ہزاروں شعر کے بت خانے سے
مے پلائیں گے نئے ساقی نئے پیمانے سے
لکھی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت
ہوں گی اے خوابِ جوانی تیری تعبیریں بہت
ہوبہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون
اٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون

جیسا کہ اقبالؔ نے ظاہر کیا ہے، ایسے شاعر بہت ہوں گے جو اپنے ناظرین کو تخیل کی باریکی یا مضمون کی جدت سے مسحور کر دیں گے، لیکن ایسا شاعر کوئی نہیں ہوگا جو جذباتِ عشق کی تصویریں ایسی صحت و صفائی کے ساتھ کھینچ سکے جو داغؔ کا سرمایۂ افتخار تھی۔ اس لحاظ سے داغ یقیناً دہلی کا آخری بڑا شاعر تھا۔

* * *

میر انیس[1]

مغربی نقادوں میں عموماً رسم ہے کہ کسی شخص کے کلام کا موازنہ کرنے سے پہلے ان کی سوانح عمری پر ایک سرسری نظر ڈال لیتے ہیں ۔ لیکن ہمارے ہاں کے تذکرہ نویس بالعموم شعرا کے حالات زندگی سے بالکل قطع نظر کرتے رہے ہیں ، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی شاعر کا تذکرہ پڑھنے کے بعد اس کی شخصیت کی نسبت سوائے نام اور ولدیت اور چند متفرق واقعات کے اور کچھ معلوم نہیں ہوتا ۔ ایسا کرنے سے اگر مختصر نویسی منظور ہو تو خالی از فائدہ بھی نہیں کیونکہ دنیا کو مشاہیر کے نام کی نسبت ان کے کام سے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے ، اور اسی اصول کو مدنظر رکھ کر اس مختصر نوٹ میں ہم زیادہ تر میر انیس کے کلام سے واسطہ رکھیں گے ۔ ان کی ذات و خاندان کی بابت صرف اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ ان کا اسم گرامی میر ببر علی تھا اور میر حسن ، جن کی مثنوی ''سحرالبیان'' اپنی سلامت زبان کی وجہ سے آج تک مقبول ہر خاص و عام ہے ، ان کے جد امجد تھے ۔ اس طرح سے میر انیس کو شاعری گویا ورثے میں ملی تھی ۔ اور ان کا خاندان شاید اردو ادب کی تاریخ میں اس حیثیت سے یکتا ہے کہ اس کے حصے میں پانچ پشت تک شاعری کی دولت رہی ہے ۔ جیسا کہ ناظرین پر واضح ہو گیا ہوگا ، میر انیس کا خاندان شاہجہان آباد کی خاک پاک سے نسبت

۱۔ منقول از ماہنامہ ''مخزن'' بابت اگست ۱۹۰۶ع (جلد ۱۱ نمبر ۵) ، صفحہ ۵۰-۵۳ — میر ببر علی انیس (۱۸۰۲ع — ۱۸۷۴ع) شاہ اقلیم سخنوری ، رشک ہومر و فردوسی ، معجز نگار شاعر و مشہور مرثیہ گو ۔

رکھتا تھا لیکن نا مساعدت زمانہ نے میر حسن کو مجبور کیا کہ لکھنؤ میں بود و باش اختیار کریں۔ میر انیس کی پیدائش و پرورش اسی مردم خیز شہر میں ہوئی[۱] اور یہ کہنا بےجا نہیں کہ لکھنؤ نے میر انیس کو مرثیہ گو بنا دیا۔

مرثیہ گوئی کا رواج تو ایرانیوں کی تقلید کی وجہ سے اردو شاعری کی ابتدائی حالت ہی میں شروع ہوگیا تھا۔ چنانچہ سودا کے کلیات میں بھی چند مراثی پائے جاتے ہیں جو چنداں اعلیٰ پائے کے نہیں اور اس شاعر کے کلام کا شاید سب سے کم قابل قدر حصہ ہیں۔ انیس و دبیر کے زمانے تک مرثیہ گوئی شاعری کی نہایت ضعیف صنف تصور کی جاتی تھی اور مرثیہ گو کو بالعموم دیگر شعرا طنزاً ''بگڑے شاعر'' کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ انیس و دبیر کی خداداد ذہانت نے مرثیہ گوئی کو اس معراج کمال پر پہنچا دیا جس پر کہ آج ہم اسے پاتے ہیں، اور مرثیے کی زمین کو اس قدر رفعت دی کہ ہمسر آسمان بنا دیا۔ ہمارا خیال ہے کہ خود مرثیے میں یہ صلاحیت موجود تھی کہ کسی صاحب کمال کے ہاتھوں میں فروغ پا جائے۔ شاعری کے لیے اثر کا ہونا ضرور ہے اور ہماری شاعری کے جملہ اصناف میں کوئی صنف اس قدر مؤثر نہیں جیسا کہ مرثیہ۔ کیونکہ اثر کے لیے صداقت لازمی ہے اور مرثیہ ہی ایک ایسی شے ہے کہ جس میں شاعر جو کچھ قلم سے لکھتا ہے اسے دل سے اپنا دین و ایمان سمجھتا ہے۔ پھر ممکن نہیں کہ اثر پیدا نہ ہو۔ علاوہ بریں

۱۔ یہاں سر شیخ عبدالقادر کو سہو ہوا ہے۔ میر انیس کی پیدائش لکھنؤ کی نہیں، فیض آباد کی ہے۔ وہ آٹھ نو سال تک فیض آباد ہی میں رہے۔ پھر ان کے والد میر خلیق انہیں ساتھ لے کر لکھنؤ آنے جانے لگے۔

مرثیے کو اردو شاعری کی دیگر شاخوں پر ایک اور بھی فوقیت حاصل ہے ۔ وہ یہ کہ اس کا مقصد نہایت اعلی و ارفع ہے ۔ اس کا منشا ان جذبات کو ابھارنا ہے جو انسان کی ارفع یعنی روحانی فضیلت سے تعلق رکھتے ہیں ۔ برخلاف اس کے غزل گوئی جس پر اکثر شعرا کی توجہ مبذول رہی ہے اور جس پر اوائل عمر میں خود انیس نے کافی قدرت حاصل کر لی تھی ، بالخصوص طبع انسانی کی نسبتاً ادنٰی خواہشات و جذبات کو اکساتی ہے ۔ مندرجہ بالا سطور سے واضح ہو گیا ہوگا کہ انیس کا پایہ شاعری کس قدر بلند ہونا چاہیے ۔ مزید برآں ان کی زبان کی صفائی ، خیالات کی نفاست و نزاکت ان کو اور بھی کامیاب بناتی ہے ۔ لکھنؤ کی صحبتوں نے انیس کو بلاغت سکھائی لیکن ناسخ کی طرح بلاغت کے ساتھ فصاحت کو ہاتھ سے نہیں دیا جو دہلی کے ساتھ دور کی نسبت ہونے کی وجہ سے انہیں حاصل تھی ۔ لکھنؤ میں رہ کر عمر بھر دہلی کا روزمرہ استعمال کرتے رہے اور جب کبھی کسی غیر مانوس ترکیب اور محاورے کو استعمال کرتے تھے تو فوراً بلا تامل کہہ دیتے تھے کہ اہل لکھنؤ اسے پسند کریں یا نہ کریں مگر احقر کے شہر اور گھرانے میں اسی طرح بولتے ہیں ۔ امر واقعی یہ ہے کہ انھوں نے اپنی غیر معمولی ذہانت کی وجہ سے یہ بات محسوس کر لی تھی کہ لکھنؤ کی زبان جو تکلفات و تصنع سے پر ہے ، کبھی دہلی کی سادہ و شیریں زبان کے برابر موثر نہیں ہو سکتی ۔

انیس کی شاعری میں علاوہ صداقت و اثر کے شاعری کے دیگر لوازمات بہ تمام و کمال پائے جاتے ہیں ۔ تشبیہ و استعارہ کے وہ بادشاہ ہیں اور کبھی تشبیہ کے معاملے میں وہ اپنے طبقے کے دیگر شعرا کی تقلید

میں صحت مذاق کا خون نہیں کرتے بلکہ غیر معولی نازک خیالی و حسن بیان کا ثبوت دیتے ہیں ۔ کسی خوبصورت نوجوان کے رخ پر سبزہ آغاز ہوتے دیکھ کر اس سے بہتر کیا تشبیہ سوجھ سکتی ہے کہ :

دیکھو نئی بہار کہ سبزہ ہے پھول پر

یا اس سے بہتر کیا مطالعہ فطرت کا ثبوت ہوگا کہ خزاں کے موسم میں درختوں کے پتوں کی کیفیت ان الفاظ میں بیان کی جائے :

پتے برنگ چہرۂ مدقوق زرد تھے

غرض کہ اس قسم کی نازک خیالی کی مثالیں انیس کے کلام میں سے سینکڑوں کیا بلکہ ہزاروں دی جا سکتی ہیں ۔ نازک خیالی ان کا خاص جوہر تھا ، ورنہ انصاف کی بات یہ ہے کہ زور و شکوہ الفاظ میں ان کے ہم عصر مرزا دبیر بازی لے گئے ہیں ۔ مگر کہاں بلبل کا نغمہ اور کہاں شیر کی گونج ۔ دونوں چیزیں اپنی اپنی جگہ لاجواب ہیں لیکن شاعری کے لیے تو کچھ اول الذکر ہی زیادہ موزوں معلوم ہوتی ہے ۔ انیس کی غزل گوئی کی طرف ہم پیشتر ازیں اشارہ کر چکے ہیں ۔ صرف اس قدر اور کہہ دینا کافی ہے کہ انیس کی جو غزلیات ہم تک پہنچی ہیں ، وہ نہایت قابل قدر ہیں ۔ لیکن ہم انیس کو بہت اعالی پائے کا غزل گو ماننے پر تیار نہیں ۔ اس وقت لکھنؤ میں غزل گوئی کا مرض عام تھا اور ہر ایک موزوں طبیعت و رنگین مزاج نوجوان اس میدان میں طبع آزمائی کیا کرتا تھا ۔ مشاعروں کی قدردانی و داد اس شوق کو بڑھا دیتی تھی اور بڑھی ہوئی مشق کا یہ نتیجہ ہوتا تھا کہ ہر ایک شاعر و متشاعر کے کلام میں کوئی نہ کوئی خوبی ضرور پیدا ہوجاتی تھی ۔ انیس کی غزلیات بھی خوبی سے خالی نہیں تھیں ۔

بحیثیت غزل گو کے وہ دوسرے اساتذہ کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ نہیں کر سکتے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر وہ غزل گوئی کی طرف توجہ کرتے تو دیگر شعرا سے اس میدان میں بھی گوئے سبقت لے جاتے۔ لیکن بد قسمتی سے اب اس خیال کی تصدیق ہونی محال ہے۔ تاہم اتنا کہنے سے باز نہیں رہ سکتے کہ ہر ایک شخص ایک خاص کام کے لیے وضع کیا جاتا ہے۔ انیس کا کام فطرۃً مرثیے کو فروغ دینا تھا اور اس کام کو انھوں نے نہایت خوش اسلوبی سے پورا کیا۔

* * *

مولانا شبلی نعمانی[1]

کسی وسیع تر اور زیادہ ترقی یافتہ زبان کا مورخ زبان کے خالصۃً ادبی کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے غالباً مولانا شبلی نعمانی کی تصانیف کو اعلیٰ پائے کے ادب میں شمار نہ کرتا، گو انہیں سوانح اور تاریخ کے صیغے میں ایک بلند مقام کا مستحق ضرور سمجھتا۔ اردو زبان ابھی اپنی ابتدائی منزلیں طے کر رہی ہے۔ اس لیے ان لوگوں کی کوششوں کی قدر و قیمت کا اندازہ لگاتے ہوئے، جنھوں نے ہمارے ادب کی بنیادوں کو استوار کیا ہے، ہم تنقید کے وہی معیار نہیں استعمال کر سکتے جن کی روشنی میں ہم کسی قدیم اور متموّل زبان کے ادب کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس نقطۂ نگاہ سے شبلی کو اردو ادب کے معماروں میں ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ وہ اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے۔ پیدائش اور وطنیت کے اعتبار سے ان کا تعلق نہ دلی سے تھا اور نہ لکھنؤ سے جو اس وقت اردو زبان کے دو بڑے مرکز تھے۔ ادبی حیثیت سے بھی انہیں دلی یا لکھنؤ کی روایات سے وابستہ نہیں کیا جا سکتا، گو اپنی زندگی میں انھی

---

۱ - شمس العلما مولانا محمد شبلی نعمانی (۱۸۵۷ء-۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء): مشہور شاعر، نقاد، مورخ اور سوانح نگار۔ آپ کی تصانیف متعدد ہیں جن میں سیرت النبیؐ، علم الکلام، الکلام، الغزالی، سوانح مولانا روم، موازنۂ انیس و دبیر، شعرالعجم، سفرنامۂ مصر و روم و شام، المامون، الفاروق، سیرۃ النعمان، مکاتیب شبلی، مقالات شبلی، مثنوی صبح امید، مجموعۂ کلام اردو، دیوان شبلی قابلِ ذکر ہیں۔ مولانا شبلی کے بارے میں شیخ عبدالقادر کا یہ مضمون اوراقِ نو (عبدالقادر نمبر، صفحات ۷۰ تا ۷۴) سے لیا گیا ہے۔

دبستان لکھنؤ سے بھی واسطہ رہا اور دلی سکول سے بھی ، اور غالباً انھوں نے ان دونوں مقامات کے بہترین عناصر اخذ کیے ۔ انھوں نے مولوی فیض الحسن سے تعلیم پائی جو اپنے زمانے کے ایک نامی اور صاحب کمال استاد تھے ۔ بہت سی سربرآوردہ ہستیوں کو ان کی شاگردی کا فخر حاصل تھا ۔ مولوی فیض الحسن سہارن پور کے رہنے والے تھے اور عرصے تک پنجاب یونیورسٹی سے متعلق رہ چکے تھے ۔ فیض الحسن صاحب چونکہ دلی کی ادبی روایات کے پیرو تھے اس لیے مولانا شبلی نے بھی ان اثرات کو قبول کرنا شروع کیا ۔ اس کے بعد دلی سکول سے آن کا براہ راست تعلق آس وقت قائم ہوا جب سید احمد خاں نے انھیں علی گڑھ میں پروفیسر کے عہدے پر مامور کیا ۔ سر سید کی باوقار شخصیت نے جلد ہی انھیں اپنا گرویدہ بنا لیا ۔ اس کے علاوہ انھیں دلی سکول کے دوسرے مصنفوں مثلاً حالی اور مولوی نذیر احمد سے بھی قریبی تعلق رہا ۔ میری نثر میں انھی تاثرات کی وجہ سے ان کی انشا میں لکھنؤی اسلوب کی نسبت دہلوی طرز تحریر زیادہ نمایاں ہے ۔ آخری عمر میں جب انھیں لکھنؤ کی ادبی شخصیتوں سے قریبی طور پر ملنے جلنے کا موقع ملا تو ان کی تحریر میں بھی لکھنؤی نفاست اور بانکپن کی جھلک پیدا ہوگئی تھی ۔

ہمیں چونکہ ان کی ادبی سرگرمیوں کا ذکر کرنا ہے اس لیے ان دلچسپ تفصیلات کو بیان کرنے کی گنجائش نہیں ۔ وہ ایک غیر معمولی قابلیت رکھنے والے ، مستقل مزاج اور باہمت انسان تھے اور انھوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنی استعداد کے جوہر دکھائے ۔ انھیں ایک ایسے بلند مرتبہ معلّم کی حیثیت سے زیادہ شہرت حاصل تھی جس نے اپنے شاگردوں کو قابل قدر خیالات اور

اعلیٰ مقاصد سے روشناس کیا ۔ آج بھی تعلیم یافتہ مسلمانوں میں بہت سی ایسی ممتاز شخصیتیں ہیں جنھیں مولانا شبلی کی تربیت نے ایک بلند مقام پر پہنچایا ۔ شروع میں وہ سر سید کی تعلیمی تحریک کے حامی اور مددگار تھے ۔ بہت سی ایسی انجمنیں ، جن کی بنیاد سر سید نے ڈالی تھی ، مولانا شبلی کی کوششوں سے پھلتی پھولتی رہیں ۔ سرسید کی موت کے بعد وہ علی گڑھ کالج سے مستعفی ہوکر ندوۃالعلماء میں شامل ہو گئے ۔ ندوۃالعلماء کا تعلیمی نصب العین سر سید کی تحریک سے کسی قدر مختلف تھا ۔ اس نقطۂ نظر کے حامی مشرقی علوم کو مسلمانوں کی ترقی کے لیے ضروری سمجھتے تھے اور مذہب و دینیات کی تعلیم و تدریس پر زیادہ توجہ صرف کی جاتی تھی ۔ اپنی عمر کے چند سال انھوں نے حیدرآباد دکن میں بھی گزارے اور مملکت آصفیہ کے ادبی اور تعلیمی شعبوں میں کارہائے نمایاں سرانجام دیے ۔ حیدرآباد سے ایک معقول پنشن حاصل کرنے کے بعد وہ لکھنؤ لوٹ آئے اور یہاں اپنی زندگی کے باقی دن اپنے محبوب مشاغل میں گزار دیے ۔ اسی زمانے میں انھوں نے سیرت‌النبی ﷺ کی تصنیف کا کام شروع کیا جسے ان کا عظیم ترین کارنامہ کہا جا سکتا ہے ۔ اس تصنیف کا ارادہ انھوں نے مدت سے کر رکھا تھا لیکن ہرہائی نس بیگم بھوپال کی مالی اعانت کے سبب ہی یہ ارادہ تکمیل کو پہنچ سکا ۔

شبلی نے جس زمانے میں اپنی ادبی زندگی شروع کی ، مسلمان شرفا فارسی کو اردو پر فوقیت دیتے تھے ۔ مولانا کو طبعاً شاعری سے لگاؤ تھا اس لیے انھوں نے شروع سے فارسی میں شعرگوئی اختیار کی اور زندگی بھر اسی زبان میں مشقِ سخن کرتے رہے ۔ ان کا فارسی کلام بے حد شیریں ہے اور انھیں ہندوستان کے بہترین فارسی گو شعرا کی صف

میں شمار کیا جا سکتا ہے - فارسی کلام کے چار مجموعے اب تک شائع ہوچکے ہیں - ''دیوان شبلی''، ''دستہ گل''، ''بوئے گل''، اور اگر اوائل عمر میں شبلی کی توجہ اردو کی طرف مبذول کرا دی جاتی اور وہ اردو کو شعرگوئی کا ذریعہ بنا لیتے تو یقیناً وہ اردو کے ایک نہایت کامیاب اور باوصف شاعر ہوتے - مثنوی ''صبح امید'' اور بعض دوسری نظموں سے قطع نظر وہ آخر عمر تک اردو میں شعر کہنے کی طرف مائل نہیں ہوئے اور نہ انھیں اس بات کا خیال آیا کہ وہ اردو میں نہایت فصیح اور مؤثر اشعار کہہ سکتے ہیں - چنانچہ انھوں نے اردو انشا پردازی ناموران اسلام کی سوانح نگاری سے شروع کی - ایک عالم ہونے کی حیثیت سے انھیں تحقیق و تفتیش کا شوق تھا - اسلامی تاریخ کا وسیع مطالعہ تھا - عربی اور فارسی زبانوں سے بخوبی آشنا ہونے کے سبب وہ تاریخ کے اصلی ماخذوں کا براہ راست مطالعہ کر سکتے تھے - اس کے علاوہ ایک یورپین، علوم مشرق کے پروفیسر ٹی - ڈی - آرنلڈ، نے انھیں اسلامی تاریخ میں نئی تحقیقات کی ترغیب دلائی - یہ دونوں علماء جو علی گڑھ کالج کے سٹاف سے تعلق رکھتے تھے، گہرے دوست بن گئے اور اپنے فیضان صحبت سے ایک دوسرے پر بہت حد تک اثر انداز ہوئے - مسٹر آرنلڈ نے عربی، فارسی اور اردو میں درس لینا شروع کیا اور مولوی صاحب فرانسیسی سیکھنے لگے - انھوں نے فرانسیسی میں خاصی استعداد پیدا کر لی تھی - گو وہ فرانسیسی بول نہیں سکتے تھے لیکن وہ اس زبان کی کتابیں بآسانی پڑھ لیتے تھے - چنانچہ بڑی کاوش سے انھوں نے سلامیات اور علوم مشرق سے متعلق فرانسیسی کتب کا مطالعہ شروع کر دیا - مصر، ترکی اور دوسرے اسلامی ممالک کا سفر بھی انھوں نے اختیار کیا جس سے ان

میں ایک خاص وسعت نظر پیدا ہوگئی ۔ اپنے سفر کے حالات و تاثرات کو انھوں نے ''سفرنامہ روم'' میں قلم بند کیا ہے ۔ یہ کتاب بہت دل چسپ ہے اور اردو زبان کے بہترین سفرناموں میں شمار کی جاتی ہے ۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ ناموران اسلام کے متعلق اچھی کتابیں اردو زبان میں نایاب ہیں اور اس سلسلے میں اب بھی تحقیق و تفتیش کی بہت گنجائش ہے ، شبلی نے عالم اسلام کی بعض مقتدر ہستیوں کی سوانخ حیات لکھنے کا کام شروع کیا ۔ سب سے پہلے انھوں نے خلیفہ عمرؓ کا انتخاب کیا جو آنحضرتؐ کے بعد دوسرے امیرالمومنین ہوئے ہیں ۔ حضرت عمرؓ ایک عادل اور باوقار حاکم تھے ۔ ایک جری سپہ سالار اور فاتح اور ایک خدا ترس انسان ۔ شبلی نے ان کی حیات اور کارہائے نمایاں کی تفاصیل اپنی مشہور کتب ''الفاروق'' میں جمع کر دی ہیں ۔ اس کتاب نے انھیں ایک محقق کی حیثیت سے ہی شہرت نہیں دلوائی بلکہ انھیں اردو زبان کے ایک باکمال انشاپرداز کی حیثیت سے بھی روشناس عالم کیا ۔ موجودہ نظام حیدرآباد کے والد میرمحبوب علی خاں نے اس تصنیف کی سرپرستی قبول فرمائی ۔ اردو داں طبقے میں اس کتاب کو بہت مقبولیت ہوئی اور وسیع پیمانے پر اس کی اشاعت ہوئی ۔ اس کے بعد چند اور سوانخ عمریاں شائع ہوئیں ۔ مثلاً ''المامون'' جس میں خلیفہ بغداد المامون کے حالات زندگی ہیں جو اپنے عہد میں علوم و فنون کا بہت بڑا سرپرست تھا ۔ ''الغزالی'' میں امام غزالی کے حالات و واقعات ہیں ۔ ''سیرت النعمان'' امام ابو حنیفہ کی سوانخ عمری ہے جو سنی مسلمانوں کے حنفی فرقے کے بانی ہیں تاہم اس میں ''الفاروق'' اور ''المامون'' کی سی روانی اور شگفتگی نہیں ۔ اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ''سوانخ مولانا روم'' ہے ۔ یہ مولانا

جلال‌الدین رومی کی سوانح حیات ہے جو اسلام کے اولین صوفیوں میں سے تھے - مختصر تصانیف میں ''بیان خسرو'' قابل ذکر ہے جو امیر خسرو دہلوی کی سوانح عمری ہے -

جن کتابوں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ، یہ سب اپنے طور پر نہایت قیمتی اور قابل وقعت تصانیف ہیں اور صرف ان کتابوں کی وجہ سے شبلی کو ادب میں دوامی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے - لیکن ان اول تالیفات سے ایک بلند تر منصوبہ بھی ان کے پیش نظر تھا اور انھوں نے بانئ اسلام کی زندگی کے مکمل حالات ضبط تحریر میں لانے کا تہیہ کر لیا تھا - اس مطلب کے لیے انھوں نے وسیع پیمانے پر اپنے موضوع کا مطالعہ شروع کیا اور بہت سے نوجوان علماء کو اس عظیم الشان تصنیف کے لیے مواد فراہم کرانے پر مامور کیا - اس تصنیف کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا - تحقیق و تفتیش کے متعلق طریق کار مقرر ہوا اور شبلی کی زیر نگرانی بعض دوسرے علماء بھی اس کام میں شریک ہوئے - وہ سب اعتراضات جو یورپین ناقدوں نے آنحضرت صلعم پر کیے ہیں ، شبلی کے ذہن میں تھے - شبلی نے اعتراضات کے جواب لکھے اور مختلف قسم کی غلط فہمیوں کو دور کیا - انھوں نے بتایا کہ اکثر یورپین ناقد غیر معتبر اور ضعیف ماخذوں پر بھروسہ کیے ہوئے غلط نتائج مرتب کر لیتے ہیں - اس تصنیف کے سلسلے میں شبلی مالی طور پر اتنے زیربار ہوگئے کہ کتاب کی تکمیل کی آمید نہ رہی - علم و ادب کی خدمت کا جذبہ ان میں اتنا قوی تھا کہ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ اپنی تمام آمدنی ادبی مشاغل کی نذر کر دیتے تھے - نایاب نسخوں کا قیمتاً فراہم کرنا ، ایران اور مصر سے کتابیں منگوانا ، معاونین کو معاوضہ دینا ، کتابوں کو خوشنما اور

دیدہ زیب بنانے میں رقم صرف کرتا ، یہ سب اخراجات وہ زندگی بھر خندہ پیشانی سے اٹھاتے رہے ۔ ہرہائی نس بیگم بھوپال کو جب معلوم ہوا کہ مولوی شبلی سیرۃ النبی‌ؐ کی اشاعت کا ارادہ رکھتے ہیں تو انھوں نے تمام اخراجات کی کفالت کا ذمہ لے لیا ۔ چنانچہ پوری یکسوئی اور جوش و خروش سے یہ کام شروع ہوگیا اور کئی برس تک جاری رہا ۔ پہلی جلد کے مکمل ہونے کے تھوڑے عرصے بعد ہی شبلی وفات پا گئے ۔ موت کے بے رحم ہاتھوں ایک بارآور اور مفید زندگی کا خاتمہ ہوا اور ان کے تمام ادبی منصوبے ادھورے رہ گئے ۔ سیرۃ النبی‌ؐ کی پہلی جلد ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی ۔ ان کے لائق شاگرد اور معاون سید مولانا سلیمان ندوی نے اس کی اشاعت کا بندوبست کیا ۔ اس کے بعد دوسری جلد شائع ہوئی اور اب حال ہی میں تیسری جلد کی اشاعت کا اعلان کیا گیا ہے ۔ اس تصنیف کو مجموعی طور پر کافی مقبولیت حاصل ہوئی ہے ۔ چونکہ یہ عوام کے مذاق کے مطابق نہیں لکھی گئی اس لیے بعض حلقوں میں اس کا سنجیدہ اور عالمانہ طرزِ بیان پسند نہیں کیا جاتا ۔ وہ لوگ جو اس کتاب کو علمی تحقیق و تدوین اور تاریخی صحت کے سبب پسند کرتے ہیں ، کتاب کے ان حصوں کو قابل اعتنا نہیں سمجھتے جن کی خوبی محض دل‌کش طرز ادا اور زور بیان ہے ۔ لیکن انصاف پسند نقادوں کی رائے میں مولانا شبلی اپنی زندگی کی اس آخری تصنیف سے اردو داں طبقے کو ہمیشہ کے لیے زیر بار احسان کر گئے ہیں ۔ نہ صرف انھوں نے اردو کے ادبی سرمائے میں ایک بیش بہا عطیے کا اضافہ کیا ہے بلکہ مذہب اسلام کی بہت بڑی خدمت سرانجام دی ہے ۔

مولانا شبلی کی ایک اور شہرۂ آفاق تصنیف ''شعرالعجم'' ہے ۔

یہ کتاب ادبیات ایران کی تاریخ ہے اور چار جلدوں پر مشتمل ہے ۔ پہلی جلد فیض عام پریس علی گڑھ سے ۱۹۰۹ع میں شائع ہوئی ۔ اس جلد میں عباس عروضی سے لے کر نظامی تک مختلف شعرا کا تذکرہ درج ہے ۔ اس کے علاوہ شاہنامہ کے مصنف فردوسی کا تذکرہ بھی ہے ۔ اس کے بعد تین جلدیں اور شائع ہوئیں جنھیں ادبی حلقوں میں داد تحسین حاصل ہوئی ۔ انھی دنوں پنجاب یونیورسٹی نے ہر سال کسی دیسی زبان کی بہترین تصنیف پر پندرہ سو روپے کا انعام دینا منظور کیا تھا ۔ یہ انعام مولانا شبلی کی ''شعر العجم'' کے صلے میں دیا گیا ۔ ''شعر العجم'' کی اشاعت سے پہلے پروفیسر براؤن کی تاریخ ادبیات ایران شائع ہو چکی تھی ۔ یہ کتاب مولانا شبلی کی نظر سے گزری تھی اور انھوں نے اس کتاب سے استفادہ کیا ہے ۔ پروفیسر براؤن کی کاوش اور تحقیق کی تعریف کرتے ہوئے انھوں نے مختلف شعرا کے متعلق براؤن کے آراء سے اختلاف ظاہر کیا ہے ۔ غالباً شبلی کو اپنے علم و فضل پر حد سے زیادہ اعتماد تھا ، اس لیے انھوں نے پروفیسر براؤن سے اختلاف ظاہر کرتے ہوئے انتہا پسندی اور قطعیت سے کام لیا ہے ۔ چنانچہ ایک نوجوان محقق پروفیسر محمود خاں شیرانی نے بڑی شد و مد سے براؤن کی تائید کی ہے ۔ ان کا ایک مضمون ''اردو'' میں شائع ہوا ہے جو حیدرآباد دکن کا ایک سہ ماہی رسالہ ہے ۔ اس رسالے میں انھوں نے ثابت کیا ہے کہ ''شعرالعجم'' کی معلومات اور خاص طور پر فردوسی کے متعلق بیانات غیر معتبر ہیں اور اس کے مقابلے میں پروفیسر براؤن کے اخذ کردہ نتائج زیادہ صائب اور قرین قیاس ہیں ۔ یہاں پر ''شعرالعجم'' اور براؤن کی ''تاریخ ادبیات ایران'' کا موازنہ مقصود نہیں ۔ یہ بات کیا کم باعث فخر ہے کہ

ایک ہندوستانی عالم اردو زبان میں ایک ایسی تنقیدی کتاب لکھے جو مغربی محققین کی لکھی ہوئی تصانیف کے مقابلے میں پیش کی جا سکے - مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ ایک مشہور یورپین عالم نے مولوی شبلی کی کتاب کو دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ ہندوستان میں بیٹھ کر ایک شخص کیونکر اتنی پر از معلومات کتاب لکھ سکتا ہے ، جب کہ اسے وہ تمام سہولتیں میسر نہیں جو یورپ کی تعلیم گاہوں میں کام کرنے والوں کو آسانی سے مہیا ہو سکتی ہیں - اور اس کا ذریعۂ اظہار محض ایک غیر ترقی یافتہ ہندوستانی زبان ہے - صرف اسی نقطۂ نظر سے میں شبلی کی "شعرالعجم" کو ایک معرکۃ الآرا کتاب سمجھتا ہوں - اور تمام نقائص کے باوجود ، جن کا پروفیسر محمود شیرانی نے حوالہ دیا ہے ، یہ کتاب اردو ادب میں ایک قیمتی اضافے کی حیثیت رکھتی ہے - اس کتاب نے مستقبل میں اسی نوعیت کی تصانیف کے لیے راستہ صاف کر دیا ہے - خاص طور پر اردو کی ایک جدید تاریخ ادب کے لیے "شعرالعجم" مشعلِ راہ کا کام دیتی ہے -

شبلی کے تحقیقی کارناموں میں "علم الکلام" کی نشو و نما کی تاریخ قابل ذکر ہے - علم الکلام کا مقصد مذہبی عقائد کے عقلی جواز پیش کرنا تھا ، جن کی مدد سے ضعیف الاعتقاد مسلمانوں کے شکوک و شبہات رفع کیے جائیں اور غیر مسلموں کے مخالفانہ اعتراضات کا جواب دیا جائے - "علم الکلام" کے عنوان سے شبلی نے ایک پُر از معلومات کتاب لکھی ہے جو بارہا چھپ چکی ہے - مختصر مضامین رسائل شبلی کے عنوان سے ایک مجموعے میں چھپ چکے ہیں - ان سب مضامین کا ذکر بے سود ہوگا ، لیکن ان میں سے دو ایک ایسے ہیں

جن کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ۔ ایک چھہتر صفحے کا کتابچہ ہے جو سکندریہ کے قدیم کتب خانے کے متعلق ہے ۔ مولانا نے اس نظریے کی تردید کی ہے کہ مصر کے مسلمان فاتحوں نے سکندریہ کے قدیم کتب خانے کو جلا ڈالا تھا ۔ اپنے بیان کے ثبوت میں جرمن ، فرنچ اور انگریز مصنفوں کے حوالے دے کر انھوں نے ایک بہت بڑی غلط فہمی کا ازالہ کیا ہے ۔ ان کا ایک مضمون شاہنشاہ اورنگ زیب کے متعلق ہے ۔ اس میں انھوں نے تاریخ کے مسلّمہ حقائق سے یہ ثابت کیا ہے کہ اورنگ زیب پر مذہبی تعصب اور جانبداری کے الزامات سراسر غلط اور بے جا ہیں ۔

شبلی کے نثری کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے ہمیں "موازنۂ انیس و دبیر" کو نہیں بھولنا چاہیے ۔ یہ کتاب مصنف کی تنقیدی صلاحیتوں کی شاہد ہے ۔ مغربی ادب کے تنقیدی اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کتاب لکھی گئی ہے ۔ اس میں انھوں نے دو لکھنوی شعراء کے کلام کے محاسن و عیوب کا باہمی موازنہ کیا ہے ۔ یہ دونوں شاعر فن مرثیہ گوئی کے امام تھے ۔ ہم عصر ہونے کی حیثیت سے باہمی رقابت لازمی تھی ۔ اسلوب فن میں دونوں کمال رکھتے تھے اور ہر مجلس میں اپنے مراثی پڑھا کرتے تھے ۔ دونوں کے مداحوں کے فرقے الگ الگ تھے ۔ ان ادبی فرقوں کا اختلاف ایک مذہبی تنازعے کی حد تک بڑھ گیا تھا ۔ دبیر کے مداح اپنے آپ کو دبیری کہتے تھے اور انیس کے حواری انیسی کہلائے جاتے تھے ۔ مولوی شبلی نے انیس کے حق میں فیصلہ صادر کیا ہے اور اپنے فیصلے کے جواز میں دلائل پیش کیے ہیں جو انیس و دبیر کے کلام کے حوالوں پر مبنی ہیں ۔ یہ کتاب مفید عام پریس آگرہ سے ۱۹۰۷ع میں شائع ہوئی تھی ۔

* * *

اکبر الہ آبادی[1]

سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی، جنھیں دنیا اردو کی بہت سی قابل قدر نظموں کے ذریعے سے جانتی ہے، بجا طور پر اردوئے جدید کے بہترین انشا پردازوں میں شمار ہوسکتے ہیں۔ اس اعتبار سے کہ ان کی تصنیفات عہد حاضر کی روح کا آئینہ ہیں اور ہندوستان کے بے شمار ارباب فکر کے دلوں میں اس وقت جو جذبات ہیں، اُن کو بیباکانہ ظاہر کرتی ہیں۔ وہ اردو میں اپنا ثانی نہیں رکھتے اور صحیح معنوں میں "لسان العصر" کے لقب کے مستحق ہیں جسے قبول عام کی سند حاصل ہو چکی ہے۔ "لسان العصر" ایک پھبتا ہوا کلمہ تھا جو پہلے پہل مخزن کے صفحات میں ان کے متعلق استعمال ہوا۔ اردو کے رسائل نے اسے ایسا پسند کیا کہ سب نے اس کا استعمال شروع کر

۱۔ سر عبدالقادر کا یہ مضمون ماہنامہ "ادبی دنیا" بابت جون ۱۹۲۹ء (جلد ۱، نمبر ۲)، ص ۱۱۵ سے لے کر ص ۱۱۹ تک شائع ہوا۔ یہ رسالہ سر عبدالقادر کی نگرانی میں چھپتا تھا۔ اس مضمون کے ساتھ اکبر الہ آبادی کی دستخط شدہ تصویر بھی شائع ہوئی۔ مضمون کے بارے میں رسالہ مذکور کے اداریے میں تحریر ہے:

"ہمارے محترم بزرگ سر عبدالقادر بالقابہ کا مضمون "آکبر کی شاعری" اکبر مرحوم کی زندگی میں ہی پنجاب یونیورسٹی کے ماتحت انگریزی لیکچر کی صورت میں وجود میں آیا تھا۔ یہاں اس کا ترجمہ شیخ صاحب قبلہ کو دکھانے کے بعد شائع کیا جاتا ہے۔ انگریزی میں یہ مضمون سر عبدالقادر کی انگریزی تصنیف "Famous Urdu poets and writers" کے صفحہ ۱۰۶ تا ۱۱۸ پر درج ہے جو نیو بک سوسائٹی لاہور نے ۱۹۴۷ء میں پہلی بار شائع کی — مرتب۔

دیا ۔ چنانچہ آج یہ نامور شاعر عموماً اسی لقب سے یاد کیا جاتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ حضرت اکبر کی نہایت بلیغ تعریف اور ان کے کلام کی خصوصیات کا بڑی وضاحت سے مظہر ہے ۔ اکبر کی شاعری اس ردعمل کی نمائندگی کرتی ہے جو یورپ کے اثرات کے خلاف ، بالخصوص جہاں تک ان اثرات کا ہندوستان کے مسلمانوں سے تعلق ہے ، ہمارے زمانے میں جاری ہے ۔ اس حیثیت سے وہ اردو کے طالبان علم کے لیے معمول سے زیادہ دلچسپی رکھتی ہے ۔

اس سے پیشتر کہ ہم سید اکبر حسین کی شاعری سے بحث کریں ، ان کی زندگی کا ایک مجمل سا خاکہ بے محل نہ ہوگا ۔ ان کی پیدائش ۱۸۴۵ء میں بمقام بارہ صوبجات متحدہ میں ہوئی ۔ ان کا خاندان ایک معزز خاندان سادات تھا ۔ بچپن کے متعلق کوئی ایسی بات نہیں جو خاص طور پر قابل ذکر ہو ۔ البتہ یہ کہ اوائل عمر ہی سے غیر معمولی ذہانت کے آثار ظاہر تھے ۔ آن کے والد سید تفضل حسین اگلے وقتوں کے بزرگوں میں سے تھے اور تصوف سے خاص مناسبت رکھتے تھے ۔ والدہ بھی نہایت پارسا اور پرہیزگار بی بی تھیں ۔ چنانچہ بیٹے نے تدین ورثے میں پایا اور اس ورثے کو عمر بھر حرز جان بنائے رکھا ۔ مذہب کی محبت وہ واحد موضوع ہے جس کی طرف اکبر کی طبیعت بار بار راغب ہوتی ہے ۔ وہ غافل اہل دنیا کو ، جو مادی ترقی کے جاذب نظر طلسم میں محو ہیں ، ہمیشہ یاد دلاتے رہتے ہیں کہ خدا کے بھی کچھ حقوق اس کے بندوں پر ہیں ، اور ایک دن انھیں اپنے اعمال کا حساب اس کے حضور میں دینا ہوگا ۔ یہ ان کے ساز کا سب سے بلند آہنگ اور مخصوص نغمہ ہے اور اسے دہراتے ہوئے وہ کبھی نہیں اکتاتے ۔

اکبر کی تعلیم بچپن میں نہایت معمولی تھی لیکن طبعی ذوق اور مستقل ذاتی مطالعے کی بدولت انھوں نے عربی، فارسی اور انگریزی سے اچھی واقفیت پیدا کر لی ۔ خدا داد ذہن و ذکا کا ایک ثبوت اس سے بہم پہنچتا ہے کہ ابھی دس سال کی عمر ہوگی کہ نہایت عمدہ خط اردو میں لکھ سکتے تھے اور فارسی قابلیت میں اپنے اکثر ہم عمروں سے پیش پیش تھے ۔ ان کے والد نے انھیں انگریزی تعلیم کے لیے مشن اسکول میں داخل کر کے ایک ایسی دور اندیشی اور وسعت نظر کا ثبوت دیا جو اس زمانے میں نایاب شے تھی ۔ لیکن ابھی انگریزی کی چند ابتدائی کتابیں ہی مدرسے میں پڑھی تھیں کہ غدر کا فتنہ بپا ہوگیا اور گھر کے معاملات نے ایسی صورت اختیار کی کہ تعلیم کا سلسلہ کچھ مدت کے لیے منقطع کرنا پڑا ۔ اس وقت ان کی عمر کوئی بارہ سال کی تھی ۔ اور اگرچہ کم سنی ہی کا عالم تھا کہ دنیا داری میں پڑ گئے، لیکن انگریزی کی تحصیل اپنے طور پر جاری رکھی اور مشرقی علوم کا بھی مطالعہ کرتے رہے ۔ ۱۸۵۹ء میں بطور نقل نویس ملازمت سرکاری میں داخل ہوئے ۔ ۱۸۶۷ء میں قانون کا پہلا امتحان پاس کیا جس کی بنا پر پلیڈری کی سند حاصل ہو گئی ۔ لیکن یہ پیشہ اختیار کرنے کی نوبت نہ آئی کیونکہ امتحان پاس کرتے ہی نائب تحصیلدار مقرر ہو گئے ۔ ۱۸۷۰ء میں ہائی کورٹ میں ریڈری مل گئی اور اس حیثیت میں رہ کر انھوں نے انگریزی اور اپنے قانون کے علم میں معتدبہ اضافہ کیا ۔ ۱۸۷۳ء میں الہ آباد ہائی کورٹ کی وکالت کا امتحان پاس کیا اور پریکٹس شروع کر دی ۔ ۱۸۸۰ء میں دوبارہ ملازمت سرکاری میں بحیثیت منصف داخل ہوئے اور کچھ مدت تک علی گڑھ میں متعین رہے ۔ یہ تقرر سرسید احمد مرحوم اور ان کے رفیق کار مولوی سمیع اللہ خاں مرحوم کی خاص

درخواست پر عمل میں آیا ۔ کیونکہ یہ صاحبان اس عظیم الشان تعلیمی کام میں ، جو انھوں نے علی گڑھ میں شروع کر رکھا تھا ، سید اکبر حسین کی ذہانت اور قابلیت سے مدد لینا چاہتے تھے ۔ انھوں نے غالباً اکبر کے حسن لیاقت کا چرچا سن رکھا تھا اور انھیں امید تھی کہ یہ نوجوان ایک قومی معاون ثابت ہوگا ۔ لیکن اس امید میں انھیں مایوسی ہوئی تھی ۔ علی گڑھ کا پیر دانا اور نوجوان شاعر ذاتی طور پر مدت العمر ایک دوسرے کے محب صادق رہے ، لیکن جہاں تک پبلک زندگی اور تعلیم عامہ کے بارے میں ان کے خیالات اور مقاصد کا تعلق تھا ، سر سید اور اکبر حسین دو متضاد مذاہب خیال کے نمائندے تھے اور ہمارے شاعر کو سر سید کی رائے سے کبھی اتفاق نہ ہوا ۔ بہر حال اکبر کی شاعری کے لیے سر سید کا فیض محبت ایک زبردست محرک ثابت ہوا ۔ چنانچہ اس جلیل القدر شخصیت کا نام اور کارنامے اکبر کی بہت سی دلچسپ نظموں کی شان نزول ہیں ۔ علی گڑھ میں جس کالج کی بنیادیں رکھی جا رہی تھیں وہ اکبر کی نگاہ میں مغربی خیالات اور اثرات کا زندہ مجسمہ تھا اور انھوں نے لوگوں کو آگاہ کرنا شروع کیا کہ اس کی ظاہری دلفریبیوں سے مسحور ہو کر روحانی ترقی اور قومی غیرت کی طرف سے غافل نہ ہو جانا ۔ شروع شروع میں ان کی وہ نظمیں جن میں انھوں نے سرسید کے پروپیگنڈے کی کامیابی پر اظہار خوف کیا تھا ، سوائے ان لوگوں کے ، جو علانیہ سر سید کے مخالف تھے ، کسی میں مقبول نہ ہوئیں ، لیکن آہستہ آہستہ ہوا کا رخ بدلا ۔ رائے عامہ اکبر کی موافق ہوگئی اور اکبر کی آواز ، گو وہ ایک اکیلی آواز تھی ، توجہ سے سنی جانے لگی ۔ چنانچہ آج عام طور پر

تسلیم کیا جاتا ہے کہ جس رفتار سے بعض تعلیم یافتہ مسلمان مغرب کی کورانہ تقلید کے راستے پر بڑھے چلے جاتے تھے ، اکبر نے اس کی سرعت کم کر کے ایک نمایاں خدمت انجام دی ۔ تاہم یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہیے کہ سرسید نے اشاعت تعلیم میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں آن کو اکبر نے نظر انداز کر دیا ۔ وہ یہ اعتراف کرتے ہیں کہ سرسید کا نصب العین اپنی قوم کی ترقی تھا ۔ انھیں اختلاف ہے تو فقط اس طریق کار سے جو علی گڑھ میں اختیار کیا گیا ۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ فقط کتابی علم یا زبانی جمع خرچ یا مذہب کی ظاہردارانہ عزت سے نوجوانوں کے دلوں میں مذہب کی محبت پیدا نہیں ہو سکتی ۔ مذہبی معاملات میں بزرگوں کا فیضان محبت ان کے نزدیک ان تمام چیزوں سے زیادہ وقعت رکھتا ہے ۔ کسی خدا رسیدہ کا ایک گوشۂ چشم مبذول ہو جانے سے دین کی جو محبت نوجوانوں کے دلوں میں پیدا ہو سکتی ہے وہ کتابوں یا کالج کی عمارت کے بس کی نہیں :

نہ کتابوں سے ، نہ کالج کے ہے در سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

ایک اور مقام پر وہ یہ رونا روتے ہیں کہ مغربی تعلیم کے دلدادہ اگرچہ اپنے آبا و اجداد سے ظاہری مشابہت رکھتے ہیں لیکن آن کی تمام باطنی خوبیاں ضائع کر دیتے ہیں :

رنگ چہرے کا تو کالج نے بھی رکھا قائم
رنگ باطن میں مگر باپ سے بیٹا نہ ملا

ان اشعار سے واضح ہے کہ علی گڑھ کالج نے اُن کے خیالات پر کیا اثر کیا ۔ لیکن اس قسم کے اور نمونے ہم آئندہ کے لیے اُٹھائے رکھتے ہیں ۔ سردست اُن کی زندگی کی بقیہ کہانی بیان کرتے ہیں ۔ ۱۸۸۸ع میں سید اکبر حسین سب جج کے عہدے پر فائز ہوئے اور ۱۸۹۴ع میں الہ آباد کی عدالتِ خفیفہ کے جج مقرر ہوئے ۔ اسی سال ڈسٹرکٹ اور سیشن جج ہوگئے اور الہ آباد ، جھانسی ، مین پوری ، بنارس اور سہارن پور میں کام کرتے رہے ۔ جوڈیشل محکمے کے سب سے اوپر کے زینے پر پہنچنے کا اُن کے لیے موقع تھا ۔ خیال کیا جاتا تھا کہ مسٹر جسٹس ایکمان کی مدت ملازمت ختم ہونے پر سید اکبر حسین کو الہ آباد ہائی کورٹ کی بنچ پر جگہ ملے گی لیکن اُس وقت کے آنے سے پہلے آنکھوں کی کسی شکایت کے باعث اُنھیں ملازمت سے دست بردار ہو جانا پڑا ۔ اُس کے بعد سے اُن کی زندگی ہمیشہ خدمتِ دین اور مشاغلِ ادبی کے لیے وقف رہی اور اُنھوں نے اپنی دانشمندی اور تجربہ کاری کا نچوڑ دنیا کو ایسے اشعار کی صورت میں دیا ہے جو اتنے ہی پُراثر ہیں جتنے کہ ظرافت کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں ۔ اخیر عمر میں ضعیفی اور کہولت نے بہت جلد ان پر غلبہ کیا جس کی وجہ یہ ہے کہ انھیں اول اپنی زوجہ اور اُن کے بعد اپنے دوسرے بیٹے سید ہاشم حسین کے انتقال کا صدمہ دیکھنا پڑا ۔ لیکن ان ناموافق حالات کے باوجود اُن کا دماغ تر و تازہ اور اُن کا تخیل شاداب رہا ۔ اُن کے رشحاتِ قلم میں ، جو کبھی کبھی رسائل و جرائد کے صفحات پر نظر آتے رہتے تھے ، بالعموم کہولت کے آثار دکھائی نہیں دیتے ۔ خط و کتابت کے معاملے میں بھی وہ نہایت باقاعدہ تھے اور ہندوستان کے بے شمار ادیبوں کے ساتھ اُن کی خط و کتابت کا سلسلہ رہا ۔ اُن کے

خطوط کا رنگ اس ظریفانہ رنگ سے، جو اُن کے اکثر اشعار میں نظر آتا ہے، بالکل جدا ہوتا ہے۔ لب و لہجہ میں عموماً سنجیدگی ہوتی ہے۔ نفسِ مضمون زیادہ تر بڑھاپے کا جسمانی عارضہ اور وہ دماغی تکلیفیں ہوتی ہیں جو بیوی اور بیٹے کی جدائی کے صدمے کا نتیجہ ہیں اور اُمورِ دنیوی کی بجائے عموماً اُمورِ آخرت کا تذکرہ ہوتا ہے۔ اکبر کے بہت سے خطوط میری نظر سے گزرے ہیں کیونکہ ان میں ایک معقول تعداد ایسے خطوں کی ہے جو میرے نام یا میرے دوستوں کے نام آئے تھے۔ اگر ان کا انتخاب کر کے ایک مجموعہ شائع کیا جائے تو اکبر کے آئندہ مداحوں کے لیے یہ مجموعہ ان کی شخصیت کی جیتی جاگتی تصویر ہوگا۔

اکبر کے کلام کا پہلا مجموعہ "کلیاتِ اکبر" کے نام سے ۱۹۰۸ع میں شائع ہوا تھا۔ اُس کے بعد مطبع مخزن کی طرف سے ان کی رباعیات کا ایک ایڈیشن نکلا۔ جو غزلیں اور نظمیں ۱۹۰۸ع کے مجموعے میں شامل ہونے سے رہ گئی تھیں یا بعد میں کہی گئی تھیں وہ ۱۹۱۲ع میں کلیات حصہ دوم کے نام سے شائع ہوئیں۔

یہ مطبوعات بڑی حد تک حضرت اکبر کے بڑے بیٹے سید عشرت حسین کی مساعیِ جمیلہ کی مرہونِ منت ہیں۔ سید عشرت حسین کیمبرج کے تعلیم یافتہ ہیں اور انھوں نے مذاقِ ادب اپنے والد سے ورثے میں پایا ہے۔ اُن کا سفرِ یورپ اکبر کی بہت سی دل چسپ نظموں کا موضوع ہے۔ سید صاحب نے ایک خدمت بہت بڑی انجام دی ہے؛ وہ یہ کہ انھوں نے موقع بموقع نظموں کے کہے جانے کی تاریخیں دے کر کلیات کی دل چسپی دوبالا کر دی ہے۔ میں نے

سنا ہے کہ اکبر نے بارہ سال کی چھوٹی عمر میں شعر کہنا شروع کیا جس سے ظاہر ہے کہ اُن کا ملکہؑ شاعری عطیہؑ الٰہی ہے۔ بعض غزلیں جو ۱۱ سال کی عمر میں کہی گئی تھیں، نمونے کے طور پر کلیات میں درج ہیں۔ ان غزلوں کی قادرالکلامی صاف پتہ دیتی ہے کہ شاعر ہونہار ہے۔ جن خیالات کی بنا پر اکبر کا شمار بعدہ دور جدید کے استادوں میں ہونے لگا، وہ ابتدائی کلام میں نہیں پائے جاتے۔ تاہم اگر اردو کے پرانے معیار شاعری کے مطابق جانچا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ ابیات ذیل جو اکبر نے انیس سال کی عمر میں کہے، اچھے اچھے کہنہ مشق شاعروں کے لیے بھی باعث فخر ہوسکتے تھے:

پاؤں پڑ کر کہتی ہے زنجیر زنداں میں رہو
وحشتِ دل کا ہے ایما راہِ صحرا لیجیے
خوشنما چیزیں ہیں بازارِ جہاں میں بے شمار
ایک نقدِ دل سے پیارے مول کیا کیا لیجیے

شاعری رنگ طبیعت کا دکھا دیتی ہے
بوئے گل راہ گلستاں کی بتا دیتی ہے
موت سے کوئی نہ گھبرائے اگر یہ سمجھے
کہ یہ دنیا کے بکھیڑوں سے چھڑا دیتی ہے

جب اُن کو رحم کچھ آیا صبا نے سمجھایا
بگڑ بگڑ گئی تقدیر میری بن بن کے

اس کے دو سال بعد یعنی ۱۸۶۶ء میں جب اکبر نے ایک مشاعرے میں غزل پڑھی اور تحسین عام حاصل کی تو پہلی مرتبہ دنیا سے اُن کا بحیثیت ایک اچھے غزل گو کے تعارف ہوا۔ بعد ازاں

چند سال تک وہ عام رنگ کی غزلیں لکھا کیے ۔ تاآنکہ جن واقعات کا اوپر تذکرہ کیا جا چکا ہے آن کے زیر اثر آن کے خیالات نے ایک متعین شکل اختیار کی اور انھوں نے ایک خاص مقصد پیش نظر رکھ کر شعر کہنا شروع کیا ۔

قبل اس کے کہ ہم آن کے ایسے اشعار کے نمونے ملاحظہ کریں جو رائے عامہ کو مختلف صورتوں میں متاثر کرنے کے لیے تصنیف کیے گئے ، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آن کی ایک نظم کے متعلق ، جو سودی کی مشہور نظم ''واٹرز آف لوڈور'' کا ترجمہ ہے ، کچھ کہا جائے ۔ مدت ہوئی میں نے یہ ترجمہ کسی اخبار میں دیکھا تھا اور اسے دیکھ کر مجھ پر یہ انکشاف ہوا تھا کہ ایک صاحب لیاقت آدمی ، جس کو اپنی زبان پر کافی دسترس حاصل ہو ، کیا کچھ کرسکتا ہے ۔ اردو کا ذخیرۂ الفاظ چونکہ کچھ ایسا وسیع نہیں اس لیے بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ انگریزی زبان کی تصنیفات کا اردو میں کامیابی کے ساتھ ترجمہ کرنا محال ہے ۔ لیکن اکبر نے سودی کی نظم جیسی مشکل چیز کو ، جس میں پانی کے پہاڑیوں سے نکل کر وادی میں جانے کا لفظی مرقع کھینچا گیا ہے ، اس خوبی سے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے کہ آسے پڑھ کر آردو کی قدرت اظہار کے متعلق بہت کچھ امیدیں بندھتی ہیں ۔

یہ ترجمہ اگر اردو کی ممکنات کو ظاہر کرتا ہے تو اس سے کہیں زیادہ اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ اکبر کو اس زبان پر کتنی قدرت حاصل ہے ۔ اور میرا خیال ہے کہ اس کا شمار مدتوں اردو کی چیدہ نظموں میں ہوگا ۔ کیونکہ شاعر نے اس حد تک آسے اپنا

بنا لیا ہے کہ اگر وہ خود اس کے ترجمہ ہونے کا اعتراف نہ کرتا تو کوئی شخص جس نے اصل چیز نہیں پڑھی کبھی بھی نہ سکتا تھا کہ یہ ترجمہ ہے۔ حسنِ فطرت کے بیان کی اُردو جہاں تک قدرت رکھتی ہے، اس کا یہ ایک عمدہ نمونہ ہے۔ اُردو کے شاعروں نے اگر آج تک اس باب میں کوشش نہیں کی تو اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس صنف تحریر کی مانگ نہ تھی۔ لیکن اگر آج مناظرِ فطرت کی الفاظ میں مرقع آرائی کرنے کی طرز مقبول ہو جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ اُردو کے شاعر اس میں دادِ سخنوری نہ دے سکیں۔ انیس کے کلام میں نیچرل شاعری کے نہایت اعلیٰ نمونے نظر آتے ہیں اور دورِ جدید کے شعرا میں آزاد، حالی اور اکبر نے جب کبھی فطرت کی نقشہ کشی کی طرف توجہ کی ہے تو کافی قدرتِ کلام کا ثبوت دیا ہے۔ اکبر کی ایک نہایت دل چسپ نظم ہے جس میں دو تیتریوں کے اُڑنے کی کیفیت دکھائی گئی ہے اور اس منظر کو دیکھ کر شاعر کے دل میں جو خیالات و جذبات پیدا ہوتے ہیں ان کو بیان کیا گیا ہے۔

اکبر کی شاعری کی ممتاز خصوصیات سے میرے خیال میں مختلف عنوانات کے ماتحت بحث کی جا سکتی ہے۔ گو مجھے اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس کی بعض خصوصیات ایسی لطیف اور نازک ہیں کہ ان کی مکمل تقسیم امرِ محال ہے۔ وہ عنوان حسبِ ذیل ہیں:

(الف) ظرافت و بذلہ سنجی بلکہ بعض اوقات تمسخر اور طنز کا بھی شوق۔

(ب) خیالات اور اسلوب بیان کی جدت ۔

(ج) تخیل کی گرم جوشی اور حب وطن کا خاموش جذبہ ۔

(د) مذہب کی سچی اور پُرجوش محبت ۔

ایک اور خصوصیت ہے جس کا تعلق بہ نسبت اُن کی شاعری کی روح کے جامۂ ظاہری سے زیادہ ہے ، یعنی انگریزی کے الفاظ استعمال میں لانے کی مہارت ۔ بعض اوقات تو وہ کوئی انگریزی لفظ یا جملہ استعمال میں لا کر لطف سخن کو دوبالا کر دیتے ہیں اور بعض اوقات اس عادت کی وجہ سے انھیں بڑی دقت پیش آتی ہے ۔ چنانچہ وہ متعدد اشعار ایسے کہہ گئے ہیں کہ ان میں جتنے انگریزی کے الفاظ لائے گئے ہیں وہ ٹھیک نہیں بیٹھتے اور اکھڑے اکھڑے معلوم ہوتے ہیں ۔ ایسے اشعار ان کی اردو نویسی کی شہرت میں کچھ اضافہ نہیں کرتے ۔

نامناسب نہ ہوگا کہ ہم متذکرہ بالا خصوصیات پر فرداً فرداً نظر ڈالیں ۔ ظریفانہ لہجے میں گفتگو کرنے کا مادہ معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کی طبیعت میں فطرۃً ودیعت ہوا ہے ۔ وہ اکثر بغیر کسی تصنع کے کوئی لطیفہ کہہ جاتے ہیں ۔ گو بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوشش و کاوش کے آثار ظاہر ہو جاتے ہیں اور آمد کا لطف جاتا رہتا ہے ۔ عورتوں کے پردے کے متعلق ان کا جو مشہور قطعہ ہے وہ ان کی بے تکلف ظرافت کا نمونہ ہے :

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

آج کل اکثر لوگوں کو اشتہار ذاتی کی جو بیجا خواہش ہوتی ہے اس کا تمسخر اڑاتے ہیں اور ایسے الفاظ میں کہ ان کا جواب مشکل ہے:

دیکھو جسے وہ پائنیر آفس میں ہے ڈٹا
للہ میرا نام کہیں چھاپ دیجیے

ایک اور شعر جو میرے ذہن میں آن کی ظرافت نگاری کی مثال کے طور پر آیا ہے ان کی طبیعت کی اپج اور اسلوب بیان کی جدت کا بھی مکمل نمونہ ہے۔ آپ خوب جانتے ہیں کہ اردو اور فارسی میں شراب کو ''دختِ رز'' یعنی ''انگور کی بیٹی'' کہتے ہیں۔ اکبر نے شراب کے مضر اثرات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس استعارے کا نہایت خوش اسلوبی سے استعمال کیا ہے:

اس کی بیٹی نے اُٹھا رکھی ہے دنیا سر پر
خیریت گزری کہ انگور کے بیٹا نہ ہوا

مزید لطف یہ ہے کہ ہندوستانیوں کا یہ جو عام خیال ہے کہ لڑکیاں عموماً طبیعت کی مسکین ہوتی ہیں اور ماں باپ کو دکھ نہیں دیتیں اور برخلاف اس کے لڑکے عموماً اکھڑ اور خود سر نکلتے ہیں، اس کی طرف اس شعر میں نہایت لطیف کنایہ ہے۔

ایک اور شعر ملاحظہ ہو جس میں گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا گیا ہے اور جس کا طرزِ ادا اکبر کا طرزِ خاص ہے:

وضع سابق سے بتِ ہندی کو سیری ہوگئی
ہو مبارک ملک کو دنیا کنیری ہوگئی

محض یورپی معاشرت کی نقالی کی بجائے مغرب کی حکمتِ عملی سیکھنے کا وہ جس تاکید سے مشورہ دیتے ہیں اُس کا اس شعر سے اندازہ کیجیے :

بن گئے صاحب ، ہُنر صاحب کا کیا ہے آپ میں ؟
کیا کہیں ٹپکیں کی سقفِ بنگلہ خس پوش سے

اکبر کی حب الوطنی کو جہاں میں نے گرم جوشی سے تعبیر کیا ہے وہاں آسے ایک خاموش جذبہ بھی کہا ہے - اخیر کا شعر ظاہر کرتا ہے کہ اُن کے دل میں ہندوستان کی مادی ترقی دیکھنے کی کتنی خواہش ہے - وہ ملکی صنعت و حرفت کو فروغ دینے کے حامی ہیں - وہ جانتے ہیں کہ آزادی کی حقیقی روح ہندوستانیوں کے دل میں پیدا ہو - اُن کی آرزو ہے کہ لوگ تجارت سیکھیں اور ملازمت کی بجائے اسے اپنا وسیلۂ معاش بنائیں - اُن کی یہ دلی تمنا ہے کہ اُن کا ملک دنیا کے ممالک کا ہمسر ہو جائے - وہ اپنے ہم وطنوں کو اُمید کا پیغام دیتے ہیں اور ہندوستان اور تمام مشرقی ممالک کو اچھے دنوں کے آنے کی خوش خبری سناتے ہیں - یہ سب کچھ ہے لیکن وہ فکر اور عمل دونوں میں اعتدال کے معتقد ہیں -

رہی اکبر کی مذہب سے محبت ، یہ اُن کی تمام تصنیفات میں باستثنا ابتدائی تصنیفات کے سرایت کیے ہوئے ہے - مثلاً کہتے ہیں :

موت کے عشووں کے آگے نازِ منطق کچھ نہ تھا
دل کو مذہب کے قدم پر سر کو دھرنا ہی پڑا

مذہب کی فلسفیانہ شکل یعنی تصوف کی زبان میں کہتے ہیں :

تصوف کے بیان کو ہوش نے روح آشنا پایا
معانی کچھ نہ سمجھا پر قیامت کا مزا پایا

میں اوپر بیان کر چکا ہوں کہ انگریزی زبان کے الفاظ اردو میں استعمال کرنا اکبر کے فن کا ایک کرتب ہے۔ بعض لوگ جو یہ چاہتے ہیں کہ زبان ملاوٹ سے پاک رہے، اُسے پسند نہیں کرتے۔ لیکن جن کو معلوم ہے کہ اردو پہلے ہی مختلف زبانوں کا مخلوط مجموعہ ہے وہ انگریزی کے الفاظ داخل کر کے اردو کے سرمایے میں اضافہ کرنا کچھ برا نہیں سمجھتے۔ انگریزی کے متعدد الفاظ اس وقت تک اردو میں جذب ہو چکے ہیں اور انہیں ہر کوئی بے تامل استعمال کرتا ہے۔ تاہم اکبر ان الفاظ کو جو جزو زبان ہوچکے ہیں، کافی نہیں سمجھتے بلکہ ہمیشہ نئے نئے الفاظ کو جن کی سند پہلے کہیں نہیں ملتی اردو میں کھپانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ بعض صورتوں میں تو خود ان کا استعمال آئندہ کے لیے سند ہو جائے گا، لیکن بعض صورتوں میں زیادہ یہ ہوگا کہ ان کے لیے تو یہ اختراعات قابل معافی قرار دے دی جائیں گی لیکن کوئی دوسرا ان کا تتبع نہ کرے گا۔

کلیات کے اس حصے میں جہاں ظریفانہ کلام درج کیا گیا ہے، چند اشعار ایسے ہیں جو شائستگی اور خوش مذاقی کی حد سے متجاوز معلوم ہوتے ہیں۔ اس طرح کی باتیں دوستوں کی بے تکلف صحبت میں ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن اکبر جیسے شاعر کے مطبوعہ مجموعۂ کلام میں ان کا ہونا معیوب معلوم ہوتا ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں قطع و برید کی مقراض زیادہ برتی جائے گی اور

کلیات کو تمام ایسے حشو و زوائد سے پاک کر دیا جائے گا جو اکبر سے بلند پایہ شاعر کے شایانِ شان نہیں ۔

اگرچہ حضرت اکبر اپنی قوم کے حقوق کے معاملے میں اغیار کو بڑی بدگمانی کی نگاہ سے دیکھتے تھے ، لیکن کیا طبعاً اور کیا بلحاظ تربیت وہ ہمیشہ اہلِ برطانیہ کے دوست رہے ۔ ان کی تصنیف سے اس امر کا کافی ثبوت بہم پہنچتا ہے کہ وہ برطانوی قوم کی کس درجہ عزت اور تعظیم کرتے ہیں ۔ وہ اس سے ناواقف نہیں ہیں کہ انگریزوں کے تعلق سے ہندوستانیوں کو نفع پہنچا ہے ۔ وہ اپنے ہم وطنوں سے ہمیشہ یہ کہتے رہتے ہیں کہ مغربی تہذیب میں جو باتیں اچھی اور مفید ہیں وہ بے شک اخذ کر لینی چاہئیں بشرطیکہ اپنی خوبیاں ہاتھ سے نہ جاتی رہیں ۔ بعض امور میں تو وہ بہت زیادہ قدامت پرست واقع ہوئے ہیں ؛ مثلاً میں نے اوپر ان کا ایک قطعہ پردے کے متعلق درج کیا ہے ۔ یہ ان کا دل پسند موضوع ہے ۔ ہندوستان کے تعلیم یافتہ مسلمانوں میں بہت سے ایسے ہیں جو اس بارے میں اکبر کے ہم خیال نہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ کم از کم پردے کی سخت پابندیوں میں کمی ہو جائے ۔ لیکن قدامت پسندی کی وہ قوتیں جن کی اکبر نمائندگی کرتے ہیں اب تک غالب چلی آتی ہیں ۔ بہرحال اکبر کو اس امر کا احساس تھا کہ بہت ممکن ہے ایک نہ ایک دن زمانے کا ورق الٹ جائے اور اس لیے وہ شدنی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے پیش گوئی کرتے ہیں کہ :

اکبر بے شک پردے کا حامی ہے لیکن وہ اور اس کی رباعیاں کب تک ۔"

شہزادہ مرزا ارشد گورگانی[1]

چند روز ہوئے ایک دوست کا خط آیا کہ کلامِ ارشد چھپنا چاہیے - میں نے ان کو لکھا کہ مرزا مرحوم نے لائق فرزند یادگار چھوڑے ہیں - وہ ضرور اس فرض کو ادا کریں گے - اور اگر اتفاق سے میرے وطن واپس پہنچنے تک کلامِ ارشد کے چھپنے کا انتظام نہ ہو چکا تو میں بھی اس کی اشاعت کی سعی کروں گا ، کیونکہ میں اسے نہ صرف اُس خلوص کے لحاظ سے ضروری سمجھتا ہوں جو مجھے مرزا مرحوم سے تھا ، بلکہ میرے نزدیک ہمارا یہ قومی اور ملکی فرض ہے - کیونکہ شہزادہ مرزا عبدالغنی ارشد مدت العمر ملک و قوم کی خدمت زبان و قلم سے کرتے رہے اور ان کے کلام کے کئی حصے اردو علم و ادب میں مستقل شہرت اور قدر کے مستحق ہیں - دہلی کے جن نامور حضرات کی بدولت پنجاب میں اردو نے قبولیتِ عام کا درجہ پایا اُن کی معزز فہرست میں مرزا ارشد کا نام توقیرِ خاص رکھتا ہے - شعرائے دہلی کے دورِ آخر میں مرزا ارشد کی ذات بس مغتنم تھی - اُن کے گذر جانے سے پنجاب میں پرانی شاعری کے بعض اصناف کا خاتمہ ہو گیا - اُن کو ترددات زمانہ نے کبھی جی بھر کر تصنیف و تالیف میں مصروف رہنے کی مہلت نہ دی - اس پر بھی جو کچھ وہ نظم و نثر میں لکھ گئے ہیں ، جمع کیا جائے تو کئی جلدیں مرتب ہو سکتی ہیں - اور اگر انتخاب سے کام لیا جائے تو

---

۱ - مرزا عبدالغنی ارشد گورگانی (۱۸۵۰ء - ۲۱ فروری ۱۹۰۶ء) شاہانِ مغلیہ کی یادگار ، مشہور و معروف شاعر -

بحوالہ مخزن ، اپریل ۱۹۰۷ء (جلد ۱۳ نمبر ۱) ، ص ۱۶ تا ۲۲ -

بھی دو معقول جلدیں درکار ہوں گی ۔ نثر ہیں ناول ہیں اور مختصر مضامین ۔ نظم میں غزلیں ہیں ، مرثیے ہیں ، قومی مسدس ہیں ، علمی اور اخلاق مسلسل نظمیں ہیں ، رباعیاں ہیں ، لطائف و ظرائف ہیں ۔ مرزا ارشد کا ان تھک قلم علم و ادب کے وسیع میدان میں ہر طرف دوڑتا تھا اور زبان اردو کا یہ بادشاہ ایک صنف کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری میں اس بیتابی سے طبع آزمائی کرتا تھا کہ گویا جہانِ سخن پر قبضہ کیا چاہتا ہے :

ہفت اقلیم ار بگیرد پادشاہ ہمچناں در بندِ اقلیمے دگر

اور تھا بھی حق بجانب ، گورگانی خون رگوں میں دوڑتا تھا ، مگر بادشاہی کی جگہ ملک سخن ہی رہ گیا تھا ۔ زبان اردو کنیز خانہ زاد تھی ۔ جس گھر میں اردو نے جنم لیا ، جس گھرانے میں اس کی پرورش ہوئی اس گھر اور گھرانے کا یہ چشم و چراغ تھا ۔ جب انقلاب زمانہ سے وہ گھر اجڑ گیا اور دہلی لٹ گئی تو یہی ایک دولت تھی جو اس کے پاس باقی رہ گئی ۔ اسے لے کر نکلا اور پنجاب کی خوش قسمتی سے پنجاب کی سرزمین اسے پسند آ گئی ۔ وہاں بیٹھ کر اس دولت کو اس طرح صرف کیا کہ سینکڑوں مالا مال ہوگئے ۔ پنجاب کے جس ضلع کو مرزا ارشد سے خاص طور پر فیض پہنچا وہ فیروز پور ہے اور وہاں مشکل سے کوئی پڑھا لکھا آدمی ایسا ہوگا جسے مرزا مرحوم سے تلمذ نہ ہو ۔ گو لاہور میں مرزا ارشد کا قیام بہت کم ہوا لیکن فیروز پور سے لاہور بہت دور نہیں ۔ اکثر تشریف لاتے تھے ۔ طبیعت دوست پرور تھی ۔ جو کوئی بھی بلاتا چلے آتے ۔ مشاعرہ ہے تو اس میں موجود ، مجلس عزا ہے تو وہاں مرثیہ پڑھ رہے ہیں ، انجمنوں کے سالانہ جلسے ہیں تو ان کی رونق بڑھا رہے

ہیں - اتنی جگہ سے ان کو بلاوے آتے تھے کہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ سب جگہ پہنچنے کے لیے وقت کہاں سے لاتے ہیں اور سب کے لیے نظم کس وقت لکھتے ہیں - طبیعت میں آمد بلا کی تھی - مضامین گویا صف بستہ حاضر رہتے تھے - قوافی پر عبور کامل تھا - بات کرتے کرتے مصرعے اور شعر موزوں ہوتے جاتے تھے - کبھی ریل میں آتے آتے سفر میں جلسے کے لیے نظم لکھی جا رہی ہے - کبھی بے نظم چلے آئے ہیں اور جلسے سے پہلی شب کو شمع نیم شب جل رہی ہے - کبھی جلسے ہی میں اپنی نوبت آنے سے پہلے ایک گھنٹہ بھر کے لیے الگ جا بیٹھے ہیں اور ایک نظم لکھ لائے ہیں - یہ ظاہر ہے کہ ہر نظم جو اس عجلت اور روا روی میں لکھی جاتی تھی اس رتبے کی نہیں ہوتی تھی جو ان کی قابلیت اور شہرت کے شایان تھا - مگر پھر بھی اس میں بہت سے اشعار کام کے نکل آتے تھے جو سننے والوں کو پھڑکا دیتے تھے ، اور باقی اشعار بھی روزمرہ اور زبان کی خوبی اور ان کے پڑھنے کے انداز کی بدولت اس وقت مقبول ہو جاتے تھے - واہ واہ کا صلہ انھیں ہر جگہ بکثرت مل جاتا تھا اور اس سے زیادہ وہ کسی سے طالب نہ تھے - ہاں والیان ریاست سے بعض دفعہ انھیں خلعت اور انعام ملا مگر وہ بھی زیادہ نہیں اور اس میں بھی ان کی عادت یہ تھی کہ کسی نے دو دفعہ یاد کیا تو ایک دفعہ جا کھڑے ہوئے -

ان کی طبیعت کی آمد کا ایک دفعہ مجھے ایک نہایت دلچسپ تجربہ ہوا اور عجب اتفاق ہے کہ وہ میری ان کی پہلی ملاقات کا دن تھا - اس کے بعد جب کبھی مجھے ملتے تو اس ملاقات کے واقعات کو یاد دلاتے - ان پر خود ہنستے اور دوستوں کو ہنساتے

تھے - اور وہ قصہ تھا بھی یاد رکھنے کے قابل - ابھی کل کی بات معلوم ہوتی ہے ، مگر دس سال گزر گئے - مجھے اُس وقت کالج کی تعلیم سے فارغ ہوئے دو اڑھائی سال ہوئے تھے اور میں اُس وقت تک نسبتاً گوشہ گزیں تھا - اخبار ''آبزرور'' سے بہ حیثیت اسسٹنٹ ایڈیٹر میرا تعلق تھا اور اس وجہ سے بعض لوگ میرا نام سن چکے تھے ، لیکن میری صورت کم پہچانتے تھے - میں اُن دنوں ترکی ٹوپی ، جو اب ہندوستان میں مسلمانوں کا شعار ہو چلی ہے ، نہیں پہنتا تھا - اور اس لیے میری وضع اور پوشش میں کوئی چیز ایسی نہ تھی جس سے پہچانا جائے کہ میں مسلمان ہوں - کئی لوگ مجھے ہندو خیال کرتے تھے - ہائے عجب زمانہ تھا :

مجھے دیر و حرم سے کچھ تعلق تھا تو یکساں تھا
گماں ہندو کا کرتا تھا کوئی مجھ پر مسلماں کا

مرزا ارشد بھی اسی دھوکے میں تھے ، گو مجھے یہ حال معلوم نہ تھا - ایک رات وہ لاہور میں ایک مشاعرے میں تشریف رکھتے تھے - میرے ہمراہ مرزا صاحب کے شاگردوں میں سے ایک ہندو دوست تھے - ہم پہنچے تو مشاعرہ ابھی شروع نہیں ہوا تھا - میں نے اپنے دوست سے کہا چلو مرزا صاحب سے باتیں کریں - انھوں نے کہا چلو - میں اس سے پہلے کئی دفعہ ایسے ہی موقعوں پر بغیر باقاعدہ تقریب ملاقات کے اُن سے باتیں کر چکا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ وہ مجھے پہچانتے ہیں - ہم دونوں اُن کے پاس جا بیٹھے - وہ معمولی اخلاق سے پیش آئے - پہلے کچھ شعر و سخن کی باتیں ہوتی رہیں - پھر میرے دوست نے اُن سے کہا ''کل ہمارے ہاں کھانا

کھائیے ۔" انھوں نے شکریہ ادا کیا اور یہ کہہ کر عذر کیا کہ "آج کل رمضان کا مہینہ ہے ۔ ہم مسلمانوں کو دن میں کھانا کھانے کی ممانعت ہے ، اور شام کو میں فیروز پور واپس جاتا ہوں ۔" اس اثنا میں روزوں کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے مجھ سے یوں وہ کچھ اسی طرح مخاطب ہوئے جیسے میں مسلمان نہیں اور اس لیے مجھے مسلمانوں کا دستور ٹھیک معلوم نہیں ۔ مجھے اس سے کسی قدر تعجب ہوا لیکن میں چپ ہورہا اس خیال سے کہ خطاب اصل میں میرے رفیق سے ہے ۔ خیر اس کے بعد مشاعرہ شروع ہوا ۔ مرزا موصوف نے ایک پُر زور غزل پڑھی ۔ اس کے بعد اور لوگوں کی غزلیں پڑھی گئیں اور مشاعرہ برخاست ہوا ۔ دوسری صبح کو کوئی دس بجے کے قریب میں بازار میں جا رہا تھا کہ مرزا صاحب مل گئے ۔ میں نے سلام کے لیے ہاتھ اٹھایا ۔ انھوں نے کہا "بندگی ! آپ خوب وقت پر ملے ہیں ۔ ہزاروں دفعہ لاہور آیا ہوں مگر یہاں کی گلیاں سمجھ میں نہ آئیں ۔ مجھے داروغہ عبدالغفور خاں صاحب کے ہاں جانا ہے ۔ راستہ بتائیے ۔" میں نے کہا "چلیے میں بھی ادھر کو جا رہا ہوں ۔ آپ کو وہاں پہنچا جاؤں گا ۔" وہاں پہنچے تو مرزا صاحب کہنے لگے "اگر آپ کو عجلت نہ ہو تو تھوڑی دیر بیٹھ جائیے ۔ آپ سے باتیں کر کے جی خوش ہوتا ہے ۔" میں اُن کے ساتھ مکان کے اندر گیا ۔ وہاں میرے ایک دو ملاقاتی موجود تھے ۔ انھوں نے مجھے "السلام علیکم" کہا تو مرزا صاحب چونکے ۔ کہنے لگے "ایں ! ارے میاں کیا تم مسلمان ہو ؟" اس پر ایک دوست نے بڑھ کر میرا نام و نشان انھیں بتایا ۔ یہ بے چارے اور بھی متحیر ہوئے ۔ معذرت کرنے لگے : "بھئی مجھے خدارا معاف کر دو ۔ کل

رات بھی تمہیں ہندو سمجھ کر میں روزوں کے متعلق یوں گفتگو کرتا تھا جیسے تمہیں کچھ خبر نہیں کہ ان کے قواعد کیا ہیں ۔ اور تم نہ صرف مسلمان نکلے بلکہ مسلمانوں کی جماعت کے ممتاز لوگوں میں ۔ تمہارے پریس میں تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لیے جانے کو تھا کہ تم نے میری کتاب ''شہنشاہ نامہ'' پر عمدہ ریویو لکھا ہے ۔ اور میں نے یہ شکریہ یوں ادا کیا کہ تمہیں ایک معمولی طالب علم سمجھ کر ساتھ گھسیٹے لایا ۔'' میں نے کہا ''آپ کے ساتھ آنا میرے لیے عین راحت ہوا اور آپ سے ملنا میرے لیے موجب عزت ہے ۔ آپ کیا فرما رہے ہیں ۔'' بولے ''میں بار بار اپنے آپ کو ملامت کرتا ہوں کہ میں نے اس سے پہلے کسی سے کیوں دریافت نہیں کیا کہ آپ کون ہیں ورنہ یہ ندامت نہ اٹھانی پڑتی ۔ معاف کیجیے گا ، میں آپ کو ہر مشاعرے میں ، ہر مجلس میں موجود دیکھ کر یہ سمجھتا تھا کہ آپ لاہور کے بیکار جوانوں میں سے ہیں جو ہر جگہ دل بہلانے پہنچ جاتے ہیں ۔ اور اسی لیے کبھی پروا نہیں کی تھی کہ کسی سے پوچھوں ۔'' میں نے کہا ''حضرت اب اس معذرت کو رہنے دیجیے ۔ آپ سے ہم نثر میں باتیں کرنے نہیں بیٹھے ۔ اپنا کلام کچھ سنائیے ۔ مدت سے آرزو تھی کہ ایاز حاصل ہو ، آج موقع ہوا ۔'' انھوں نے کہا ''تازہ غزل جو میرے پاس تھی وہ تو میں نے رات پڑھ دی ۔ اب کوئی چیز سنانے کے لائق موجود نہیں ۔ فکر سخن کی فرصت کہاں ملتی ہے ۔ معلمی کی زندگی شاعری کے لیے سخت ناموزوں ہے ۔'' ایک صاحب جنھوں نے مجھ سے اُن سے ملاقات کرائی تھی ، بولے ''اگر آپ کو مرزا صاحب کا کلام سننا ہے تو یہ نسخہ مجھ سے پوچھیے ۔ کوئی مصرع طرح دے دیجیے اور ابھی بیٹھے بیٹھے کلام سنتے جائیے ۔'' مجھے اس وقت امیر مینائی کی ایک پسندیدہ غزل یاد

آئی جو آن دنوں خصوصیت سے پسند تھی ۔ اور میں نے اس کا یہ مطلع پڑھا :

تڑپا میں جو آنکھوں کو پسند آ گئیں آنکھیں
دل لوٹ گیا ، چوٹ غضب کھا گئیں آنکھیں

مرزا صاحب نے کہا ''خوب مطلع ہے'' میں نے دوسرا شعر پڑھا :

آفت کی سفیدی ہے ، قیامت کی سیاہی
نیرنگ دو عالم مجھے دکھلا گئیں آنکھیں

فرمایا ''بہت خوب'' میں نے تیسرا شعر پڑھا :

اس ناز سے دیکھا کہ ہم کٹ گئے عشاق
ایک ایک کو ایک ایک سے لڑوا گئیں آنکھیں

شعر سنتے ہی پھڑک گئے اور کہنے لگے ''لیجیے ہم بھی چند شعر اس زمین میں کہہ دیتے ہیں ۔'' اور فی البدیہہ کوئی گیارہ شعر کی ایک غزل منٹوں میں کہہ دی ۔ مجھے اس کے دو تین شعر یاد رہ گئے ہیں :

اے شوخ یہ دکھنے جو تری آ گئیں آنکھیں
کیا دل کے دکھانے کا مزا پا گئیں آنکھیں
یہ کہہ گئیں چھٹنے کی نہیں رسم محبت
سمجھے نہیں تم خود بھی جو فرما گئیں آنکھیں
کیوں باغ میں نرگس کے تلے مر گئے ارشد
معلوم نہیں کس کی پسند آ گئیں آنکھیں

اب کیا تھا ، ہمیں گُر معلوم ہو گیا ۔ ایک آدھ شعر کسی کا پڑھ

دیا اور اسی زمین میں ایک غزل سن لی۔ جلال لکھنوی کا دیوان سامنے رکھا تھا۔ اُن کا ایک مصرع "ترک اولیٰ ہوگا یا روزہ قضا ہو جائے گا" مصرع اول کا مضمون تھا کہ ماہ صیام میں ساقی نے دعوت مے دی ہے۔ اب یہ مشکل آ پڑی ہے کہ یا روزہ قضا ہو یا ترک دعوت ہو۔ میں نے مرزا صاحب سے کہا کہ اس پر بھی ایک غزل ہو جائے۔ چنانچہ اس وقت ایک بہت اچھی غزل ہوئی۔ افسوس کے میرے حافظے میں اب اُس کے بھی چند ہی شعر محفوظ ہیں :

نازنیں تو بڑھتے بڑھتے کیا سے کیا ہو جائے گا
ہے ابھی تو بت کسی دن کو خدا ہو جائے گا
میکدے کو چھوڑ کعبے کون جائے واعظا !
وہ بھی اک فرض ضروری ہے ادا ہو جائے گا
تم بنے سنورے ہو اور میں سخت ہوں شکی مزاج
خوف ہے آئینہ صورت آشنا ہو جائے گا
میں تو کہہ دوں صاف اسکے حسن کی کیا شان ہے
پر خداوند دو عالم تو خفا ہو جائے گا

اُس دن سے مرزا ارشد میں اور مجھ میں پیمانِ محبت بندھ گیا۔ اس کے بعد میں انھیں کئی دفعہ فیروز پور میں ملا۔ وہ مجھے لاہور میں ملے۔ اُن کے آتے ہی میں اور کام چھوڑ کر شعر و سخن کی گفتگو شروع کر دیتا تھا اور اُن کے کلام سے محظوظ ہوتا تھا۔ دو آخری ملاقاتیں بھی مزے کی ملاقاتیں تھیں، مگر افسوس یہ معلوم نہ تھا کہ یہ ملاقاتیں آخری ہوں گی۔ جاڑے کے دن تھے، میں صبح کے وقت گھر میں بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا کہ ڈیوڑھی کی طرف سے گانے

کی آواز آئی ۔ ایسا معلوم ہوا کہ کوئی خوش آواز شخص کچھ الاپتا ہوا اُس کمرے کی طرف آ رہا ہے جہاں میں بیٹھا تھا ۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ مرزا صاحب ایک بڑی سی کتاب بغل میں دبے چلے آ رہے ہیں اور یہ شعر سوز و گداز سے پڑھ رہے ہیں :

قبر میں کوئی خبر لینے نہ آیا بعد مرگ
زندگی تک تو بہت تھے چاہنے والے مرے

اُن کو کبھی گاتے نہ سنا تھا ۔ اس سے متعجب ہوا ۔ مجھے بعض لوگوں سے یہ معلوم ہوا تھا کہ فیروز پور میں کبھی کبھی اپنے گھر میں احباب خاص کی بزم مختصر میں وہ اشعار گا کر پڑھتے ہیں ، اور چونکہ فن موسیقی سے با خبر ہیں اور آواز اچھی پائی ہے اس لیے سننے والوں پر بہت اثر ہوتا ہے ۔ لیکن مجھے ادب ہمیشہ مانع رہا تھا کہ میں اُن سے درخواست کروں کہ کوئی چیز لے سے پڑھیں ۔ مجالس میں ہمیشہ تحت اللفظ پڑھتے تھے اور میں اسی کا عادی تھا ۔ اُس دن جو میں نے اُن کی طبیعت کو راگ کی طرف مائل پایا تو میں نے ان سے درخواست کی کہ وہی شعر یا اسی غزل کے اور شعر یاد ہوں تو اسی آہنگ سے سنائیے ۔ چنانچہ انھوں نے مطلع پڑھا :

ہنس کے فرمانے لگے سن سن کے وہ نالے مرے
آپ کب سے ہو گئے ہیں چاہنے والے مرے

اور مقطع تھا :

ضبط الفت کی قسم کھاتا ہوں لیکن کیا کروں
جان کہا جاتے ہیں ارشد پوچھنے والے مرے

یہ غزل میں نے اُس وقت لکھ لی تھی ۔ صرف چند شعر اور تھے

جو ''عزن'' میں چھاپ دیے آہے مگر جو لطف آن شعروں کا بجے مرزا مرحوم کی زبان سے آن کے دلفریب آہنگ میں سن کر آیا تھا آ ہے میں دوسروں تک کیوں کر پہنچاتا - میں نے جی میں کہا کہ اچھا ہوا اس سوال کا تکلف درمیان سے اٹھ گیا اور جب ملوں گا مرزا صاحب سے فرمائش کروں گا کہ کچھ سنائیے مگر ''حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد'' : کاتب تقدیر اسی وقت لکھ رہا تھا کہ جو سن لیا ہے اس کو غنیمت سمجھ اور اسی کی یاد اور تاثر کو دل میں رکھ - پھر یہ بات ترے حصے میں نہیں ہے - اس کے بعد مرزا صاحب نے کہا ''آج تمھارے ہاں ایک کام لے کر آیا ہوں -'' میں نے کہا ''کیا ؟ فرمائیے'' کہنے لگے ''فرمانا کیا ہے - حقیقت یہ ہے کہ تم ہو بڑے خوش قسمت - تمھیں معلوم ہے کہ میں سال بھر سے ارادہ کر رہا ہوں کہ ایک رسالہ جاری کروں اور اس عرصے میں اس کی تیاری میں مصروف رہا ہوں - میرے پاس اس وقت سال بھر کے لیے نظم و نثر کا مسالہ موجود ہے اور سب میرا اپنا لکھا ہوا - رسالہ جاری ہوتا اور لوگوں کے مضامین آتے تو یہ مسالہ کئی سال کو کفایت کرتا اور ظاہر ہے کہ میرا رسالہ تمھارے رسالے کے لیے ایک زبردست غنیم ثابت ہوتا - مگر بعض اسباب سے میرا ارادہ ملتوی ہو گیا ہے اور میں یہ مسالہ تمھارے حوالے کرتا ہوں - ان میں سے کچھ چیزیں ایسی ہیں جو وقتاً فوقتاً 'عزن' میں چھاپ سکو گے اور کچھ ایسی ہیں کہ انھیں علیحدہ کتاب کی صورت میں شائع ہونا چاہیے - ایک صاحب نے اس کتاب کے لیے ایک رقم پیش کی ہے - مگر میں اسے اپنی محنت کا کافی معاوضہ نہیں سمجھتا اس لیے میں نے منظور نہیں کی - تمھیں مفت دیتا ہوں کیونکہ تم اس جنس کے

قدردان ہو اور مال دار نہ ہونے میں میرے بھائی ہو۔ صرف یہ شرط ہے کہ کتاب نہایت نفیس چھپے۔ کوئی سو کاپیاں مجھے دے دینا، دوستوں میں بانٹوں گا۔ اور باقی جانو تمھارا کام۔" میں نے نہایت شکریے کے ساتھ اس شرط کو منظور کیا اور انھوں نے بڑی سی کتاب، جو بغل میں تھی، میرے حوالے کردی۔ میں دیر تک آیسے دیکھتا رہا۔ پھر آسے ایک بیش قیمت خزانہ سمجھ کر میں نے الماری میں بند کردیا اور قفل لگا دیا۔ دوسرے دن مرزا صاحب پھر تشریف لائے کہنے لگے "نواب صاحب بہادر مالیر کوٹلہ کے ہاں سے پیام آیا ہے کہ آپ اور کچھ اپنا کلام سنا جائیے۔ میرے پاس یہاں کچھ اور موجود نہیں۔ وہ کتاب دو تین دن کے لیے مجھے دو۔ میں اسی میں سے انھیں کچھ سنا دوں گا اور پھر تمھاری امانت تمھیں دے دوں گا۔" میں نے کہا "ایسا نہ ہو کہ آپ کی بے پروائی میں یہ کہیں گم ہو جائے اور میں اس سے محروم رہ جاؤں۔" کہنے لگے "نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ میں بحفاظت تمام تمھیں واپس لا دوں گا۔" میں نے کتاب الماری سے نکال کر انھیں دے دی۔ افسوس! مجھے پھر نہ اس کتاب کو دیکھنا نصیب ہوا نہ مرزا صاحب کو۔ وہاں سے آتے ہی وہ ایک عارضۂ دماغ میں مبتلا ہو گئے جس کے آثار ان کے پہلے دن ہی کی باس آمیز گفتگو کے بعض حصوں سے پائے جاتے تھے اس کے بعد میں جلد اس لمبے سفر کے لیے گھر سے چل پڑا اور میری غیر حاضری میں مرزا صاحب رحلت فرما گئے: ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

مجھے معلوم نہیں اس کتاب کی کیا قسمت ہوئی۔ کسی نے مجھے لکھا ہے کہ انھوں نے دریا میں پھینک دی تھی۔ خدا کرے ایسا نہ ہوا

ہو اور اُن کے ورثا کے پاس یہ خزانہ باقی ہو ۔ لیکن اگر ایسا ہوا ہے تو یقیناً ہمارے علم ادب کی بد قسمتی ہے ۔ کئی دفعہ اس کے بہترین مصنفین کا سرمایۂ عمر اس طرح دستبرد زمانہ کی نذر ہو چکا ہے اور اس کی وجہ زیادہ تر ہمارے ملک میں عام طور پر ہنر کی قدر نہ ہونا ہے ۔ بےچارے مصنفین خون جگر کھا کھا کر علمی کام کرتے ہیں اور پھر اتنا بھی یقین نہیں ہوتا کہ کتاب چھپ جائے گی ۔ یا اگر چھپ گئی تو بلانقصان بک جائے گی ۔ اور جب تک یہ حالات بدل نہ جائیں علم ادب میں وہ جان نہیں آ سکتی جو زندہ ، مال دار اور قدردان قوموں کے ادبیات میں ہے اور جن کی ترقی دیکھ کر ہم حیران رہتے ہیں ۔

ارشد مرحوم نہایت خوش خلق اور خوش خو تھے لیکن جب کسی سے ناراض ہو جاتے تھے تو اُن کا غصہ بھی ایسا تھا کہ الامان ۔ دوسرے شعرا کو رقیب سمجھنے میں متقدمین کا نمونہ تھے اور کسی اور کی تعریف اُن کے سامنے کرنا اُنھیں اکثر برہم کر دیتا تھا ۔ اُن کا کلام عموماً شگفتہ ، عام فہم اور سادہ تھا اور اس میں کوئی عیب تھا تو وہ پُرگوئی کا نتیجہ تھا ۔ کلام کو مانجھنے اور بار بار اس پر غور کرنے کی عادت اُن میں کم تھی ۔ سیماب کی سی بےقراری اُن کی طبیعت میں تھی ، اور اسی لیے جو کچھ لکھتے تھے ایک حالت اضطراری میں لکھتے تھے ۔ مگر طبع رسا اور شاعرانہ دل لےکر پیدا ہوئے تھے اس لیے باوجود متاعِ سخن کی سردبازاری کے تمام عمر اسی مال کی تجارت میں گزاری ۔ یہ میں کہہ چکا ہوں کہ انھوں نے سب اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ سب میں یکساں پھولے پھلے ہیں ۔ میرے خیال میں

اُن کی تربیت اور طبیعت دونوں غزل کے لیے موزوں تر تھیں ، اور غزل جب کہتے تھے تو اچھی کہتے تھے - ضروریات زمانہ اور مسدس حالی کی مقبولیت نے اُنھیں قومی مسدس کی طرف مائل کر دیا اور چند قومی مرثیے نہایت عمدہ یادگار چھوڑ گئے ہیں - لیکن یہ میدان حالی پہلے ہی مار چکے تھے اور اس میں کسی اور کی زور آزمائی اُن کے بعد اُن کی شہرت کی برابری نہیں کر سکی - شہیدان کربلا کے دردناک حالات پر بھی مرزا ارشد نے مرثیے لکھے ہیں جنھیں وہ لاہور کی مجالس میں اکثر پڑھتے تھے - مگر اس صیغے میں وہ اپنے دوست میر ناظر حسین خاں ناظم کے مراثی پر سبقت نہ لے جا سکے - کیونکہ میر صاحب کو اس فن میں لکھنؤ کے مشہور با کمالوں سے تلمذ ہے - وہ مرثیے میں غیر معمولی مہارت اور مذہب امامیہ رکھتے ہیں اور مرثیہ اُن کا حصہ ہے - جدید مضامین پر مولانا آزاد کے رنگ میں بھی کچھ نظمیں مرزا ارشد نے لکھی ہیں - مگر وہاں بھی ایجاد کا سہرا مولانا آزاد کے سر پر ہے - تاہم بہ حیثیت مجموعی مرزا صاحب کا کام کسی دوسرے ہم عصر کے کام سے کم قابل قدر نہیں ہے ، اور میں اُنھیں غزل کے اعتبار سے زمانۂ حال کے شعرا کی صف اول میں اور دیگر اصناف سخن میں صف دوم میں جگہ پانے کا مستحق سمجھتا ہوں ، اور یہ آرزو رکھتا ہوں کہ اُن کے صاحب زادے ، اُن کے شاگرد اور اُن کے دوست اُن کے کلام کو مرتب کرنے اور اس حصے کو جو اب تک نہیں چھپا ، چھاپنے کا فرض جلد ادا کریں تاکہ مرحوم کی روح کو خوشی ہو اور لوگ اُن کی قدر کماحقہ پہچانیں -

* * *

پٹنہ اور خان بہادر مولانا شاد[1]

(مخزن، اگست ۱۹۰۳ء، جلد ۷، شمارہ نمبر ۵، صفحہ ۸-۲۳)

ان مقامات میں جو تاریخی شہرت رکھتے ہیں، پٹنہ (عظیم آباد) بھی ہندوستان کے قابل ذکر شہروں میں ہے۔ گو اس کی بہار خزاں سے مبدل ہو چکی ہے مگر اس خزاں میں بھی ایک ایسی ادا اس شہر میں پائی جاتی ہے جو نہایت دل فریب ہے اور یہاں کے لوگ آج تک اس کے قدیم علمی مذاق کی یاد دلاتے ہیں۔ یہاں کے نامور شاعر مولانا شاد قدرتی طور پر اپنے وطن کے دلدادہ ہیں، اور ان کے کلام میں جابجا ایسی بےساختہ توصیف پائی جاتی ہے جو دل نشین ہے۔ "مخزن" کے دربار نمبر میں ایک اردو نظم جناب موصوف کی چھپی تھی جس میں شاعر کے دل پُر درد سے پٹنہ کی قدیم بزرگی کی داستان اور اس کے زوال کا افسوس ناک قصہ درج تھا جس کو بے چشم پُرآب پڑھنا مشکل تھا۔ حال میں ہمیں ان کے چند فارسی اشعار ملے ہیں ان میں بعض عظمائے دکن کے خطوط کے جواب میں، جنھوں نے پٹنہ کی مذمت لکھی تھی، اس شہر کی ان خوبیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جو اب اس گئی گزری حالت میں بھی اس میں موجود ہیں اور ایسے چھوڑ کر دکن یا کسی اور حصۂ ملک میں جا بسنے سے گریز کی گئی ہے۔ وہ ناز کرتے ہیں اور بجا ناز کرتے ہیں کہ گوتم بدھ اسی حصۂ ملک نے پیدا کیا۔ وہ فخر کرتے ہیں اور بجا کہ ہندوؤں کا قدیم

۱۔ خان بہادر شاد عظیم آبادی (ولادت ۱۸۴۶ء، وفات ۱۹۲۶ء/۱۳۴۵ھ) آپ کی یادگار آپ کا مجموعۂ کلام "نغمۂ الہام" ہے جو آپ کے شاگرد حمید عظیم آبادی نے مرتب کیا ہے۔

دارالعلوم بہار میں ہے اور ان کو حق ہے کہ وہ یہ کہیں کہ اب بھی وضعداری میں اہل عظیم آباد کسی سے کم نہیں ۔ بیشتر اس کے کہ اشعار ہدیہ ناظرین ہوں ، تھوڑا سا ذکر مولانا شاد کے مختلف اصناف سخن پر حاوی ہونے کا لکھنا چاہتے ہیں ۔ گو اس سے پہلے بھی ان کے کمالات کا ذکر اس رسالے میں آ چکا ہے لیکن چونکہ "مخزن" کے ذرائع معلومات متعدد ہیں اس لیے یہ گوارا نہیں ہو سکتا کہ ناظرین ایسے باکمال کی زندگی کے زمانے میں آپ کے بعض اوصاف سے ناواقف رہیں ۔

۴۵ سال سے آپ دریائے ناپیدا کنار تصنیف و تالیف کے شناور ہیں ۔ اصناف سخن میں کوئی ایسی صنف نہیں ہے جس میں آپ نے مضامین جدید کے دریا نہ بہا دیے ہوں ۔ علاوہ مختلف قسم کی تصانیف کثیرہ کے ، جن میں رسائل فن معنی و بیان و موازنہ مذاق شاعری اردو زبان ہائے مختلف و امثلہ اشعار اردو و فنون عروض و قوافی و کتب تواریخ و جغرافیہ و ناول وغیرہ شامل ہیں ، تعلیم زبان عربی و فارسی و اردو میں جو نصاب آپ نے تالیف کیا اس میں چھ کتابیں ہیں ۔ کتب مذکورہ کل ساڑھے تین برس کی پڑھائی ہے ۔ اتنی ہی قلیل مدت میں نہایت آسانی سے بچے اردو و فارسی (سب قسم کی عبارت کے ساتھ حتی کہ بالفعل جو دربار ایران میں محاورے رائج ہیں) و عربی ایک فاضل جید کی طرح لکھ پڑھ لیتے ہیں ۔ اصول فقہ اور فقہ میں بہ زبان عربی آپ کا رسالہ "یومیہ علی مذہب الامامیہ" ایک سو صفحوں کا (جس کو آپ نے ایک دن میں تالیف کیا ہے) مشہور ہے ۔ "صورة الجنان" آپ کا مشہور و معروف ناول ہے جس کو آپ نے ۱۸۷۳ء میں ، جب کہ اردو زبان میں ناول کا نام نہ تھا ، تین جلدوں پر مشتمل تصنیف کیا ، جس کی نسبت صاحب ڈائرکٹر سرشتہ تعلیم

نے یہ ریمارک کیا کہ اردو زبان میں آج تک ایسی عمدہ کتاب تصنیف نہیں ہوئی اور مصنف اس کا ایک انڈین ہے وغیرہ وغیرہ۔ نظم میں جیسے آپ قادرالکلام استاد ہیں کچھ وہی سخن سنج جانتے ہیں جن کو اتفاق آپ کے کل کلاموں کے سننے کا ہوا ہے۔ آپ کی قادرالکلامی کی ایک ادنٰی مثال یہ ہے کہ مولوی محمد حسین صاحب آزاد نے آپ کی مثنوی "نوید ہند" کی نسبت بہت سی تعریفوں کے ساتھ یہ کلمہ بھی تحریر کر کے چھپوا دیا کہ ایسی عمدہ نظم اس پاکیزگی زبان، اس استعارے اور دیگر محامد کثیر کے ساتھ نظر سے نہیں گزری۔ حضرت آزاد لکھتے ہیں کہ میں نے چاہا کہ نثر میں انھی خوبیوں کے ساتھ اس کے مضامین ادا کروں مگر نہ ہو سکا۔ یہ ریمارک مشیر، قیصر، اخبار لکھنؤ وغیرہ میں چھپا ہے۔ اردو زبان کی شاعری کے اصل مذاق کی حد قائم کرنے میں آپ نے بیس سال تک کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ انگریزی و عربی و فارسی و بھاشا وغیرہ وغیرہ زبانوں کے انداز اور سب قسم کے مضامین کے تتبع میں آپ نے اردو میں کثرت سے شعر نظم کیے۔ شعروں کے باثر ور سلیس اور معنی خیز بنانے میں خدا جانے کتنا ریاض کیا۔ محاوروں کی چھان بین میں اسد اللہ خاں غالب مرحوم سے لے کر جناب امیر و بحر و میر انیس و مرزا دبیر و میر مونس وغیرہ مشاہیر کملا سے برابر خط و کتابت رہی۔ چنانچہ آپ کے پاس اس کا بھی ایک ذخیرہ جمع ہے۔ اشعار غزل کی معنی خیزی کی اس سے زیادہ کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ جناب مفتی سید عباس صاحب مجتہد سے شخص نے آپ کی غزلوں پر یہ ریمارک تحریر کیا کہ بجائے اوراد و نصائح کے مساجد و منابر پر پڑھنے کے لائق ہیں (حالانکہ بظاہر کل اشعار سلیس اور بپیرایہ مجاز میں ہیں)

آپ کا کلیات قریب نوے جزوں میں ہے ۔ ان سب تصانیف کے ذخیرے کو چھوڑ کر سب سے زیادہ حیرت انگیز و نتیجۂ مشقت و ریاضت شاقہ آپ کے تصنیف کیے ہوئے مولود اور مراثی ہیں ۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ میر انیس نے مرثیہ کے طرز میں جو احاطہ دل پسند کھینچا ہے اس سے تجاوز دشوار ہے ، مگر آپ نے حال کے زمانے کے خیال کے مطابق ویسے ہی رزم و بزم وغیرہ کا عجب مفید و دل کش انداز اختیار کیا ہے کہ سن کر انسان متحیر ہو جاتا ہے ۔ ۱۸۹۷ء میں آپ نے علی گڑھ مدرسۃ العلوم میں جو مسدس مولود پڑھا تھا آج تک سننے والے اس سے متاثر ہیں ۔ چنانچہ اسی صحبت میں مسٹر آرنلڈ صاحب پروفیسر نے یہ فرمایا تھا کہ ایسے عمدہ فلسفی مضامین اسلام کے بارے میں نظم میں سنے نہیں گئے ۔ آپ کے مرثیوں میں، باوجود کثرت مضامین رزم و بزم و رخصت و آمد وغیرہ وغیرہ کے ، خلاف فطرت و خلاف واقعات تاریخی و روایات صحیحہ و خلاف صبر و استقلال و شان اہل بیت اظہار ایک حرف بھی نظم نہیں ہوتا ۔ باوجودیکہ کثرت ریاضت و دوام امراض نے آپ کو ضعیف کردیا ہے لیکن ہزارہا آدمیوں کی مجلس میں جس شد و مد سے آپ تین تین گھنٹے تک مجلسیں پڑھتے ہیں ، سننے اور دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے ۔ جن سخن فہم و سخن شناس بزرگوں نے سال گزشتہ اور اس سال کے محرم میں دسوں دن آپ کو سنا ، اتفاق سے آن میں سے چند ایسے بھی بزرگ ہیں جنھوں نے اسی امام باڑے میں برابر میر انیس مرحوم کو بھی سنا ہے ۔ ان سب صاحبوں کا یہ بیان ہے کہ کسی طرح سے اور کسی حالت میں یہ مجلسیں میر انیس کی مجلسوں سے کم نہ تھیں ۔ پرانے حضرات تو اس سے کمال خوش ہیں کہ برخلاف امید

پھر ہندوستان میں خدا نے میر انیس کو پیدا کردیا ، اور نئے ذی علم بزرگواروں کو اس کا فخر ہے کہ اول تو انھوں نے ایسے شخص کو مِن لیا جس کے بارے میں پرانے حضرات ہوبہو میر انیس کی مثال دیتے ہیں ۔ دوم مرثیوں میں خاص کر جن چیزوں کی ضرورت تھی وہ کل محاسن ان مرثیوں میں پائے جاتے ہیں ۔ جن بزرگوں نے ''معارف'' میں آپ کے مرثیے کے بند ملاحظہ کیے ہیں انھی سے پوچھنا چاہیے کہ آپ کے مرثیوں کا کیا طرز ہے اور کیسے مضامین ہیں ۔ اگر خدا نے چاہا تو ہم بھی ''مخزن'' میں کبھی کبھی آپ کے مرثیوں کے بند چھاپنے کا وقتاً فوقتاً فخر حاصل کریں گے ۔ بہت مشکل ہے کہ زمانہ اب ایسے باکمال ، قادرالکلام ، فخرِ روزگار کو قوم میں پیدا کرسکے ۔ اکثر اہلِ علم اور زبان دانوں کا قول ہے ، چنانچہ جناب مولوی سید محمد خاں صاحب بہادر ڈپٹی کلکٹر و مجسٹریٹ نے جلسہ مسلم انسٹی ٹیوٹ کلکتہ میں اپنی تقریر میں یہ کلمہ فرمایا کہ جس شخص نے فی زمانِنا مولانا شاد کو نہیں سنا اور آپ کے کمالات سے مطلع نہیں ہوا اس کو خود اپنے حال پر افسوس کرنا چاہیے ۔ جناب میر خورشید علی صاحب نفیس مرحوم سے باکمال بزرگ نے آپ کی نسبت ایک مجلس میں یہ فرمایا کہ جس شخص نے اس باکمال کی زیارت کی اس کو فخر و مباہات کرنا چاہیے ۔ یہ بھی انھوں ہی نے ارشاد فرمایا تھا کہ حضرات ! جناب والد ماجد (یعنی میر انیس مغفور) سے کسی طرح آپ کی زبان کم نہیں ہے ۔ بلکہ جناب والد ماجد کو مرثیوں میں یدِ طولیٰ تھا اور آپ کو ساتھ ایسے بےمثل مراثی کے قریب قریب کل اصناف نظم میں یدِ طولیٰ ہے ۔ ایسے ایسے فخرِ روزگار بزرگوں سے ایسی رائے حاصل کرنا نہایت نادر بات ہے اور ہم

مولانا شاد کو مبارک باد دیتے ہیں کہ ان کو کملوں سے داد سخن ملی ہے - ہماری آرزو ہے کہ کبھی وہ پنجاب میں تشریف لاویں اور اہلِ پنجاب ان کا کلام ان کی زبان سے سنیں :

قطعۂ فارسی

چنیں داد پندم یکے از حکیماں
جہاں دیدۂ بخرد و پختہ رائے

سفر کردن از موطنت شاد اولیٰ
نہ موطن بود بلکہ وحشت سرائے

چو اصطبل خر جملہ سوقش پُر از گل
بہ ہر کوچہ بنہادہ خروار لائے

حذر از سراشیب و از گرد راہش
اماں از غبارے کہ خیزد ز جائے

مفالینہ پوش است ہر خانۂ او
دکاکین نہ بست او جاں گزائے

نہ با روح ویرانہ ہا و مقابر
نہ آبادیش را میسر فضائے

ز بازار ہائے عفن مرگ خیزد
نشستہ بہر گوشہ ہایش وبائے

جوانے گرش اشتہا زور آرد
کند قُرص خورشید را ناشتائے

اگر رو بہ راہے نہد پیر از جا
جز آہے بہ دستش نہ آید عصائے

نہ زیبا نگارے کہ زاہد فریبد
نہ خلوت نشینے نہ صورت نمائے

ز اموات کنکائے آو آب شوئی
ز قاز و ز چهه ہائے آو شور ہائے

نہ باغ مطرّا نہ راغ مہنّا
نہ میش مہیّا کہ دارد بقائے

نہالان باغش گدایان مسکیں
نہ بر سر کلاہے نہ در بر قبائے

نہ منت گزارے نہ احساں شناسے
نہ شکرانہ ، نے بہ لب مرحبائے

زباں آوراں را بہ لب ہجو مردم
سخن ساز ہا را بہ دل افترائے

نہ سگ ہائے غوغا کنش را علاجے
نہ بہر لعیب کلاغش دوائے

نہ دیبا لشینے کے از اہل دنیا
نہ گسترده دیں طالبے بوریائے

نہ نان کرم ہائے شاں را لعیبے
نہ خوان نعم ہائے شاں را صلائے

ز سکان آو ہر یکے رو بہ راہے
نہ شہرے جہازیست نے ناخدائے

نہ کہسار و تالاب بہر تفرّج
نہ تازه عمارت نہ کہنہ بنائے

نہ دلاک۱ و قصار و حجام در وے
نہ قناد و طباخ و نے نالوائے
نہ صدر اعظمے نہ مدارانمہائے
نہ قیصر نہ بز آنر و ویسرائے
نہیچے اگر سر زند از حمارے
جز احسنت اصلاً نہ خیزد صدائے
نہ راند کسے بر زبان جز ملامت
بر آرد اگر عندلیبے نوائے
بگفتم بدو ہرچہ گفتی مسلم
نہ رانم بہ لب حرف چون و چرائے
حکایت ز من پرس تا با تو گویم
ازیں کہنہ دیروز دیرینہ جائے
چو او پیر معمورۂ کم بر آید
ز پارینہ دفتر برآرم گوائے
ہمالا سہ صد قرن عمرش سرآمد
بود بانی آو پٹن نام رائے
شکست از مہانند آو خورد و برگشت
سکندر کہ بودست گیتی خدائے
ز اہل مذاہب یکے بودہ باشد
کزیں شہر ما کرد نشو و نمائے
مورخ لک آرایہ ہا دید اینجا
ز لعل گران ارز و بے غش طلائے

---

۱ - اہل زبان دلاک حجام کو ، قصار دھوبی کو ، قناد حلوائی کو ، طباخ باورچی کو اور نالوا نانبائی کو کہتے ہیں ۔

بهار است دارالعلوم ہنودان
که نامے برآورده در ابتدائے

دهنتر حکیمے است از بومیانش
که بیدک برآورده از فکر و رائے

ازیشان یک ایجاد کردست شطرنج
که بشمرد فرد وبیش از کیائے

ز پرسیت احوالِ این شهر برهم
که سالم نه ماند است آو را قوائے

نه ضعف قوائیش چه سازی ملامت
ز پیرانِ فرتوت آخر حیائے

چه رانم سخن از امیران اینجا
که ہرکس کریمے است و حاجت روائے

تواضع ز اخلاق ہرکس ہویدا
تو گوئی که بنشسته مسکین گدائے

نه استاده میر غضب پیش روئے
نه بنهاده بر پشت خود متکائے

جفا پیشگی از لئیمان مسلم
ولے از کریمان نه بینی دغائے

ز گنگا چه رانی سخن پیشِ روئم
گره بسته در موج ہایش شفائے

کند روسی از شستنش زنگیان را
عجب آب پاکیزهٔ با صفائے

غبارِ ره و گل زمین ہائے موطن
به چشمِ حقیقت بود توتیائے

چه دُر ہا کزیں خاک بیروں نہ آمد
چو تحقیق[1] و چوں بیدل [2] نکتہ رائے
چو راسخ[3] در اردو زباں شیخ وقتے
چو فرہاد[4] روشن دل و رہ نمائے
چو شادِ ہنر سنج ، کامل عیارے
سخن دان ، دانش ور و خوش نوائے
صفاہاں و شیراز در خانہ اش ہیں
بہ چشمِ حقیقت بکش توتیائے
عدالت شعارا ! جہاں سرفرازا !
در اردو رسیدست کارش بجائے
ز خیلِ تلامیذ خود ہر یکے را
عطا کردہ استؔ از فصاحت لوائے
بیا مدرس[5] سیف خاں را نظر کن
مصفّا تـر از سینۂ پارسائے
عجب سبززارے لبِ گنگ دلکش
عجب مسجد و گنبدِ عرش سائے

---

۱ - مُلا علی تحقیق تخلص ، علی وردیخاں مہابت جنگ مشہور صوبہ دار کے زمانے میں ایک باکمال شاعر عظیم آباد میں تھے -

۲ - عبدالقادر بیدل مشہور باکمال شاعر پٹنہ ہی کے تھے -

۳ - شیخ غلام علی راسخ خاص عظیم آباد کے رہنے والے تھے -

۴ - جناب سید شاہ الفت حسین فرہاد تخلص ، مصنف کے استاد ، پٹنہ ہی کے بے مثل و نظیر شاعر تھے -

۵ - مدرسہ سیف خاں پٹنہ میں مشہور جگہ ہے -

ز منگلس[1] تالاب از من چہ پرسی
بود گلبنِ باغِ آو غم زدائے

اگر خانہ[2] گرد بینی بگوئی
نہادست قدرت بر ارضے سمائے

ازیں خوبیِ موطنم نیز بگزر
بپا ہست زنجیر شرم و حیائے

غذا زندگی آورد آدمی را
ولے ناگوار است بے اشتہائے

طلب تا نہ سازند از جا نہ خیزم
کہ ہر جاست بامن ہمیں یک خدائے

نہ نامم قبولیست سرتاجِ عالم
نہ بامم امیریست کشور کشائے

نہ من گلبنِ باغِ شاہِ شہیلم
نہ من رستم از شاخ زین العبائے

نہ خواہم کہ مردم بگویند آمد
نہ دریوزگی شاعرِ بے نوائے

★ ★ ★

۱ ۔ منگلس تالاب بھی مشہور سیرگاہ ہے ۔
۲ ۔ خانہ گردگول گھر والا مکان ہے ۔

نواب سر سید راس مسعود[1]

(شیخ عبدالقادر نے نواب مسعود جنگ سرسید راس مسعود کی وفات پر مندرجہ ذیل تاثرات قلم بند کیے اور رسالہ 'اردو' کے مسعود نمبر (اکتوبر ۱۹۳۷ء) کی زینت بنے - شیخ عبدالقادر اس زمانے میں ممبر کونسل آف اسٹیٹ فار انڈیا تھے) -

مسعود اگر باپ یا دادا کی عمر پاتے تو نہ جانے کہاں تک پہنچتے ، مگر انھوں نے وہ منزلیں جو بڑوں نے بڑی عمر میں طے کی تھیں ، جلد جلد طے کر ڈالیں اور اس چند روزہ دنیا کی آخری منزل کو اچانک جا لیا - ضعیفہ ماں جس کی عمر کا سہارا وہی تو ہے ، ماتم کرنے کو رہ گئی - نو عمر بیوی جس کو بیاہے دیر نہیں ہوئی تھی ، بیوہ ہوگئی - ایک ننھی بچی جو ابھی دنیا میں آئی تھی اور باپ کو پہچاننے بھی نہ پائی تھی ، یتیم ہوگئی - بڑی ہوگی تو سنے گی کہ کس باپ کی بیٹی ہے - دو بیٹے جو پہلی بیوی سے تھے ، باپ کی بہترین نشانیاں ہیں اور اس کی بہت سی صفات کے وارث - ان سب کے رنج و اندوہ میں ان کی ساری قوم اور ملک کا بیشتر حصہ شریک غم ہے - جابجا ماتمی جلسے ہوئے ، اخباروں میں ملک کے اس سپوت کے غم میں نظم و نثر کے نوحے لکھے گئے - علمی و ادبی حلقوں میں 'مسعود'

---

۱ - نواب مسعود جنگ سر سید راس مسعود (۱۵ فروری ۱۸۸۸ء — ۳۱ جولائی ۱۹۳۷ء) ماہرِ تعلیم ، ادیبوں اور شاعروں کی مربی - تصانیف : انتخابِ زریں ، نصابِ اردو ، خطوطِ سرسید ، جاپان کا تعلیمی نظم و نسق -

کا نام دیر تک زندہ رہے گا اور ادب و احترام سے لیا جائے گا ۔ مگر قوم جو ایسے قابل فرد کی خدمات سے بے وقت محروم ہوگئی ہے ، اس کے نقصان کی تلافی نہیں ہو سکے گی :

جو گیا اس کا کوئی قائم مقام آیا نہ پھر

مرحوم زبان اردو کے دلدادہ اور ادب اردو کے قدرداں تھے ، اس لیے ان کے پرانے دوست اور مداح مولوی عبدالحق نے ، جو اس زمانے میں اردو کو مخالفین کی زد سے بچانے کے لیے سب سے بڑھ کر سینہ سپر ہیں ، "رسالۂ اردو" کی ایک اشاعت سر راس مسعود کی یاد کے لیے وقف کی ہے ، اور ان دوستوں سے جو مرحوم کو جانتے تھے مضامین طلب کیے ہیں ۔ مجھے بھی کچھ لکھنے کو کہا گیا ہے ۔ میں نے مرحوم کو چند مرتبہ دیکھا ،مگر ایسے حالات میں اور ایسے وقتوں پر کہ ان چند ملاقاتوں کا گہرا نقش دل پر باقی ہے ۔ دیکھیں وہ نقش کس حد تک الفاظ میں منتقل ہو سکتا ہے ۔

میں نے سب سے پہلے مسعود کو ان کے بچپن میں دیکھا ، جب ان کے جلیل القدر دادا سرسید مرحوم ان کو گلے سے لگائے ہوئے تھے ۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے ، سنہ ۱۸۹۵ع یا ۱۸۹۶ع کی کانفرنس تھی ، سرسید ایک خیمے میں تھے اور ان کا یہ ہونہار پوتا ان کے ساتھ پلنگ پر لیٹا ہوا تھا ۔ دادا کے دل میں اپنے ملک اور قوم کی خدمت کی جو لگن تھی وہ پوتے کو سینہ بہ سینہ پہنچی ، اور یہ اس بزرگ کی صحبت کا فیض تھا کہ مسعود کی زندگی کا ہر زمانہ مسعود رہا ۔

اس کے بعد میں نے سید مسعود کو پھر انگلستان میں دیکھا

جب ان کا بچپن مبدل بہشباب ہو چکا تھا اور وہ مسٹر تھیوڈور ماریسن[1] کے سایۂ عاطفت میں تعلیم پانے کو آئے۔ مادی ماریسن صاحب جب علی گڑھ میں پڑھاتے تھے، انھیں سرسید سے گہری عقیدت تھی۔ انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ سرسید مرحوم پوتے کو کس قدر چاہتے تھے اور اس سے کیسی کیسی اُمیدیں رکھتے تھے۔ اس لیے انھوں نے بہت خوشی سے مسعود کی خبرگیری اپنے ذمے لی اور انھوں نے اور ان کی بیوی نے مسعود کی بہتری کے لیے ایسی کوشش کی جیسے اپنے بیٹے کے لیے کرتے۔ مسعود کی ذات میں مشرق اور مغربی دونوں تربیتیں جمع تھیں، اور کیا انگریزی، کیا ہندوستانی جو ان سے ملتا تھا مانتا تھا کہ دونوں تہذیبوں کا پورا رنگ مسعود میں ہے۔

اسی زمانے میں مجھے آکسفورڈ کی یونیورسٹی کو دیکھنے کے لیے جانے کا اتفاق ہوا۔ مسعود وہاں تھے اور طلبہ اور اساتذہ دونوں میں ہردل عزیز تھے۔ انھوں نے نہایت محبت سے وہاں کے بعض کالج مجھے دکھائے اور وہاں کے مشہور کتب خانے میں مجھے لے گئے۔ اس کے نادر قلمی نسخے مجھے دکھاتے تھے اور ایسے خوش ہوتے تھے کہ جیسے کتاب گھر ان کا اپنا ہے۔ پھر وہ مجھے اپنے کالج کے ایک استاد کے ہاں دوپہر کے کھانے کے لیے لے گئے جہاں اور بھی بہت سے علماء تشریف رکھتے تھے۔ دیر تک بے تکلف علمی صحبت رہی جس کا لطف اب تک یاد ہے۔

آکسفورڈ کی پڑھائی سے کامیابی کے ساتھ فارغ ہو کر مسعود

---

۱ - جنھیں بعد میں "سر" تھیوڈور ماری سن کا خطاب ملا تھا۔

ہندوستان آئے ـ گو آنے سے پیشتر بیرسٹری کی سند بھی حاصل کر لی تھی اور اگر چاہتے تو وکالت میں ہزاروں روپے پیدا کرتے یا اپنے باپ جسٹس سید محمود کی طرح جج ہوتے ، مگر انھوں نے آنکھ کھولتے ہی اپنے دادا کی تعلیمی خدمات کی شان دیکھی تھی اس لیے تعلیم کی خدمت کو اپنا نصب العین بنایا اور محکمۂ تعلیم سے تعلق پیدا کیا ـ کچھ عرصہ انگریزی حکومت میں کام کرنے کے بعد ان کی خدمات حیدر آباد دکن کے محکمۂ تعلیم نے انگریزی حکومت سے مستعار لے لیں اور وہ تھوڑے عرصے میں وہاں محکمۂ تعلیم کے افسر اعلٰی ہوگئے ـ اور اعلٰی حضرت حضور نظام خلد اللہ ملکہ کی مردم شناس نگاہوں نے ان کا کام اس درجہ پسند کیا کہ انھیں انگریزی ملازمت سے قطع تعلق کر کے حیدر آباد سے مستقل تعلق پیدا کرنا پڑا اور اعلٰی حضرت نے ان سے وعدہ کیا کہ ان کے حقوق پنشن جیسے انگریزی ملازمت میں ہوتے حیدر آباد میں اس سے بہتر ہوں گے ـ چنانچہ جب وہ علی گڑھ آتے وقت وہاں سے جوانی ہی میں مستعفی ہوئے تو انھیں ایک ہزار روپے ماہوار پنشن دی گئی ـ

حیدر آباد کی عہدہ داری کے زمانے میں مجھے پھر مسعود کو دیکھنے کا موقع ملا ـ میں چند روز کے لیے حیدر آباد گیا تھا ـ مسعود سے ملنے گیا ـ مولوی ـ عبدالحق ہمراہ تھے ـ میں نے دیکھا مسعود جدت اور قدامت کا جامع ہے ـ خیالات بہت سے نئے ، عادات بہت سی پرانی ، تعلیم کے طریقوں میں نئی سے نئی تجویزوں کی حمایت کے لیے تیار ، سائنس کی جدید ترقیوں کو جلد اپنے طلبہ کے لیے آسان کرنے کا خواہاں ، مگر اپنی آسائش کے لیے ایک تخت چوبی پر ایک بڑا سا نرم گدا بچھا کر اور اس پر تکیے رکھ کر متمکن ، اپنے ملنے والوں سے

جو اسی نشست کے پاس کرسیوں پر بیٹھے تھے ، بے تکف باتیں کررہا تھا ۔ اسی طرح کھانے کی میز پر دیسی کھانے انگریزی سلیقے سے برتائے جاتے تھے اور چھری کانٹا بھی موجود تھا اور شوربا چپاتی بھی ۔ اس صحبت میں دیر تک اور باتوں کے علاوہ اردو کی خوبیوں اور اس کی ترقی کے امکانات پر دل چسپ گفتگو رہی ۔

پھر کئی سال تک مجھے سید مسعود کو دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا ۔ لیکن سنہ ۱۹۲۹ء میں کچھ مہینوں کے لیے میں دہلی میں مقیم تھا ۔ وہاں مسعود یونیورسٹیوں کے ایک جلسے میں شریک ہونے کو آئے میں نے ایک شام انھیں کھانے پر بلایا ۔ پانچ چھ اور دوست بھی تھے ۔ میں نے سنا تھا کہ اگر ان کی طبیعت حاضر ہو تو ان کو ایسی دلچسپ حکایتیں اور لطیفے یاد ہیں کہ لوگ ان کے حافظے ، خوبی' بیان ، اور ظرافت کو دیکھ کر محو حیرت رہ جاتے ہیں اور یہی ہوا ۔ دو گھنٹے کے قریب وہ پُرلطف صحبت رہی کہ جو کوئی شریک دعوت تھا مدتوں یاد کرتا رہا ۔ اس سے دوسرے دن پچھلے پہر ایک بڑی پارٹی چائے کی تھی ۔ اس میں بہت سے انگریز بھی تھے اور ہندوستانی بھی ۔ میرے ساتھ ایک انگریز بیٹھا تھا ۔ اس کی برابر کی میز پر مسعود تھے اور کچھ اور صاحبان ۔ میرے ساتھی نے مجھ سے کہا کہ برابر کی میز پر جو ہندوستانی بیٹھا ہے ، سر راس مسعود ، اس کو جانتے ہو ؟ میں نے کہا ہاں جانتا ہوں ۔ اس نے کہا دو تین دن ہوئے یہ شخص ایک کھانے پر میرے قریب بیٹھا تھا ، میں نے اس سے باتیں کرنے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوا اور وہ زیادہ وقت چپ چاپ بیٹھا رہا جیسے بات کرنا نہیں چاہتا ۔ میں نے کہا کوئی سبب خاموشی کا ہوگا ورنہ کل رات میرے ہاں یہی شخص

بلبل کی طرح چہکتا رہا اور سب اس کی گفتگو سے محظوظ ہوئے۔
اصل بات یہ تھی کہ انگریزوں کے بارے میں مسعود کی یہ حالت تھی کہ جہاں اسے کسی شخص سے ذرا بھی غرور کی بُو آتی تھی اس سے وہ خود بھی کھنچ جاتا تھا کیونکہ اس کی طبیعت بہت خود دار اور آزادی پسند تھی۔ لیکن جو اس کو دوست رکھتے تھے انہیں وہ دل سے دوست رکھتا تھا اور ان کے حلقوں میں بھی اسے بہت مقبولیت حاصل تھی۔ سرسید احمد خاں مرحوم کے متعلق مولانا حالی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اور لوگ انگریزی داں ہوں گے، وہ انگریز داں تھا۔ یہی صفت مسعود میں تھی۔ وہ اچھا انگریز داں تھا۔ بارہا انگریز اس کے ماتحت کام کرتے رہے اور اس کے تعلقات ان سے یگانگت کے رہے۔ اسے انگریز یا ہندو کسی سے تعصب نہ تھا مگر ہر شخص کے ذاتی خصائل کے لحاظ سے اس کے دل میں درجہ بدرجہ جگہ تھی۔

دہلی کی اس ملاقات کو پھر کئی برس گزر گئے، تو ان سے پھر لاہور میں ملنا ہوا جب وہ پنجاب کی ایک تعلیمی مجلس کی دعوت پر وہاں آئے تھے۔ اس میں انہوں نے ایک نہایت مفید اور کارآمد تقریر کی جو بے حد پسند کی گئی۔

اس کے بعد علی گڑھ میں ان سے ملاقات ہوئی۔ کیا خبر تھی کہ وہ آخری ملاقات ہوگی۔ وہ اس وقت مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے، اور یونیورسٹی کو ان کے دست ہمت نے گرنے سے بچا لیا تھا۔ اس گھر میں رہتے تھے جہاں بیٹھ کر ان کے مرحوم دادا نے کارفرمائی کی تھی۔ انہوں نے مجھے یونیورسٹی کی کونسل کے ایک ضروری جلسے میں شریک ہونے کے لیے بتاکید بلایا اور باصرار اپنے

ہاں ٹھہرایا ۔ سوئے اتفاق انھی دنوں میں ان کو درد کمر کا سخت دورہ ہوگیا ۔ اُس وقت ان کی زبردست قوت ارادہ کا اندازہ ہوا ۔ کونسل کا جلسہ اہم تھا ۔ اس میں بہت امور فیصلہ طلب تھے اور ان کی ذاتی موجودگی ضروری تھی ۔ ڈاکٹر نے کہا جلسہ ملتوی کر دو مگر مسعود نے کہا کہ جلسہ ملتوی نہیں ہوگا ۔ ڈاکٹر سے کہا کہ بجلی سے کچھ گرمی پہنچا کر یہ کوشش کرے کہ درد قابل برداشت ہو جائے ، اور وہ تھوڑی دیر اٹھ کر بیٹھ سکیں اور جلسے کی صدارت کے فرائض انجام دیں ۔ بجلی لگائی گئی اور اس کے بعد ایک آرام دہ کرسی پر بیٹھ کر اور تکیوں سے دکھتی ہوئی کمر کو سہارا دے کر مسعود نے اپنے فرائض منصبی ادا کیے ۔

دوسرے دن طبیعت کچھ بہتر ہوگئی ، گو ابھی پورا افاقہ نہیں ہوا تھا ۔ اس دن مولوی عبدالحق مع چند اور احباب کے آنے والے تھے ۔ مولوی صاحب کا اردو کی حفاظت کے لیے دکن سے شمالی ہند پر پہلا حملہ تھا اور اس کی تدبیر کے متعلق وہ سر راس مسعود سے مشورہ کرنے آ رہے تھے ۔ اسی دن پھر مسعود نے باوجود علالت کے اثرات باقی ہونے کی پوری سرگرمی سے اس مجلس مشاورت میں حصہ لیا ۔ میں آیا تو مرحوم نے وعدہ لیا کہ جب کبھی وہ یونیورسٹی کے کام کے لیے مجھے بلائیں تو میں اور کاموں کو چھوڑ کر آؤں اور ان کا ہاتھ بٹاؤں گا ۔ مگر پھر بلاوے کی نوبت نہ آئی ۔ وہ اس کے بعد جلد ہی یونیورسٹی سے رخصت ہوئے اور میں انگلستان کو روانہ ہوا ۔

سنہ ۱۹۳۴ء کے شروع کا واقعہ ہے کہ ایک معاملہ پر سید مسعود کی تجویز کو بعض اراکین یونیورسٹی نے کثرت رائے

سے مسترد کر دیا ۔ جس شخص کے متعلق وہ تجویز تھی ، مرحوم کے نزدیک اس کا علی گڑھ میں رہنا یونیورسٹی کے لیے مفید تھا ۔ انھوں نے محسوس کیا کہ ایک جماعت ، جو بعض وجوہ سے ان کی مخالف تھی ، اس کی کوشش اس معاملے کے پس پردہ کام کر رہی ہے ۔ انھوں نے اس طرز سلوک کو اپنے ساتھ ناانصافی سمجھا اور وہ وائس چانسلر کے عہدے سے مستعفی ہوگئے ۔ میں نے انھیں خط لکھا کہ وہ استعفیٰ واپس لے لیں ۔ بے شمار اور دوستوں نے بھی کوشش کی مگر وہ ایسے دل برداشتہ ہوئے کہ باوجودیکہ علی گڑھ سے ان کو دلی آنس تھا اور اس کے در و دیوار سے اُلفت تھی ، وہ وہاں سے چل پڑے ۔

اب نہ آؤں جو کرے میری خوشامد بھی وطن
کہ پکارا ہے غریب الوطنی نے مجھ کو
(امیر مینائی لکھنوی)

سید مسعود اور ان کے بزرگ دہلی کے رہنے والے تھے ۔ مگر انھوں نے علی گڑھ کو اپنا وطن بنا لیا تھا ۔ سرسید مرحوم کا وہیں کالج کی مسجد کے احاطے میں مزار ہے ۔ مسعود کی والدہ محترمہ وہیں مقیم تھیں ۔ مگر ان کے لیے اب وہاں رہنا خوش گوار نہ تھا ۔ خدا خوش رکھے ہزہائی نس فرمانروائے بھوپال کو کہ انھوں نے اس گوہر علم کو اپنی ریاست کی کلاہ کی زینت بنایا اور بھوپال میں بلا کر وزارت تعلیم کا قلم دان ان کے سپرد کیا ۔

میرے انگلستان آنے کے بعد مسعود ایک دفعہ کچھ دنوں کے لیے وہاں آئے مگر اس قدر آزردہ اور دل شکستہ تھے کہ کسی

سے نہیں ملے ، اور بہت کم لوگوں کو معلوم ہوا کہ وہ کہاں ٹھہرے ہیں ۔ اس سال یہ خبر ملی تھی کہ وہ اگلے برس یہاں آئیں گے ، اور میں مشتاق تھا کہ ان سے پھر ملیں گے اور کھل کر باتیں ہوں گی مگر مشیت ایزدی کہ وہ چل بسے اور اس دنیا کی چند روزہ زندگی کو ختم کرکے پھر دادا کے سینے سے لگ کر جا سوئے ہیں ۔ علی گڑھ کی مسجد میں تعلیم کے دونوں بڑے حامی ، جن کے دل میں مسلمانوں اور ہندوستانیوں کو آگے بڑھانے اور خوش حال رکھنے کی تڑپ انھیں ہمیشہ بے قرار رکھتی تھی ، اب آغوش لحد میں لیٹے ہیں اور ان کے مزار زبان حال سے کہہ رہے ہیں :

زمن بہ جرم تپیدن کنارہ می کردی
بیا بہ خاک من و آرمیدنم بنگر

* * *

میاں محمد شاہ دین ہمایوں[1]

رسالہ ''ہمایوں'' آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب مرحوم متخلص بہ ہمایوں[2] کی ادبی خدمات کی موزوں یادگار ہے۔ میاں صاحب موصوف بہت سی صفات کے جامع تھے۔ پنجاب کی چیف کورٹ کے سب سے پہلے مسلمان جج اور کچھ عرصہ کے لیے چیف جج کی حیثیت سے عدالت اور قانون کے میدان میں انھوں نے بہترین شہرت حاصل کی اور شاندار روایات ودیعت کی ہیں۔ مگر ان کے جس کام نے ملک و قوم کے دلوں پر گہرا نقش چھوڑا ہے وہ ان کی ادبی خدمات ہیں۔ تحریر و تقریر میں وہ نہ صرف خود بہت ممتاز تھے بلکہ اور لوگوں کے ادبی شوق کو ترقی دینے میں ان کا معتدبہ حصہ تھا۔

میاں صاحب پہلے اپنی عمدہ انگریزی دانی اور انگریزی زبان میں خوبیٔ تقریر کی وجہ سے مشہور ہوئے اور پھر اردو تقریروں میں انھوں نے نام پیدا کیا۔ وہ فصیح تھے مگر جوشیلی تقریر نہیں کرتے تھے۔ ان کی تقریر کے وقت یہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے آب رواں چل رہا ہے، مگر آس پاس کی رفتار میں شور و غل نہ تھا۔ جب وہ

۱۔ ہمایوں جنوری (سالگرہ نمبر) ۱۹۳۶، ص ۳ تا ۵۔

۲۔ میاں محمد شاہ دین ہمایوں (ولادت ۲ اپریل ۱۸۶۸ع — وفات ۲ جولائی ۱۹۱۸ع)، اعلیٰ پائے کے شاعر جنھیں علامہ فصیح کا خطاب ملا۔ شعلہ بیان مقرر، جج عدالتِ عالیہ، 'مخزن' کے اولین مضمون نگار، بانی ینگ مینز محمڈن ایسوسی ایشن۔ مجموعہ کلام 'جذبات ہمایوں' جو ان کے صاحب زادے میاں بشیر احمد مرحوم نے مرتب کیا تھا، آپ کی یادگار ہے۔

انگلستان سے واپس آئے تو میں ابھی ہائی سکول میں پڑھتا تھا ۔ یہ سن کر کہ وہ انگریزی میں اسلام پر لیکچر دیں گے ، میں ان کا لیکچر سننے گیا ۔ اس پہلی تقریر کی لذت میرے کان اب تک نہیں بھولے ۔ لب و لہجہ دل کش ، الفاظ دل نشیں اور مطالب پُر مغز ، سامعین گرویدہ ہوگئے ۔

لاہور میں قیام کے کچھ عرصے بعد میاں صاحب نے کالجوں کے نوجوان طلبہ کو ایک دن اپنے ہاں جمع کیا اور ایک مجلس[1] قائم کی ۔ اس کے جلسے کئی سال تک ان کے بنگلے میں ہوتے رہے اور وہ فرائضِ صدارت انجام دیتے رہے ۔ اس سوسائٹی کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان طلبہ کو انگریزی میں اچھی تقریریں کرنے کی مہارت ہو جائے اور وہ مفید علمی اور اصلاحی مضامین پر طبع آزمائی کریں ۔ اس مقصد کے حصول میں میاں صاحب کو خاطر خواہ کامیابی ہوئی اور انھوں نے بہت سے نوجوانوں میں خدمتِ قوم کا شوق پیدا کر دیا ۔ جب کوئی مضمون اس مجلس میں پڑھا جاتا تھا تو اس کے بعد حاضرین میں سے جو چاہے اس پر رائے زنی اور بحث کرتا تھا اور اخیر میں صدر جلسہ اپنے خیالات کا اظہار کر کے شرکائے جلسہ کی رہنمائی کرتے تھے ۔ میں بھی اتنے میں کالج میں داخل ہو گیا تھا اور ان جلسوں میں اکثر شریک ہوتا تھا مگر چونکہ بہت سے مقرر مجھ سے اوپر کی جماعتوں کے طالب علم تھے، میں مباحثے میں شریک ہونے سے جھجکتا تھا ۔ چند دوستوں کے اصرار سے ایک دن میں نے بحث میں حصہ لیا ۔ اس دن میاں صاحب سے میری ملاقات ہوئی ۔ جلسہ ختم ہوتے ہی میاں

۱- اس مجلس کا نام ''محمڈن ینگ مینز ایسوسی ایشن'' تھا ۔

صاحب اُس طرف آئے جہاں میں تقریر کے بعد جا کر بیٹھا تھا اور انھوں نے میری حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا :

''آپ نے یہ ظلم کیا کہ اس سے پہلے تقریروں میں شریک نہیں ہوئے۔ اب چاہیے کہ ہر جلسے میں تقریر کریں اور اس مجلس کے لیے وقتاً فوقتاً مضامین لکھیں۔''

چنانچہ جو سلسلۂ مضامین میں نے انگریزی میں اس وقت کے زندہ مصنفینِ اردو کے متعلق لکھا تھا ان میں سے بیشتر اسی مجلس میں پڑھے گئے تھے۔ اسی طرح میرے معاصرین میں بہت سے اور دوستوں کی مشقِ تحریر و تقریر اسی دبستان میں ہوئی جس کے اعزازی صدر میاں محمد شاہ دین تھے۔"

میاں صاحب کی انگریزی تحریر بہت پر زور تھی۔ کشمیر کی سیر کے بعد انھوں نے لاہور کے انگریزی اخبار "سول اینڈ ملٹری گزٹ،، میں چند مضامین لکھے تھے جن میں یہ لکھا تھا کہ جہاں قدرت نے خطۂ کشمیر کو خوب سے خوب تر مناظر فطرت سے آراستہ کرنے میں فیاضی سے کام لیا ہے وہیں انسان نے افسران حکومت کی بے پروائی کے سبب وہاں کے باشندوں کو آرام اور خوش حالی سے محروم رکھا ہے۔ یہ مضامین ایسے دلچسپ تھے کہ اگر انھیں ڈھونڈ کر کتابی صورت میں شائع کیا جائے تو بہت مفید اور دلچسپ ہوں۔ انگریزی تقریروں کے بعد میاں صاحب کی اردو تقریروں کا شہرہ ہوا۔ مجھے پہلے معلوم نہ تھا کہ اردو کتابوں کا مطالعہ میاں صاحب نے بہت کیا ہے کیونکہ ان دنوں انگریزی خواں طبقے کی توجہ اردو کی طرف کم تھی۔ میاں صاحب سے جب ذرا اچھی واقفیت ہوئی تو پتہ چلا کہ اردو

نظم و نثر دونوں خوب لکھتے ہیں ۔ میں خود بھی اردو کا دلدادہ تھا اس لیے ہمارا یہ شوق مشترک مزید ربط باہمی کا ذریعہ بنا اور مجھے ان سے اردو کی ترقی کی کوششوں میں بہت مفید مشورے ملے ۔ پہلی تجویز یہ تھی کہ انگریزی داں اصحاب سے اردو میں تقریریں کرائی جائیں جن میں زبان کی سادگی اور صفائی کے ساتھ خیالات کی بلندی اور پختگی ہو ۔ اور ان میں وہ نئی معلومات ، جو مغربی کتابوں سے جمع کی گئی ہوں ، درج کی جائیں ۔ کئی سال متواتر ایسے لیکچروں کا انتظام ہم کرتے رہے ۔ میاں صاحب نے خود بھی اس سلسلے میں تقریریں کیں اور دوسروں کو بھی ادھر راغب کیا ۔ ایک سال جب وہ مسلمانوں کی تعلیمی کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے تو ان کا اردو خطبۂ صدارت بہت کامیاب رہا اور صوبجات متحدہ کے بہت سے قابل حضرات نے اس کی تعریف کی ۔ میاں صاحب ، سر سید احمد خاں مرحوم کے بے حد مداح تھے اور اپنی نثر میں انھی کے نمونے کی پیروی کیا کرتے تھے ۔ نظم میں مولانا حالی مرحوم کی اخلاقی اور اصلاحی نظمیں انھیں پسند تھیں اور خود بھی جب کبھی شعر کہنے کے لیے فرصت پاتے تھے تو زیادہ تر ایسے اشعار لکھتے تھے جن میں مناظر فطرت کا نقشہ ہوتا تھا یا اخلاق اور فلسفہ ۔ ان کے بعد ان کی نظموں کا مجموعہ ان کے خلف الرشید میاں بشیر احمد صاحب نے شائع کیا جو ادبی حلقوں میں بہت پسند کیا گیا ہے ۔

عادات و اطوار میں میاں صاحب متانت کا نمونہ تھے ، مگر ان کی طبیعت میں ظرافت تھی جو بعض اوقات عجیب پیرائے میں ظاہر ہوتی تھی ۔ اس کی ایک دو مثالیں خالی از دلچسپی نہ ہوں گی ۔ ایک دفعہ ایک صاحب ایران سے ہندوستان آئے ۔ وہ لباس اور شکل

و شباہت میں بارعب آدمی تھے ۔ مگر بد قسمتی سے شعر گوئی کو بہانۂ طلب زر بنائے پھرتے تھے ۔ انھوں نے ایک فارسی قصیدہ کہہ رکھا تھا یا کہیں سے حاصل کر لیا تھا جس کے الفاظ پرشوکت تھے ۔ جس بڑے آدمی سے ملتے ، قصیدے کے اخیر کے اشعار میں اس کا نام یا کچھ حالات درج کر کے اس سے انعام کے طلب گار ہوتے ۔ وہ میاں صاحب سے بھی ملنے آئے اور اس بات پر اصرار کیا کہ وہ ان کو قصیدہ پیش کرنے کی اجازت دیں ۔ میاں صاحب تو قصیدوں کے شائق نہ تھے بلکہ اس کو معیوب سمجھتے تھے کہ کوئی اپنی قابلیت یا ذہانت کو دوسروں سے کچھ مانگنے کا وسیلہ بنائے ۔ انھوں نے عذر کیا کہ انھیں معاف رکھا جائے مگر جب انھوں نے کہا کہ وہ مسافر ہیں اور ان کا حق ہے کہ انھیں اپنے شہر کا مہمان تصور کیا جائے تو میاں صاحب نے ان سے کہا کہ وہ ایک شام کو کھانا ان کے ہمراہ کھائیں ۔ ایرانی صاحب نے سمجھا کہ جب کھانے پر آئیں گے تو قصیدہ سنائیں گے اور میزبان کو انھیں روپے دینے سے انکار کی گنجائش نہ رہے گی ۔ میاں صاحب نے جس شام کے لیے انھیں مدعو کیا اس کے لیے چند اور دوستوں کو بھی کھانے پر بلایا ۔ میں بھی اس دعوت میں شریک تھا ۔ کھانے کے بعد ایرانی صاحب نے قصیدہ اپنی جیب سے نکالا اور اور پڑھنا شروع کیا ۔ بہت سے اشعار بندش اور اپنی لفظی خوبیوں کے لحاظ سے اچھے تھے ۔ ہم لوگ خوب واہ واہ کرتے رہے ۔ جب ایرانی صاحب اپنے اشعار پڑھ چکے تو میاں صاحب نے ہم لوگوں سے کہا کہ ہم اپنے ہاں کے فارسی شعرا کا کلام سنائیں ۔ میاں صاحب نے خود بھی چند شعر مہمان کو سنائے ۔ جب رخصت ہونے

کا وقت آیا تو ایرانی صاحب متوقع تھے کہ کچھ نقد بھی ملے گا ۔ مگر میاں صاحب نے کہا ''آپ نے ہمیں اشعار سنائے ، ہم نے آپ کو عوض معاوضہ گلہ ندارد ۔'' بے چارے ایرانی کا اترا ہوا چہرہ اس وقت دیکھنے کے قابل تھا ۔ مگر اسے معلوم ہو گیا کہ قصیدے والا منتر ہر جگہ نہیں چلتا ۔ ایک اور چھوٹا سا قصہ قابل ذکر ہے ۔ سیر کشمیر کے دوران میں میاں صاحب مازننڈ گئے جو ہندوؤں کا ایک مشہور مذہبی مقام ہے ۔ وہاں کے برہمن پجاری بھولے بھالے مسافروں سے پیسے لینے کے طرح طرح کے ڈھنگ جانتے ہیں ۔ ان کے پاس بڑی بڑی کتابیں ہوتی ہیں جن میں ہر مسافر سے کچھ لکھوالتے ہیں اور اس کا نام اور پتہ محفوظ کر رکھتے ہیں ۔ جب کوئی اور شخص اسی شہر سے آتا ہے تو اس کو کتاب دکھا کر یہ کہتے ہیں کہ اس شہر کے لیے وہ خاص پروہت ہیں ۔ اس کی تھوڑی سی تواضع کر کے اس سے پیسے بھی لیتے ہیں اور کتاب میں اپنی بابت لکھوا بھی لیتے ہیں کہ یہ اچھا پروہت ہے ۔ میاں صاحب نے یہ قصہ مجھے سنایا کہ ایک ایسا آدمی انہیں وہاں ملا اور انہیں ہندو سمجھ کر لاہور کے اور ہندو سیاحوں کے نام لینے لگا جو اس کی کتاب میں نام لکھ گئے ہیں ۔ میاں صاحب سے بھی اس نے کہا کہ وہ اس کی کتاب میں کچھ لکھ دیں ۔ میاں صاحب نے انگریزی میں اس کی کتاب میں لکھ دیا :

''یہاں کے پجاری مسافروں کو بے وقوف بنانے میں مشاق ہیں ۔ مگر ان میں سے کئی خود بھی بے وقوف ہیں اور ان میں یہ بڑا بے وقوف ہے ۔''

اس نے بعد کو جب یہ سند کسی سے پڑھوائی ہوگی تو بہت پشیمان ہوا ہوگا ۔

افسوس ! میاں صاحب مرحوم کی زندگی نے وفا نہ کی اور وہ قبل از وقت گزر گئے ۔ پنجاب کے اَدیبوں میں اور رہنماؤں میں جو جگہ ان کے انتقال سے خالی ہوئی آن کے بعد پُر نہیں ہو سکی ۔ ایک خاص امتیازی رنگ ان میں تھا جو انھی کا حصہ تھا ۔ ان کی قابلیت ، ان کی اصول پسندی اَور ان کی ہمدردیٔ قومی دیر تک یاد رہے گی ۔ ہمارے ہمایوں صاحب پنجاب کے ان فرزندوں میں سے تھے جن پر پنجاب بجا طور پر فخر کر سکتا ہے ۔

* * *

حافظ محمود شیرانی مرحوم[1]

میں نے شمعِ علم کے پروانے کئی دیکھے مگر حافظ محمود شیرانی جیسا سوختہ جاں کم دیکھا - میں نے انھیں سب سے پہلے انگلستان میں دیکھا جب میں بھی طالب علم تھا اور وہ بھی - پھر وہ مجھے لاہور میں میری واپسی سے کئی سال بعد ملے اور یہیں سالہا سال رہے - پھر اس زمانے کے قریب ملے جب وہ پنجاب سے اپنے بزرگوں کے وطن یعنی ریاست ٹونک کو گئے اور پنجاب نے انھیں با دل نخواستہ رخصت کیا ، وہ یہاں سے اس طرح گئے جیسے یہ وطن تھا اور وہ پردیس -

ولایت میں وہ کوئی سات سال رہے - پہلے دو تین سال تو انھیں انگریزی سیکھنے میں لگے ہندوستان سے وہ منشی فاضل کا امتحان پاس کر کے گئے تھے - اس سے پہلے وہ قرآن شریف حفظ کر چکے تھے - فارسی اور عربی منشی فاضل کی پڑھائی کرتے ہوئے حاصل کی تھی - میں جب ولایت سے چلا وہ ابھی انگریزی سیکھ رہے تھے - مطالعے کا شوق بےحد تھا - لندن کے کتب خانوں میں جا کر کتب بینی میں مصروف رہتے - وہاں مشرقی کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ برٹش میوزیم میں ہے اور دوسرا انڈیا آفس میں - دونوں میں فارسی

---

۱ - اورینٹل کالج میگزین (حصہ اردو) جلد ۲۳ عدد ۲ بابت فروری ۱۹۴۷ء عدد مسلسل ۸۸ صفحہ ۳ تا ۸ - (شیرانی نمبر) — حافظ محمود شیرانی کی وفات ۱۵ فروری ۱۹۴۶ء کو ہوئی -

عربی کی قلمی کتابیں بکثرت موجود ہیں اور ان میں سے کئی ایسی نادر کہ اب خود مشرق کتب خانوں میں ان میں سے بعض کا وجود نہیں ۔ اس طرح ہمارے مالی سرمائے کے ساتھ ہمارا بہت سا علمی سرمایہ بھی دوسرے ملکوں میں منتقل ہو چکا ہے ۔ حافظ محمود شیرانی نے علمی دولت کو سمیٹنا شروع کیا اور مالی سرمائے سے یہ بے نیازی اختیار کی ۔ ان کے اس ذوق کے باعث انھیں وہاں کے قیام کے آخری سالوں میں برطانیہ کے ایک کتب خانے کی فہرست کتب کی تیاری کا کام مل گیا اور اس کا کچھ قلیل معاوضہ ملتا رہا ۔ فہرست بنانا صرف اسی کو نہیں کہتے کہ کتابوں کے نام ترتیب سے لکھ دیے بلکہ کتب خانوں کی اصطلاح میں فہرست بنانے والے سے یہ توقع ہوتی ہے کہ وہ کتاب کے مضمون سے بھی کچھ آگہی رکھتا ہو ۔ مصنف کے حالات سے بھی باخبر ہو اور یہ بھی جانتا ہو کہ وہ کس زمانے کی تصنیف ہے اور جو نسخہ اس کے سامنے ہے وہ کس زمانے کی نوشت ہے ۔ اس کام سے حافظ محمود صاحب کی دل بستگی کتابوں کی ان تفاصیل کے ساتھ روز بروز بڑھتی گئی اور وہ اس فن کے ماہروں میں شمار ہونے لگے ۔

جب لاہور میں مجھے حافظ صاحب پھر ملے تو کسی یونیورسٹی کی ڈگری تو ان کے پاس نہ تھی مگر معلومات کا ذخیرۂ وافر ان کے سینے میں تھا ۔ پہلے تو مجھے یہ سن کر مایوسی ہوئی کہ اتنے سال پردیس میں صرف کرنے اور نیک اور پاکیزہ زندگی بسر کرنے کے باوجود ان کے پاس کوئی چیز نہیں جو اقتصادی اعتبار سے قیمت رکھتی ہو۔ مگر جب مجھے ان کی معلومات کی وسعت کا پتہ چلا اور

میں نے ان کے بعض تحقیقی مقالے دیکھے جو انھوں نے اردو میں لکھے تھے تو وہ مایوسی جاتی رہی ۔

حافظ صاحب نے مجھے بتایا کہ وہ جب اپنے وطن میں پہنچے اور دن رات کتابیں پڑھنے میں مصروف رہے اور نہ گھر سے نکل کر لوگوں سے ملے ، نہ نواب صاحب بہادر والیٔ ریاست کی خدمت میں سوائے ایک رسمی سلام کے حاضر ہوئے تو لوگ انھیں تعجب کی نگاہ سے دیکھنے لگے اور ان کے متعلق چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ یہ شخص کسی غیرمعمولی اور صیغۂ راز کی خدمت پر مامور ہے اور اسی لیے گھر میں گھسا رہتا ہے ۔ اس بنا پر کسی نے نواب صاحب کے پاس ان کے متعلق بدگوئی کی اور انھیں وہاں چین سے رہنا مشکل ہوا ۔ اس لیے وہ لاہور چلے آئے کہ یہاں اگر کوئی ملازمت ملے تو اس سے بسر اوقات کریں ۔ لاہور کے اسلامیہ کالج میں اس وقت فارسی کے لیکچرار کی جگہ خالی تھی ۔ کچھ کوشش کے بعد وہ جگہ انھیں مل گئی اور انھوں نے لاہور میں سکونت اختیار کر لی ۔ کالج میں ان کی قابلیت کا اعتراف جلد شروع ہوگیا ۔

کتابوں کا شوق انھیں اس حد تک تھا کہ کم سے کم خرچ پر اپنا گزارہ کرتے اور جو کچھ بچتا اس سے کوئی پرانی قلمی کتاب خرید لیتے ۔ کالج میں جب موسم گرما کی تعطیلات آتیں تو محمود شیرانی صاحب انھیں ایسے کسی شہر یا شہروں میں بسر کرتے جہاں انھیں معلوم ہوتا کہ پرانی کتابوں کا ذخیرہ کسی کے ہاں موجود ہے اور مناسب داموں پر مل سکے گا ۔ وہاں جا کر وہ کتابوں کا جائزہ لیتے اور جو چیز ان کے مطلب کی ہوتی لے آتے ۔ اس طرح ان کی اپنی خرید کردہ کتابوں کا ایک مجموعہ جمع ہوتا گیا جو بالآخر ایک

معقول کتب خانہ بن گیا ، اور جسے وہ یہاں سے جاتے وقت پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری میں لاگت سے بھی کم داموں پر دے گئے ۔

اسلامیہ کالج سے تعلق کے زمانے میں انھوں نے کئی مقالے لکھے جو نئی معلومات سے پُر تھے اور باعتبار طرز تحریر عام فہم اور پسندیدہ ۔ ان سب میں بہتر ان کی مشہور کتاب تھی جو ''پنجاب میں اردو'' کے نام سے شائع ہوئی ، جس میں انھوں نے یہ ثابت کیا کہ اردو پنجاب کے راستے دہلی میں پہنچی اور وہاں سے جلا پا کر اردو کہلائی ۔ اس نظریے کے ثبوت میں انھوں نے کئی سو برس کے صوفیوں کے کلام کے نمونے پیش کیے جو اُردو کے اچھے خاصے نمونے تھے ۔ یہ نظریہ اب ہندوستان کے دوسرے حصوں کے ارباب تحقیق کے نزدیک بھی قابل قبول ہوتا جاتا ہے ۔ یہ کتاب ایک سے زیادہ دفعہ طبع ہو چکی ہے ، لیکن افسوس کہ اب نایاب ہے ۔ سنا ہے کہ انجمن ترقی اردو دہلی اسے دوبارہ شائع کرنے کا انتظام کر رہی ہے ۔

لاہور کی علمی فضا حافظ محمود شیرانی کو بہت پسند تھی اور وہ اپنے علمی مشغلوں کے لیے اسے مساعد پاتے تھے ۔ ان کی ضرورتیں ، کتابوں کی خرید کے شوق کو چھوڑ کر مختصر تھیں اور طبیعت میں قناعت اس قدر تھی کہ انھیں کئی دفعہ دوسرے مقامات سے بلاوے آئے ، اور یہاں جو تنخواہ تھی اس سے بہتر تنخواہیں پیش کی گئیں ، مگر انھوں نے جانا پسند نہ کیا ۔ البتہ بہت سے سال اسلامیہ کالج میں رہنے کے بعد شیرانی صاحب اورینٹل کالج لاہور میں منتقل ہوگئے تھے اور وہاں ان کی تنخواہ میں بھی ترقی ہوئی اور شہرت میں بھی ۔ ان کے معاصر اور دوسرے پروفیسر انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے

اور بہت سے قابل اور مستعد طالب علموں نے ان کے فیض صحبت سے محققانہ انداز تحریر سیکھا اور اب وہ خود ممتاز اہلِ علم میں شمار ہوتے ہیں -

پروفیسر شیرانی کو کتابوں کے جمع کرنے کے شوق کے ساتھ پرانے فرامین اور کتبے اور سکّے جمع کرنے کا بھی شوق ہوگیا تھا - اس میں انھوں نے حیرت انگیز ترقی کی - ایسے ایسے نادر سکّے بہم پہنچائے اور اس خوبی سے ان کو ترتیب دیا اور سجا کے رکھا کہ دور دور سے لوگ انھیں دیکھنے آتے تھے اور حیران ہوتے تھے کہ باوجود وسائل کی کمی کے ایک شخص کیسے ایسا مجموعہ مہیا کر سکا -

لاہور سے جانے سے کچھ عرصہ پیشتر ایک دن شیرانی صاحب نے مجھے اپنے مکان پر بلایا کہ ان کے مجموعے کے بعض نوادر کو دیکھوں - گرمی کا موسم تھا اور دوپہر کے بعد کا وقت - میں نے نوادر کو بھی دیکھا اور ان کی داد دی مگر اس سے زیادہ خود شیرانی صاحب کی داد دی کیونکہ وہ بھی اپنی جگہ داخلِ نوادر تھے - گرمی کی وجہ سے ایک ہلکا سا بنیان پہنے ہوئے تھے اور کمر کے گرد صرف ایک چھوٹا سا تہ بند باندھے بیٹھے تھے - پنکھا نہ دستی نہ بجلی کا - نہ گرمی سے بچنے کی فکر نہ پروا - کتابیں اور وہ - گرد و پیش فرامین اور سکّے - یہ پروفیسر محنت کے لحاظ سے مغربی پروفیسروں سے زیادہ اور آسائش اور ماند و بود میں کسی مسجد کے مُلا سے زیادہ سادہ تھا - شیرانی کی یہ آخری تصویر ہے جو میرے صفحۂ دل پر منقوش ہے -اب وہ دنیا میں نہیں ہیں لیکن ان کی یاد آن کے مہجور احباب کے دلوں میں موجود ہے اور مرحوم کے لیے دعائے مغفرت ان کے لبوں پر ہے -

منشی دیا نرائن نگم کانپوری[1]

زبان اردو کے سچے دوستوں کی فہرست میں منشی دیا نرائن نگم آنجہانی کا نام نہایت اونچی جگہ کا مستحق ہے ۔ موت کے بے رحم ہاتھوں نے ان کو ہم سے چھین لیا اور اردو آن کی بیش بہا خدمات سے محروم ہوگئی مگر جو کام انھوں نے اُردو کی ہردلعزیزی بڑھانے اور اس کو مفید سے مفید تر بنانے کے لیے کیا ہے وہ زندہ ہے اور خدا چاہے زندہ رہے گا ۔ میری ان کی ملاقات دیرینہ تھی ۔ جب میں نے لاہور سے رسالہ 'مخزن' جاری کیا تو دیا نراین صاحب ابھی کالج میں پڑھتے تھے ۔ غالباً بی ۔ اے کی جماعت میں تھے ۔ 'مخزن' کے اولین مضمون نگاروں میں تھے ۔ جب وہ تحصیل علم سے فارغ ہوئے اور انھوں نے بی ۔ اے پاس کیا تو بجائے کسی سرکاری ملازمت کی تلاش کے یا وکالت کی سند حاصل کر کے روزی کمانے کے انھوں نے یہ ارادہ کیا کہ ادب اردو کی خدمت کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیں ۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ اپنے پیارے وطن کی اس مشترکہ وراثت کو زندہ رکھنا ملک کی بہترین خدمت ہے ۔ اپنے ارادے کی تکمیل کے لیے انھوں نے رسالہ 'زمانہ' جاری کیا ۔ 'مخزن' کی سب خصوصیات اس میں جمع تھیں اور اکثر مضمون نگار مشترک تھے ۔ مگر ایک چیز اس میں زائد تھی ، یعنی نگم صاحب کبھی کبھی سیاسی معاملات پر خود بھی لکھتے تھے اور دوسروں سے بھی مضمون

---

۱ ۔ ماہنامہ ''زمانہ'' کانپور یادگار نمبر (نگم نمبر) فروری ۔ مارچ ۱۹۴۳ع جلد ۸۰، نمبر ۲ و ۳ ، صفحہ ۹ و ۱۰ ۔

لکھواتے تھے ۔ مجھ سے اُن سے کچھ عرصے تک اس بارے میں خط و کتابت رہی ۔ میری رائے یہ تھی کہ ادبی رسالہ خالص ادبی کام میں منہمک رہے اور سیاسیات کی اُلجھنوں میں نہ پڑے اور وہ چاہتے تھے کہ سیاسیات کے اصولوں کی تلقین بھی ادبی کام کے ساتھ ساتھ ہوتی رہے ۔ بہت سی بحثوں کے بعد ہم اس پر متفق ہوگئے کہ نگم صاحب اپنے ہاں اس خصوصیت کو جاری رکھیں اور میں اپنے راستے پر قائم رہوں ۔ مگر مجھے یہ دیکھ کر بہت اطمینان ہوا کہ نگم صاحب نے سیاسیات پر قلم فرسائی کرتے ہوئے اس خیال کو ملحوظ رکھا کہ زیادہ تر وہ باتیں لکھی جائیں جن پر تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کے اکثر طبقے متفق ہیں اور 'زمانہ' کے اوراق کو سیاسی جھگڑوں کا دنگل نہ بنایا جائے ۔ اس مشکل احتیاط کو نگم صاحب نے بہت عمدگی سے نباہا اور وہ اس امتحان میں اس لیے کامیاب ہوئے کہ ان کی طبیعت انصاف پسند اور صلح جُو واقع ہوئی تھی اور وہ چاہتے تھے کہ جو کام اُنھوں نے اپنے ذمے لیا ہے وہ بخوبی انجام پاتا رہے اور بے ضرورت کسی سے اُلجھنا نہ پڑے ۔

اُردو کے دورِ جدید کے بہترین ناظم و ناثر اپنے مضامین سے اوراقِ 'زمانہ' کو زینت دیتے رہے اور نگم صاحب کبھی اصرار سے، کبھی منت سے، کبھی معاوضہ دے کر مضامین کو اطرافِ ملک سے حاصل کرنے اور شائع کرنے میں کامیاب ہوتے رہے ۔ کئی سال ہوئے جب 'زمانہ' اپنی عمر کے پچیس سال طے کر چکا تھا تو نگم صاحب کو اس کی ''نقرئی'' جوبلی منانے کا خیال آیا اور وہ بہت اچھی طرح منائی گئی ۔ جوبلی کے لیے جو خاص پرچہ شائع ہوا تھا اُس میں اُن کی محنت کی سب نے داد دی ۔

جب الہ آباد میں اردو اکادمی قائم ہوئی تو دیا نراین نگم صاحب اس تحریک کے بڑے پیش رو تھے اور وہ دیر تک اس جاعت کی خدمت کرتے رہے ۔ حکومت سے بار بار اس کی امداد کی استدعا کی اور آخر ایک معقول سالانہ امداد اس کے لیے قائم ہو گئی ۔

میری ان سے آخری ملاقات ۱۹۴۰ء میں ہوئی ، جب کل ہند اُردو کانفرنس کا سالانہ اجلاس کانپور میں ہوا ۔ وہ دو تین دن جو اُن کی صحبت میں گزرے ، نہیں بھولتے ۔ جلسے کے اندر وہ جلسے کے مشوروں میں شریک غالب تھے ۔ جلسے کے باہر جہاں کہیں مجھے جاتا ہوا انھوں نے حق رفاقت ادا کیا ۔ ایک شام کو انھوں نے مجھے اپنے ہاں کھانے پر بلایا اور بہت سے احباب سے ملاقات کرائی ۔ جتنی ملاقاتیں اُن سے ہوئیں اُن میں کوئی وقت بھی ایسا نہ تھا جب اردو ادبیات کی ترقی کی تجاویز کے سوا کوئی اور تذکرہ انھوں نے کیا ہو ۔ اس سلسلے میں اُن کا یہ ارادہ تھا کہ رسالۂ 'زمانہ' کے لیے ایک محدود کمپنی قائم کی جائے جو مشترکہ سرمائے سے آسے جاری رکھے اور پہلے سے بھی زیادہ مفید بنائے ۔ اس کے علاوہ ان کا یہ خیال بھی تھا کہ اردو کی کتابوں کا ایک قیمتی مجموعہ ، جو انھوں نے اپنے کتب خانے کے لیے مہیا کیا تھا ، اس کا بھی ٹرسٹ قائم کردیا جائے تا کہ وہ کتابیں محفوظ بھی رہیں اور لوگ اُن سے فائدہ بھی اُٹھاتے رہیں ۔ اس سلسلے میں اُنھوں نے بعد میں مجھے دو ایک دفعہ خط بھی لکھے اور کچھ عملی تجاویز بھی پیش کیں مگر افسوس کہ وہ تجاویز ابھی جامۂ عمل پہننے نہ پائی تھیں کہ عالمِ بالا سے اُن کی طلبی آ گئی :

اے رہ گرائے عالمِ بالا چگونہ ای
مابے تو درغمیم و تو بے ما چگونہ ای

دیا نراین صاحب کے بے وقت انتقال سے ادب اردو کو جو نقد ان ہوا ہے وہ ناقابل تلافی ہے مگر یہ امر تسلی بخش ہے کہ ان کے صاحب زادے منشی سری نراین نگم صاحب کو اپنے باپ کا کام جاری رکھنے کا شوق ہے اور وہ اپنے والد بزرگوار کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کر رہے ہیں - ان کے والد کے بے شمار دوستوں اور مداحوں کی دعائیں ان کے ساتھ ہیں اور امید ہے کہ 'زمانہ' کو جاری رکھنے کے لیے جو مدد درکار ہوگی وہ منشی سری نراین نگم کو ملتی رہے گی ، کیونکہ دیا نراین نگم صاحب اردو کے دوست ہی نہ تھے ، عاشق تھے - ان کو اردو سے جو محبت اپنے بچپن اور جوانی سے تھی اس کو انھوں نے کمال وفاداری سے نباہا اور کسی مالی نقصان کی پروا نہیں کی - اسی کی ترقی کےلیے عمر صرف کی اور اسی کی خدمت کرتے ہوئے چل بسے - امیر مینائی مرحوم نے کیا خوب کہا ہے :

شناوران محبت تو سینکڑوں ہیں مگر
جو ڈوب جائے وہ پکا ہے آشنائی کا

* * *

فنِ تنقید[1]

ہندوستان میں علوم و فنون کی ترقی کی راہ میں ایک روک یہ رہی ہے کہ یہاں فنِ تنقید کا رواج نہیں تھا اور باوجود ترقی کے مختلف خیالات پیدا ہو جانے کے آج تک یہ فن اس ملک میں رائج نہیں ہوا ۔ آج کل بعض تحریرات میں کہیں کہیں ناقدانہ جھلک نظر آتی ہے مگر ایسی تحریریں ابھی تعداد میں اس قدر کم اور وہ جھلک ابھی ایسی خفیف ہے کہ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس فن کا رواج ہندوستان میں ہوگیا ۔ مغربی دنیا کے باشندوں میں جہاں آجکل اور خوبیاں نظر آتی ہیں وہاں یہ بھی ہے کہ لوگ ہنروروں کے عیب و ہنر کو دیکھتے ہیں ۔ نظم و نثر کی تصنیفات قبولِ عام کا خلعت پہننے سے پیشتر جوہریانِ سخن کی نقاد نظروں کے کاملُ العیار ترازو میں جانچی اور تولی جاتی ہیں اور ان سے سندِ درستی حاصل کرنے کے بعد سخن فہم قدردانوں کی نظروں میں سماتی ہیں ۔ انگریزی میں ایک لفظ ہے ''کرٹک'' جس سے مراد وہ شخص ہے جو کسی فن کی نسبت رائے لگائے اور کھوٹا کھرا انصاف سے پرکھ دے ۔ اس لفظ سے مشتق ہے ایک لفظ ''کرٹسزم'' جس کے معنے ہیں جانچنا پرکھنا۔ تعجب ہے کہ اس فن کا وجود تو ایک طرف ، ہمارے ہاں ابھی ان دونوں لفظوں کے صحیح ترجمے کا فیصلہ نہیں ہوا ۔ ان الفاظ کے ترجمے عموماً غلط کیے جاتے ہیں جو ان کے اصل مفہوم سے بہت دور ہیں ۔ مدرسوں میں تو بعض نیم مُلاّ ''کرٹسزم'' کے معنے

۱ ۔ منقول از ماہنامہ مخزن ، بابت ستمبر ۱۹۰۱ع (جلد ۱ نمبر ٦) ص ۱ - ٦۰ ۔

''نکتہ چینی'' پڑھاتے ہیں یا بہت بڑھے تو ''رائے زنی'' کہہ دیا۔ اس میں شک نہیں کہ کرٹسزم میں بعض اوقات نکتہ چینی ہوتی ہے مگر بعض اوقات تعریف بھی ہوتی ہے، اس لیے نکتہ چینی کچھ ٹھیک ترجمہ نہیں۔ ابتدائی تعلیم میں غلط معنے ذہن نشین ہو جانے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ بعض اچھے خاصے انگریزی خواں تحصیل سے فارغ ہونے پر بھی اس غلطی میں مبتلا رہتے ہیں اور ''کرٹک'' کو محض نکتہ چیں اور اس کے فن کو فقط نکتہ چینی جانتے ہیں۔ رائے زنی والا گروہ بمقابلہ ان کے راستی پر ہے۔ مگر اول تو یہ لفظ پورا مفہوم ظاہر کرنے سے قاصر ہے۔ دوسرا کچھ کانوں کو بھلا نہیں معلوم ہوتا۔ مثلاً کسی شخص کی نسبت یہ کہنا کہ اپنے زمانے میں انگلستان کے نامور رائے زنوں میں گزرا ہے، خواہ مخواہ مذاق سلیم کو کھٹکتا ہے۔ اور جو لوگ بالکل اصلی انگریزی لفظ سے نا آشنا ہیں وہ کچھ نہیں کہہ سکتے کہ حضرت موصوف کس معاملے پر رائے زنی کیا کرتے تھے۔ معاملات ملکی سے انھیں خاص دلچسپی تھی یا تمدنی امور میں زیادہ دخیل تھے۔ علوم کی طرف رجوع تھا یا فنون کی طرف۔ حالانکہ انگریزی لفظ کے معنے زیادہ تر علم اور فن کے ساتھ مخصوص ہیں۔ کرٹک یا تو علم ادب کی تصانیف کے لیے ہوتے ہیں یا فن نقاشی اور مصوری و معماری وغیرہ کے لیے۔ اگر اور کسی چیز کی نسبت رائے دینے والے لوگوں کا ذکر کرنا ہو تو اس کا نام لینا پڑتا ہے اور کہنا پڑتا ہے کہ فلاں چیز کے کرٹک۔ ان دو ترجموں کے علاوہ چال میں کہیں کہیں لفظ ''تنقید'' بھی اس معنے میں استعمال ہوتا نظر آیا ہے، مگر اہل زبان کی غفلت اور سہل انگاری سے رواج نہیں پا سکا۔ کیونکہ بعض ایسے لکھنے والوں

نے، جو استادوں میں گنے جاتے ہیں ، اس کوشش سے کہ اپنی زبان کے کسی لفظ کو ان معنوں میں رواج دیں ، اجتناب کیا اور عافیت اسی میں سمجھی کہ اصل انگریزی اصطلاح اردو کتابوں میں لکھ دیں ۔ مگر بد قسمتی سے وہ اصطلاح ایسی ہے کہ اس کا تلفظ آسان نہیں ۔ کبھی فارسی خواں اصحاب کی زبان سے جو اس اصطلاح کو سنا ہے تو سخت ہنسی آئی ہے ۔ فرمانے لگے ''ہمارے ملک میں ابھی کرٹک نہیں نکلے ۔'' جو پوچھا ''صاحب وہ کیا؟'' تو بولے ''یہی جو کتابوں پر ''کیری ٹی سزم'' لکھتے ہیں ۔ ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ اصطلاح ان انگریزی الفاظ میں سے نہیں ہے جو اردو میں عام طور پر مقبول ہو سکتے اور جزو زبان بن سکتے ہیں ۔ یہ ایسی اصطلاح ہے کہ اس کا تلفظ اگر انگریزی خوانوں کی زبان سے صحیح طور پر بھی ادا ہوگا تو بھی اردو آشنا کانوں کو کھٹکے گا ۔ اس لیے ضروری ہوا کہ اس کے لیے ایک لفظ ایسا تلاش کیا جائے جو زبان اردو میں پہلے سے مروج ہو اور جو اس اصطلاح کے مفہوم کو ادا کر سکے ۔ ہماری نظر میں اس مطلب کے لیے ''تنقید'' سے بہتر کوئی لفظ نہیں ہے ۔ اورہم تو آج سے ہی ''کیری ٹی سزم'' کو سلام کہتے ہیں اور تنقید سے کام لیں گے ۔ کرٹک کو ہم نقاد یا ناقد سخن کہیں گے ، کیونکہ ہمیں ابھی علم ادب ہی کے نقادوں سے کام ہے ، اور ان دو لفظوں کے رواج کو فن تنقید کی ترقی کا پہلا زینہ سمجھیں گے ۔ اور فن تنقید کی ترقی ، اگر یہ فن ایماندار اور انصاف پسند لوگوں کے ہاتھ میں رہا ، ہمارے علم ادب کو اس معراج ترقی پر پہنچا دے گی جس کے اکثر ہوا خواہان ملک دل سے آرزومند ہیں ۔ اس وقت مصر میں عربی زبان کا علم ادب غیر معمولی ترقی

کر رہا ہے ۔ یورپ کے علمی اور ادبی خزانے مال غنیمت کی طرح ملک کے ذخیروں کو مالا مال کرنے کے لیے لوٹے جا رہے ہیں ۔ جو کام پہلے سلطنتیں کرتی تھیں وہ عوام کر رہے ہیں اور ہر قسم کی انگریزی اور فرانسیسی کتابیں عربی زبان میں ترجمہ ہوتی جاتی ہیں ۔ وہاں ضرورت نے بہت سے غیر زبانوں کے لفظوں کو اختیار کرنے اور بعض کے لیے اپنی زبان کی اصطلاحیں ڈھونڈھ نکالنے پر مجبور کیا ہے ۔ مگر اس بات کی داد دینی پڑتی ہے کہ جن لفظوں کو اختیار کیا ہے ان کو بالعموم خوبصورتی سے اپنا بنا لیا ہے اور جن کے ترجمے ڈھونڈھے ہیں ایسے موزوں کہ لفظی رعایت بھی ملحوظ رہی ہے اور مطلب بھی ادا ہو گیا ہے ۔ الغی ترجموں میں یہ لفظ ''تنقید'' ہے ۔ وہاں اکثر اخبارات یا رسالوں میں جہاں تازہ تصانیف کی پرکھ ہوتی ہے وہاں صفحہ یا کالم کے اوپر ''باب انتنقید'' لکھا ہوتا ہے ۔ خود ''کالم'' کے لفظ کی بجائے وہ ''عماد'' لکھتے ہیں جو انگریزی لفظ کا صحیح ترجمہ ہے اور اگر ہمارے اخبارات میں کالم کا لفظ حد سے زیادہ مروج نہ ہو چکا ہوتا اور یوں بھی ایک سادہ اور سہل لفظ نہ ہوتا تو ہم زور سے رائے دیتے کہ ''عماد'' کو یہ نئے معنے عطا کیے جائیں ۔

فن تنقید کے رواج کے لیے دو تدبیریں ہمارے ذہن میں ہیں ۔ ایک تو یورپ کی بعض مشہور تصانیف میں سے وقتاً فوقتاً اس فن کی نسبت اقتباسات درج کرنا ، دوسرے اصول فن کے موافق اس رسالے میں آج کل کی بعض مشہور تصانیف کو تنقید کے ترازو میں تولنا اور نتیجہ بلا کم و کاست ظاہر کرنا ۔ یہ دونوں کام بجائے خود مشکل کام ہیں ۔ پہلی تدبیر میں تو ترجمے کا کام نہایت دشوار ہے ۔

اس فن کی مختلف اصطلاحیں تعداد میں اس قدر ترقی کر گئی ہیں اور مدح و ذم کے ایسے ایسے باریک پہلو نکالے گئے ہیں کہ ان عبارات کو ، جو وہاں صدیوں سے منجھی ہیں ، اردو میں ادا کرنا کارے دارد ۔ دوسری تدبیر میں ، علاوہ اس کے کہ صحیح تنقید کوئی آسان بات نہیں ، دقت یہ ہے کہ مصنفین اور مطابع ابھی سچی مذمت سننے کے عادی نہیں ۔ یہاں مدت سے تقریظوں کا رواج رہا ہے ۔ کوئی پرانا دیوان یا کتاب اٹھا کر دیکھیے ، قلمی نسخہ ہو یا چھپا ہوا ، آخر میں صفحوں کے صفحے تقریظوں سے پُر ہیں ۔ ہمیں یاد نہیں کہ آج تک کوئی ایسی تقریظ کسی کتاب کے ساتھ لگی ہوئی ہو جس میں جہاں دس خوبیاں جتائی ہیں ایک آدھ نقص بھی جتا دیا گیا ہو ۔ مصنف کو دیکھیے تو ہر تقریظ لکھنے والے کے قلم جواہر رقم، طبع رسا اور کلک گہر سلک کے گیت گا رہے ہیں اور تقریظوں کو دیکھیے تو سب کی سب کتاب کو لاجواب ، رشک آفتاب و مہتاب ، ہزاروں میں انتخاب بتا رہی ہیں ۔ کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ کتاب کتنے تعریفی الفاظ کی مستحق ہے اور ہر شخص یہ دیکھتا ہے کہ اس کی تقریظ دوسرے سے زور والی ہو ۔ تقریظ لکھنا ہر شخص کے لیے اپنی طبع آزمائی کا موقع ہوتا تھا ، نہ کہ مصنف کو ایسی داد دینے کا جس کا وہ مستحق ہے ۔ بعض ایسی مثالیں بھی دیکھنے اور سننے میں آئی ہیں کہ تقریظ میں تو تعریف کے پل باندھ دیے اور ویسے اگر کسی نے پوچھا کہ کتاب کیسی لکھی گئی ہے تو کہہ دیا کہ ”کتاب تو مبتدیانہ مشق ہے ۔ ہم نے تو ایک دوست کی خاطر سے تقریظ لکھ دی ہے ۔“ تقریظوں کے علاوہ بعض پرانی کتابوں پر نکتہ چینی بھی کی گئی ہے مگر اس کا مذاق

یہ نہیں کہ : ع

عیب ها جمله بگفتی ہنرش نیز بگو

بلکہ یہ کہ اس کو سراپا عیب اور ہمہ تن نقص قرار دیتے تھے ۔ ایک ایک لفظ پر اعتراض ، حرکات و سکنات پر گرفت ، بندش پر نکتہ چینی ، مضمون پر حرف گیری ، ایسے ہی لوگوں کی شان میں میر انیس مرحوم لکھ گئے ہیں :

مزا یہ طرفہ ہے مضموں تو دستیاب نہیں
مقـابلے پہ چڑھـاتے ہیں آمنتوں کو
غلط یہ لفظ ، وہ بندش بری ، یہ مضمون سست
ہنر عجیب ملا ہے یہ نکتہ چینوں کو

غرض افراط تفریط کی عمل داری رہی ہے اور مذاق میانہ روی سے آشنا ہی نہیں ۔ نتیجہ یہ ہے کہ کتاب کی تعریف کر دینا نشان دوستی سمجھا جاتا ہے اور نہ کرنا یا کوئی اعتراض کرنا علامت دشمنی ہے ۔ آپ ذرا کسی کی کتاب میں کوئی نقص بیان کیجیے ۔ مصنف کے بیسیوں طرف دار آپ کی پگڑی اتارنے کو کھڑے ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں ، کہ آپ میں کتاب کے سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں ۔ اس حالت میں آزادی سے تصانیف پر رائے دینے کا بیڑا اٹھانا ایک جہان سے دشمنی پیدا کرنا ہے اور دشمنی بھی وہ جسے خدا واسطے کی دشمنی کہتے ہیں ، یعنی نہ کوئی ذاتی غرض نہ عناد ، صرف ملک کے علم ادب اور مذاق کی اصلاح اور منفعت عام کی غرض سے جو تنقید لکھی جائے اور جن کے کلام پر تنقید ہو وہ ایسے بگڑیں کہ دل میں غصہ بھر لیں اور بدلہ لینے کی فکر میں رہیں ۔ اس میں شک نہیں کہ

رفتہ رفتہ تنقید کی برداشت لوگوں میں پیدا ہوتی جائے گی ، مگر ابتدا میں بہت سی مشکلات کا سامنا ہے - ہم سردست یہ تجویز کرتے ہیں کہ ہمارے پاس جو کتابیں "ریویو" کے واسطے بھیجی جائیں گی ان کو دو قسم میں تقسیم کریں گے - ایک وہ جن پر ہم ناقدانہ نگاہ ڈالیں گے اور انٹجن کی نئی برق شعاعوں کی طرح ناظرین کو اس کے حسن و قبح صاف دکھا دیں گے - اس صیغے میں ممکن ہے کہ ہماری سخن فہمی غلطی کرے مگر نیت کبھی غلطی نہ کرے گی - نہ کسی کا لحاظ تعریف کی طرف راغب کرے گا ، نہ کسی کا عناد مذمت کی طرف - مال کو کسوٹی پر کس کے رکھ دیں گے - گاہک کا جی چاہے اٹھائے جی چاہے نہ اٹھائے - جو صاحبان تصانیف یا صاحبان مطابع اس معیار کو منظور فرمائیں ، تنقید کی فرمائش کریں ورنہ لکھ دیں کہ وہ صرف تقریظ چاہتے ہیں - ہمارے ہاں کی تقریظ "رشحۂ قلم جواہر رقم" تو نہ ہوگی - اس پرانے رنگ میں کسی قدر ترمیم کی جائے گی - اس تقریظ کی تعریف یہ ہوگی :

دندان تو جملہ در دہان اند چشمان تو زیر ابروان اند

یہ بتا دیا جائے گا کہ کس مضمون کی کتاب ہے ، کون صاحب مصنف ہیں ، کیسی چھپی ہے ، کیا قیمت ہے - شاید تقریظ کا یہ بہت درست مفہوم نہیں مگر چونکہ تقریظ اپنے آپ کو اس درجے سے بھی گرا چکی ہے اس لیے ہم اس سے یہ اصطلاحی مطلب لیتے ہیں -

اگر کوئی صاحب یہ تحریر فرمائیں گے کہ وہ تقریظ چاہتے ہیں یا تنقید تو ہمیں اختیار ہوگا کہ دونوں میں سے کوئی پسند کریں -

* * *

نظمِ آزاد[1]

کچھ عرصہ ہوا شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد دہلوی کے کلامِ منظوم کا ایک دلچسپ مجموعہ شائع ہوا تھا جس کا عنوان یہ تھا : ''نظمِ آزاد جو قیدِ حسن و عشق سے آزاد ہے'' ۔ مولوی آزاد نے جو رتبہ اُردو زبان کے اعلیٰ ترین مصنفوں میں پایا ہے ، محتاجِ بیان نہیں ۔ خصوصاً نثر کے میدان میں تو وہ معاصرین سے گوئے سبقت لے گئے ہیں ۔ نظم جدید رنگ میں کبھی کبھی کہتے تھے اور طبیعت کی تیزی قیدِ حسن و عشق سے نکل کر بھی اپنے جوہر دکھاتی تھی ۔ اب ایک عرصے سے اُردو علمِ ادب کی بدقسمتی نے ملک کو اُن کی دماغی خدمت سے محروم کر دیا ہے اور اُن کی مفید تصنیفات اور تالیفات کا سلسلہ بند ہوگیا ہے ۔ اُن کی نثرِ موزوں کی اب صرف یاد باقی ہے اور نظمِ آزاد کی فقط کہانی زبانوں پر ہے ۔ جن لوگوں نے وہ زمانہ دیکھا ہے جب پنجاب میں پہلے پہل تعلیم کا چرچا ہوا اور لائٹنر[2] صاحب مشہور جرمن علامہ نے دارالخلافہ پنجاب میں دارالعلوم کی بنیاد ڈالی اور اطراف و جوانب سے سخن داں اور سخن فہم لوگ

---

۱ ۔ منقول از ماہنامہ مخزن ، بابت نومبر ۱۹۰۱ع (جلد ۲ نمبر ۲) ، صفحہ ۲۶ تا ۳۱ ۔

۲ ۔ ڈاکٹر جی ۔ ڈبلیو ۔ لائٹنر (۱۸۳۲ع — ۲۲ اپریل ۱۸۹۹ع)، گورنمنٹ کالج و اورینٹل کالج لاہور کے پہلے پرنسپل اور پنجاب یونیورسٹی کے رجسٹرار ۔ نہایت باذوق ، ذی علم اور فاضل انسان ، مشرقی علوم کے جیّد عالم ، ماہرِ تعلیم و منتظم ۔ انگریزی کے علاوہ اردو میں بھی آپ نے کتابیں لکھیں ، جن میں عربی 'صرف و نحو' اور 'سنین اسلام' قابلِ ذکر ہیں ۔ ڈاکٹر لائٹنر انجمنِ پنجاب کی روحِ رواں تھے ۔

جوہر سخن کی قدردانی دیکھ کر لاہور کی طرف چھکے ، انھیں یاد ہوگا کہ جو مشاعرے انجمن پنجاب[۳] کے متعلق ڈاکٹر لائٹنر کی سرپرستی سے ہوتے تھے اور جن میں مشتاقان سخن بلا قید مذہب و ملت جوق جوق آتے تھے ، ان میں گلشنِ ذوقؔ دہلوی کا یہ عندلیب کس انداز سے چہکتا تھا ۔ فصاحت اس کے کلام پر نثار ہوتی تھی اور بلاغت اس کی طرزِ ادا پر فدا تھی ۔ دہلی کے علوم و فنون کے باغ پر جب غدر کی خزاں آئی اور کئی بڑے بڑے درخت جڑ سے اُکھڑ گئے ، کئی پودے سوکھ گئے ، کئی پھول مُرجھا گئے اور کئی غنچے بن کھلے مرجھا گئے تو چند مرغانِ چمن نے اس اُجڑے دیار سے کوچ کر کے خطۂ پنجاب کو آ بسایا ۔ گو اس ملک میں وہ گل بوٹے جو ان کے مایۂ زندگی تھے ، انھیں نظر نہ آتے تھے تاہم اُنھوں نے یہاں کی سرزمین کو سیراب اور مادۂ قبول سے بہرہ ور پایا اور اُن کی دعائے سحری کے اثر سے دنوں میں پنجاب بھی ایک ہرا بھرا گلزار ہوگیا ، جس میں وہ آزادی سے نغمہ سنجی کرنے لگے ۔ انھی خوش نواؤں میں آزاد بھی تھا ۔ کئی اپنی اپنی بولیاں بول کر اُڑ گئے مگر آزاد کو یہ باغ ایسا بھایا کہ اسی کو اپنا نشیمن بنا لیا اور غربت کو ، جس میں امن نصیب ہو ، آفت زدہ وطن پر جہاں کسی نہ کسی وبال کا سامنا رہتا تھا ، ترجیح دے کر یہیں کا ہو رہا :

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بےمہریٔ یارانِ وطن یاد نہیں ؟

گو دہلی کو آزاد کے زاد بوم ہونے کا فخر ہے اور دہلی کے اساتذہ

---

۳ ۔ انجمن پنجاب ۲۱ جنوری ۱۸۶۵ع کو قائم ہوئی ۔ انجمن کے زیر اہتمام جو مشاعرے منعقد ہوتے تھے ان کے سرپرست ڈاکٹر لائٹنر تھے ۔

کے زیر سایہ ہی آزاد نے تعلیم و تربیت پائی مگر پنجاب سے بھی آسے اب وہ گہرا تعلق ہے کہ پنجاب کو بجا طور پر اس کے وجود پر ناز کرنا بجا ہے ۔ طوفانِ حوادث نے ہمارے طباع مصنف کے لیے استاد شفیق کا کام دیا اور تجربہ کے مدرسے میں اس نے وہ سبق سیکھے جو طبعِ رسا کے سمندِ ناز کے لیے تازیانہ بن گئے ۔ ذوق[1] جیسے استاد کی صحبت سنگِ پارس کا حکم رکھتی تھی ، اس نے سونا کرکے کٹھالی سے نکالا مگر یونیورسٹی کی ملازمت میں مشرق علوم کے قدردانِ انگریزوں کی صحبت سونے پر سہاگہ ہوگئی ۔ سیر و سیاحت اور وسط ایشیا اور ایران کی مجالس نے اس زرِ خالص کو ایسا چمکایا کہ اردو علمِ ادب میں آزاد کا کلام کندن کی طرح دمکنے لگا ۔ "قصصِ ہند" میں وہ سادہ پُرکاری دکھائی ہے کہ سبحان اللہ ! مبتدی پڑھیں تو سب مطالب سمجھ میں آ جائیں ۔ منتہی پڑھیں تو شیرینیٔ کلام کے چٹخارے لیں ۔ "نیرنگِ خیال" میں ایک یونانی طرزِ تحریر کا ایسا نمونہ آڑا لیا ہے کہ یونانی یاد کریں کہ آڑنے والے رنگ یوں آڑا لیتے ہیں ۔ الیگوری انگریزی میں یونانیوں کی تقلید سے کسی زمانے میں بکثرت مروج رہی اور اب تک پسند کی جاتی ہے ۔ اس میں بہت سے ضروری اور مفید مطالب کسی ایسے پیرائے میں بیان کیے جاتے ہیں جس کا ربط ان مطالب سے بظاہر نہ معلوم ہو ۔ مشرق علمِ ادب کے ذخیروں میں مذہبی کتب میں تو اس کا کچھ پتہ چلتا ہے اور مولانا روم[2]

---

۱ ۔ خاقانیٔ ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق (ولادت ۱۲۰۲-۳ھ ، وفات ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۴ع) تصانیف : دیوانِ ذوق جو آپ کے شاگرد رشید مولانا محمد حسین آزاد نے مرتب کیا ۔ مشہور شاعر و قصیدہ گو ۔

۲ ۔ مولانا جلال الدین رومی (وفات ۷ ، دسمبر ۱۲۷۳ع) ۔ علامہ اقبال انھیں "پیر رومی" کے نام سے یاد کرتے تھے ۔ آپ مشہور و معروف فارسی شاعر تھے ۔ آپ کی مثنوی پہلوی زبان میں بہت اونچا درجہ رکھتی ہے ۔

فارسی لکھنے والوں میں اس طرز کے بادشاہ ہیں ۔ مگر جو وسعت مغربی مصنفوں نے اس کو دی ہے اور جس حد تک انھوں نے استعاروں کو پھیلا کر طویل کہانیاں بنائی ہیں ، اس کے نمونے ایشیائی تصنیفات میں کمیاب ہیں ۔ اسی سے ظاہر ہے کہ ہم اپنے ہاں اس کے لیے ایک لفظ تلاش کریں تو مشکل سے پائیں ۔ ہاں یہ شعر اس کا مفہوم خوب ادا کرتا ہے :

خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

مگر اردو میں "نیرنگ خیال" نہایت عمدہ اور کامیاب الیگوری ہے ۔ "آب حیات" میں آزاد نے دریا کو کوزے میں بند کیا ہے اور زبان اردو کے اُستادوں کے کلام پر اپنے عبور اور ان کے حالات کی نسبت اپنی واقفیت کا ثبوت دیا ہے ۔ یہ کتاب نہایت مقبول ہوئی ہے اور کئی دفعہ چھپ کر ہاتھوں ہاتھ بک چکی ہے ۔

"دربار اکبری" کے نورتن اگرچہ آزاد کے زمانۂ علالت میں مولوی ممتاز علی صاحب کی کوشش سے چمکے ہیں مگر انھیں آزاد نے دربار میں اپنی صحت کے دنوں میں اپنے ہاتھوں سے ہی بٹھایا تھا ۔ "دیوانِ ذوق" جہاں تک مکمل دستیاب ہو سکا مع تمہیدوں اور حواشی کے چھپوا کر ذوق کا حق استادی ادا کیا گیا ہے اور جو چھوٹی چھوٹی درسی تالیفات آزاد ، کیا اُردو کیا فارسی ، ملک بھر میں مروج ہیں وہ ان کے علاوہ ہیں ۔

گو عارضۂ دماغی نے آزاد کے فیضان سے ملک کو محروم کر دیا مگر یہ ایک طرفہ تماشہ ہے کہ مولانا کا کام کا عادی دماغ علالت

میں بھی بیکار نہیں رہ سکا اور اشہب قلم صفحہ کاغذ پر برابر گھوڑ دوڑ کرتا رہا۔ اس دوڑ دھوپ کا ایک نتیجہ تو کتاب "سپاک نمک" ہے جو مطبع رفاہ عام لاہور نے ایک اعجوبہ کے طور پر چھاپی ہے تاکہ لوگ دیکھ سکیں کہ عالی دماغوں کی بیماری بھی دوسرے دماغوں کی بیماری سے کتنی مختلف ہوتی ہے۔ وہ کتاب کسی ایسے شخص کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے جو کسی نئے مذہب کا بانی ہونا چاہیے۔ اور عجب نہیں آن دنوں ایسے ہی خیالات مولانا کے دل میں جاگزیں ہوں۔ دوسرا نتیجہ ان دنوں کی سرگرمی کا غزلیات ہیں۔ پرانی مشق کی غزلیں جو کبھی کسی کو دکھاتے بھی نہ تھے آج کل نکال نکال کر پڑھتے ہیں اور نئی غزل کہتے ہیں۔ علم قلب انسانی کے ماہر اس بات کو اچھی طرح سمجھ سکیں گے کہ علالت میں مولانا کی طبیعت نے مدت کے بعد غزل کی طرف کیوں رجوع کیا ہے۔ اس میں تو شک نہیں ہے کہ ابتدائی عمر میں مولانا آزاد نے غزل گوئی میں خوب زور مارا ہوگا۔ گو جوانی میں ضروریات زمانہ کے احساس سے اپنی شاعری کا رنگ بدل دیا اور زیادہ پختہ کاری نے نثر کو ترقی دینے کی سجھائی، لیکن جب اس فکر سے فراغت ہوئی کہ ضروریات زمانہ کیا چاہتی ہیں، پھر وہی پرانا رنگ غالب آیا۔ آج کل غزل گوئی مقبول مشاغل میں ہے اور یہ مزے کی بات ہے کہ اس میں کسی دماغی عارضے کا اثر نظر نہیں آتا البتہ تصوف کا رنگ غالب ہے۔ غزلوں پر غزلیں لکھتے ہیں اور بے پروائی سے رکھ دیتے ہیں۔ مگر یہ پسند نہیں کرتے کہ کوئی ان کو لے جائے یا چھپوائے۔ چونکہ ہم ان لوگوں میں ہیں جو آن کے ہر قسم کے کلام کے ہر وقت مشتاق رہتے ہیں اور ہمیں بہت سے احباب کا بھی حال معلوم ہے جو مولانا کے

کلام کو نہایت شوق اور ادب کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اس لیے ہم نے یہ گستاخانہ کوشش کی ہے کہ ہم مولانا کی غزلیات کچھ نئی کچھ پرانی اپنے ناظرین کے لیے حاصل کریں ۔ ہم اُمید کرتے ہیں کہ دستِ شوق کی یہ گستاخی مولانا بھی قابلِ معافی سمجھیں گے اور کبھی کبھی شائقین کو اپنے کلام سے مستفید ہونے کا موقع دیں گے ۔ ہمارے مہربان آغا محمد ابراہیم صاحب جو مولانا کے فرزند رشید ہیں ان غزلوں کے ہم پہنچانے کے لیے خاص شکریے کے مستحق ہیں :

غزلیاتِ اُردو

اس دل پُر داغ سا گلشن میں اک لالہ تو ہو
پر یہ گل جیسا ہے کوئی دیکھنے والا تو ہو
آفریں ہمت کو اس کے دل کی جس نے عشق میں
جان تک پیاری نہ کی ایسا جگر والا تو ہو
ہم تو قیس و کوہکن کے بھی تماشے بھلا دیں
لیلیٰ و شیریں سا کوئی دیکھنے والا تو ہو
ایک ہی ساغر میں کچھ ایسا پلا دے ساقیا
بےخبر دنیا و دیں سے تیرا متوالا تو ہو
ہاتھ خالی مردم دیدہ بتوں سے کیا ملیں
موتیوں کی پنجۂ مژگاں میں اک مالا تو ہو
ناخنِ خار آ کے خود عقدہ ترا کر دے گا وا
پہلے پائے شوق میں پیدا کوئی چھالا تو ہو
کچھ نہ کچھ آزاد کو بھی چاہیے دل بستگی
گو نہ ہو بت خانۂ چیں ، سیرِ بنگالہ تو ہو

مثال ابر کرم فیض عام کرتے ہیں
وہی ہیں خوب کہ خو خوب کام کرتے ہیں
نہ کیوں کہ اہل کرم ہووئیں کامیاب جہاں
کہ ہیں یہ کام جو کرتے وہ کام کرتے ہیں
ہزاروں قافلے حسرت کے دشت غربت میں
ہمارے خانۂ دل میں مقام کرتے ہیں
دلوں میں کرتے جو اُلفت سے ہیں جہانداری
جہاں کو ایک نظر میں غلام کرتے ہیں
ہیں اہل دل ابھی زندہ کہ ذکر خیر ان کے
دلوں سے آ کے سلام و پیام کرتے ہیں
دکھا کے سبزۂ جنت کے باغ سبز آزاد
غزال نفس رمیدہ کو رام کرتے ہیں

جو نالوں سے مرے دل کے تہ و بالا جہاں ہوتا
تو پھر نیچے زمیں ہوتی اور اوپر آسماں ہوتا
بَلا سے دشمن جانی مرا سارا جہاں ہوتا
کسی صورت سے اے جان جہاں تو جانِ جاں ہوتا
تمہارے بیدلوں کی خاک اگر صرف چمن ہوتی
تو ہر اک شاخ گل پر جائے غنچہ گل عیاں ہوتا
جو کوئی چوٹ دل کے ساتھ تیشے کے اثر کرتی
تو جائے آب ہر چشمے سے شیریں خوں رواں ہوتا
دل نالاں جرس کی طرح آ جاتا ہے جنبش میں
رواں سینے سے جب ہے آنسوؤں کا کارواں ہوتا

صنم ہے گردش عالم نگاہِ مہر سے تیری
اگر تو مہرباں ہوتا تو عالم مہرباں ہوتا
خدا کے واسطے آزاد روکو نالۂ دل کو
کہ کوئی آن میں کون و مکاں ہے لامکاں ہوتا

ہے کہاں سے تو نے یہ طرزِ ستم ایجاد کی
دھوم ہے بیداد گر ہر سو تری بیداد کی
پوچھتا حالت ہے کیا میرے دلِ ناشاد کی
آہ کی ہمت نہیں ، طاقت نہیں فریاد کی
ہل بے سوزِ دل کہ ہے بدلے لہو کی بوند کے
آبلہ آتا زباں پر نشترِ فصّاد کی
آب داری کے لیے محتاج خاکستر ہوا
مفت آئینے نے اپنی آبرو برباد کی
گریۂ حسرت ہے یہ کس کا کہ اے دل اب تلک
جوئے اشک آنکھوں سے جاری ہے ہل بغداد کی
سرو ساں زنجیرِ الفت سے ہے پابندِ چمن
نام کو آزاد ہے ، حالت ہے یہ آزاد کی

غیرِ دیدارِ صنم گر ہو سروکار مجھے
تو میسّر نہ ہو اللہ کا دیدار مجھے
تیری الفت نے کیا جینے سے بیزار مجھے
جان سے کھوتا ہے پیارے یہ ترا پیار مجھے

دیتے کیا کیا ہیں دلاسے شبِ فرقت میں بہم
دلِ بیار کو میں اور دلِ بیار مجھے

حقِ خدمت میں ملے دیکھیے کیا حضرتِ دل
کہ ہے قسمت سے ملی عشق کی سرکار مجھے

دیکھنا قیدِ تعلق میں نہ آنا آزاد
دام آتے ہیں نظر سبحہ و زنّار مجھے

* * *

”حیاتِ جاوید“ پر ایک تنقیدی نظر[1]

۱۹۰۱ع میں اردو علم ادب کے سرمائے میں ایک قابل قدر اضافہ ہوا یعنی مولانا الطاف حسین صاحب حالی پانی پتی جیسے مشہور مصنف کے قلم سے سرسید احمد خاں مرحوم جیسے نامور محسن ملک و قوم کے حالاتِ زندگی ایک ضخیم کتاب کی صورت میں شائع ہوئے ہیں جس کا نام ”حیات جاوید“ تھا۔ یہ بلا تأمل کہا جا سکتا ہے کہ اس سے موزوں تر نام ایسی کتاب کے لیے ملنا مشکل ہے۔ اس ملک میں اور زمانۂ حال میں اگر کسی مسلمان سے ایسے کام بن پڑے ہیں جن کے سبب وہ جاودانی زندگی کا مستحق ہو اور اُس کا نام قائم رہے، جب تک کہ مسلمانان ہند قومی حیثیت سے زندہ ہیں، تو وہ سر سید احمد خاں تھا۔ اور اُس کی حیات کے سوانح کو ”جاوید حیات“ کہنا بالکل حق بجانب ہے۔ یہ کتاب شائع ہوتے ہی مقبول ہوئی بلکہ شاید یہ کہہ دینا داخل مبالغہ نہیں کہ چھپنے سے پہلے مقبول ہو چکی تھی۔ لوگ اس کے منتظر تھے۔ اس کا مطبع سے نکلنا تھا کہ قبولِ عام استقبال کو دوڑا اور ہردلعزیزی نے قدم لیے۔ دام بھی حجم اور حسنِ طبع کے اعتبار سے زیادہ نہ تھے۔ ہاتھوں ہاتھ بک گئی۔

۱۔ ماہنامہ ”مخزن“ اکتوبر ۱۹۰۳ع (جلد ۶ نمبر ۱) ص ۱—۱۱۔ شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی (۱۸۳۷ع—۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ع) کی یہ کتاب ۱۹۰۱ع میں منظرِ عام پر آئی۔ آپ کی دیگر تصنیفات میں ”مقدمۂ شعر و شاعری“، ”حیاتِ سعدی“، ”یادگارِ غالب“ ”مجالس النساء“، ”مسدسِ حالی“ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

بعض بڑھیا قسم کی جلدیں تو بہت جلدی ختم ہوچکیں اور جو باقی تھیں وہ رفتہ رفتہ بکتی جاتی ہیں ۔ گو اس کامیابی کی جو کسی ایسے مصنف کی کتاب کو جس میں کسی ایسے یگانۂ روزگار کے حالات درج ہوں انگلستان جیسے ملک میں ہوتی تو توقع ہی نہ تھی مگر اس ملک کے اعتبار سے جس قدر کی نگاہ سے اس کتاب کو دیکھا گیا اور جو کامیابی اسے ہوئی وہ بہت غنیمت ہے ۔ اور یہ امید دلاتی ہوں کہ وہ زمانہ روز بروز قریب آتا جاتا ہے کہ جب عمدہ اور مفید کتابیں زبان اردو میں بکثرت لکھی جائیں گی اور بکثرت بکیں گی ۔ ہم اس کتاب کے قابل اور واجب التعظیم مصنف کو اس کامیابی پر صدق دل سے مبارک باد دیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اگر طبع ثانی کی نوبت آئے تو انہیں اس سے بھی زیادہ کامیابی ہو کیونکہ یہ اوراق سالہا سال کی جگر کاوی کا نتیجہ ہیں ۔ مدتوں مولانا حالی اس دھن میں رہے ہیں کہ سرسید کی سوانح عمری لکھیں جب کہیں جا کر یہ جلد تیار ہوئی ہے ۔ یہ کتاب شائع ہوتے ہی 'مخزن' کو بغرض تنقید عطا ہوئی ۔ ہم نے اسے بغور پڑھا اور پڑھ کر حضرت مصنف کو اطلاع دی کہ اس پر بہت آزادانہ اظہار رائے کی ضرورت معلوم ہوتی ہے ۔ انہوں نے بکمال دریا دلی اجازت دی کہ پوری آزادی سے تنقید لکھی جاوے ۔ یہ اجازت ہمارے ملک میں ہر مصنف نہیں دے سکتا ۔ یہ مولانا حالی کا ہی حصہ تھا ۔ موجودہ زمانے کے سرکردہ اہل قلم میں مولانا ہی پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے اپنی کتابوں میں انگریزی کے آزادانہ رنگ میں تنقید کے لیے قلم اٹھایا ہے اور منصفانہ رائیں دی ہیں اس لیے یہ نہایت مناسب معلوم ہوتا تھا کہ ان کی سب سے بڑی تصنیف پر ہی 'مخزن' میں سب سے پہلے اس قسم کی بے دھڑک رائے لکھی جاوے

جس کی ملکی علم ادب کی ترقی کے لیے ضرورت ہے ، اور جس کے کبھی کبھی لکھتے رہنے کا کام ہم نے ایک ابتدائی مضمون میں ، جو بہ عنوان ''فن تنقید'' شائع ہوا تھا ، وعدہ کیا تھا ـ اتنے عرصے تک سکوت اس لیے اختیار کیا گیا کہ کہیں آزاد تنقید کا مضر اثر کتاب کی خریداری پر نہ پڑے ، کیونکہ باوجود اُس ساری نکتہ چینی کے جو اس کتاب پر ہو سکتی ہے اس میں شک نہیں کہ یہ کتاب اردو میں اس ضخامت اور خوبی کی اپنی قسم کی پہلی ہی کتاب ہے جس کا پڑھنا ہر اُردو خواں کے لیے بالعموم اور ہر مسلمان کے لیے بالخصوص نہایت ضروری اور مفید ہے ـ اب چونکہ کافی عرصہ اس کو چھپے ہوئے گزر چکا ہے اور ایک معتول حد تک خریداری ہو چکی ہے ، اب ہم چاہتے ہیں کہ بالکل صفائی سے اُن خیالات کا اظہار کر دیں جو اس کو پڑھتے ہوئے ہمارے دل میں پیدا ہوئے تھے اور جن کا قابل مصنف تک پہنچنا خالی از فائدہ نہ ہوگا ـ کیونکہ ممکن ہے کہ اگر بعض نکات پر اُن کی رائے ہماری رائے سے متفق ہو تو طبع ثانی اُن نقائص سے ، جو اس کتاب میں رہ گئے ہیں ، مبرا ہو کر نکلے اور آئندہ کے لیے تنقید کا راستہ صاف ہو جائے ـ اور لوگوں کو یہ معلوم ہوجائے کہ جب وہ تمام عقیدت اور ارادت متدانہ خلوص ، جو ہم مولانا موصوف سے رکھتے ہیں ، ہمیں ان کی کتاب پر آزادانہ تنقید لکھنے سے روک نہیں سکے تو بہ دیگراں چہ رسد ـ اگر ہمارے ہاں کتابیں بھیجیں تو صاف صاف بات سننے کے لیے تیار رہیں ـ یہ ممکن ہے کہ کبھی ہماری صاف گوئی غلطی پر مبنی ہو ، مگر یہ کوشش کی جائے گی کہ جو کچھ کہا جائے ایمان داری سے کہا جائے اور بے لاگ ہو ـ جہاں یہ بات تعجب خیز ہے کہ سر سید احمد خاں جیسے فرید الدہر کے

انتقال کے بعد صرف ایک کتاب اردو زبان میں ان کے حالات پر لکھی جائے وہی یہ کچھ کم حیرت انگیز نہیں کہ "حیات جاوید" کی سی کتاب پر اس قدر تھوڑے ریویو لکھے جائیں ۔ یوں تو کئی اخباروں میں مختصر طور پر رسمی تعریف چھپ گئی ہوگی ، مگر جہاں تک ہمیں علم ہے صرف تین چار مشہور اہل الرائے حضرات نے اس پر بسیط رائیں لکھیں ۔ ان میں سب سے چلی اور سب سے مفصل رائے رسالہ 'معارف' میں (جس کے بند ہو جانے پر رہ رہ کے افسوس ہوتا ہے) اس کے لائق ایڈیٹر مولوی وحید الدین سلیم نے لکھی تھی جو مولانا حالی کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں ۔ آنھوں نے کتاب کی تعریف کا تو حق ادا کر دیا مگر تصویر کے دوسرے رخ پر یا تو جوش ارادت نے آنھیں نظر ڈالنے کی اجازت ہی نہیں دی یا آنھوں نے کتاب کو انگریزی رسم تنقید کی عینک لگا کر نہیں دیکھا اور انگریزی سوانح عمریوں کے معیار سے نہیں جانچا ۔ اس کے علاوہ ایک ریویو 'علی گڑھ گزٹ' میں شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ صاحب کے قلم سے نکلا تھا مگر وہ تو بالکل مایوسی بخش تھا اور جس قسم کے "ریویو" کی توقع آن سے ہوسکتی تھی آس کے برعکس تھا ۔ ہاں ایک قابل قدر تنقید نہایت برجستہ الفاظ اور شستہ عبارت میں ضلع علی گڑھ کے ایک فاضل رئیس مولوی حبیب الرحمان خاں حسرت شروانی نے لکھی تھی جو لفظ تنقید کی مستحق تھی ، مگر وہ کتاب کے صرف ایک پہلو کا موازنہ تھا ۔ آس میں زیادہ تر آس حصہ کتاب پر اعتراضات تھے جو سرسید مرحوم کی مذہبی حیثیت سے متعلق تھا اور جس میں خان صاحب موصوف کے نزدیک مولانا حالی طرف داری ہے ، جو مؤرخ اور سوانح نگار سے کوسوں دور ہونی چاہیے ، پوری

گریز نہیں کر سکے تھے ۔ گو اس بارے میں خان صاحب کے خیالات سے جو اُس مضمون میں ظاہر ہوئے تھے ہمیں پورا اتفاق نہ ہو ، تاہم انہیں بحیثیت مجموعی دوست سمجھتے ہیں اور اس لیے تنقید کے اس ایک پہلو پر اس مضمون میں کچھ نہیں لکھیں گے ۔ یہ فرض حسرت شروانی بخوبی ادا کر چکے ہیں ۔ ہم اس کتاب کو سوانح نگار اور ادیب کی نظر سے دیکھیں گے اور جو نقص ان اعتبارات سے اس میں نظر آئیں گے وہ ظاہر کرنے کی کوششیں کریں گے ۔

مشہور لوگوں کی سوانح عمری پر کتابیں لکھنا ، خصوصاً اُس طرز میں جو اُردو میں مولانا حالی نے اختیار کی ہے ، ہندوستان میں ابھی ایک جدید فن ہے جو مغرب سے مستعار لیا گیا ہے اور جس کے اعلیٰ نمونے اس وقت مغربی زبانوں کے ادبی ذخیروں میں موجود ہیں ۔ پس اگر سوانح عمری کے متعلق کسی تصنیف کو جانچتے ہوئے ہم مغربی معیار پیش نظر رکھیں تو کچھ بےجا نہ ہوگا ۔ انگریزی میں بہترین سوانح عمری وہ گنی جاتی ہے جس میں ممدوح کی بولتی چالتی تصویر دکھا دی جائے ۔ زمانۂ حال میں کئی اس قسم کی کتابیں وہاں لکھی گئی ہیں ، مگر سب سے پہلی کتاب جس نے اس بارے میں انگلستان میں شہرت حاصل کی اور جو شہرت لازوال ثابت ہوئی ہے ، وہ باسویل کی تصنیف کردہ ''حیاتِ جانسن'' ہے ۔ ڈاکٹر جانسن اٹھارھویں صدی عیسوی میں گزرے ہیں ۔ انھوں نے انگریزی زبان کی سب سے پہلی اور مستند لغت تصنیف کرنے سے نام پیدا کیا ، اور ویسے بھی اُن کی بہت سی تصانیف نظم و نثر متداول ہیں ۔

ان کی زندگی ، طرزِ بود و باش ، رفتار و گفتار ، تقریر و تحریر

کا جو سچا اور ہوبہو چربا باسویل نے آتارا ہے ، وہ آسی پر ختم ہے ۔
باسویل گو مولانا حالی کی طرح اپنے ملک کے مشہور اہل قلم میں سے نہ
تھا اور نہ ''حیات جانسن'' کے سوا کوئی اور کتاب باعث شہرت
چھوڑ مرا ہے مگر ''حیات جانسن'' لکھنے میں آس نے سوانح نگاری
کے مراتب ایسی خوبی سے ادا کیے ہیں کہ خود اپنے لیے بھی
ایسا نام پیدا کر گیا کہ کہا جاتا ہے کہ جب تک انگریزی زبان
زندہ ہے ، آس کا نام بھی زندہ رہے گا ۔ اس کامیابی کا کیا راز تھا ؟
صرف یہی کہ جس دن سے آسے خیال پیدا ہوا کہ جانسن کی حیات لکھی
جاوے ، آسی دن سے آس نے اپنے آپ کو جانسن کے ساتھ وابستہ
کرلیا ۔ سفر میں حضر میں ہر وقت ساتھ رہتا ۔ آس کی حرکات و
سکنات کو بغور دیکھتا اور آن کا گہرا نقش صفحہ؛ دل پر جاتا ۔ آس
کی باتوں کو بغور سنتا اور انھیں کانوں کے قدرتی فوٹو گراف میں بند
کر لیتا ۔ گھر پہنچتے ہی وہ نقوش صفحہ؛ کاغذ پر آتر آتے اور وہ
آوازیں گوش ہوش کی امانت سے نکلنے تک رقم ہو جاتیں ۔ مدتوں یہ
سلسلہ جاری رہا اور آخرش یہ سواد ترتیب پا کر اس صورت میں آیا
جسے ہم اب دیکھتے ہیں اور دیکھ کر عش عش کرتے ہیں ۔
مولانا حالی کو اول تو وہ مواقع سید احمد خاں مرحوم کے ساتھ
رہنے کے میسر نہ تھے لیکن جس قدر مواقع پھر بھی آنھیں ملے ، آن
میں اگر اس نظر غائر سے کام لیا جاتا جو باسویل نے اپنے ممدوح کے
دیکھنے کے لیے پائی تھی تو بہت کچھ ہو جاتا ۔ مگر مولانا معذور
تھے ۔ انگریزی خیالات اور علوم سے تو انھیں سوائے بالواسطہ واقفیت
ہونے کے براہ راست مس نہ تھا اور خود آردو فارسی میں یہ خیالات
سوانح عمریوں کی نسبت موجود ہی نہ تھے ۔ انھوں نے نئے رنگ میں

جو کچھ کہا ، آن کی پرانے زمانے کی تربیت اور محدود انگریزی معلومات کے لحاظ سے تعجب خیز ہے ۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ آیا "حیات جاوید" بحیثیت سوانح عمری ایسی چیز ہے جیسی ہونی چاہیے یا اس سے کم ؟ ہمارا جواب یہ ہے کہ "حیات جاوید" کا بیشتر حصہ سر سید مرحوم کی بیرونی زندگی اور امور رفاہ عام کے ساتھ آن کے تعلقات کے بیان سے گھرا ہوا ہے اور اس سے یہ مطلب حل نہیں ہوتا کہ اس کو پڑھ کر وہ شخص ، جسے پہلے مرحوم کی نسبت کچھ معلوم نہ ہو اور جس نے الھیں دیکھا بھی نہ ہو ، معقول اندازہ لگا سکے کہ وہ بحیثیت انسان کس پائے کا آدمی تھا ۔ آس میں بزرگی کی کیا کیا علامتیں تھیں ، آس کی بزرگی کے کیا کیا اسباب تھے اور آس کے بچپن میں کچھ شہادت بڑے ہو کر بڑا آدمی بننے کی موجود تھی یا نہیں ۔ گویا یہ حیات نہ صرف ایک تصویر کی حیثیت سے غیر مکمل ہے بلکہ ایک بڑے آدمی کی بڑائی کا آغاز سے لے کر انجام تک سلسلہ دکھانے سے قاصر ہے اور انگریزی میں ایک سوانح عمری کا یہ جزو ضروری ہے ۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ کسی مشہور آدمی کی اوائل عمر کے صحیح حالات جمع کرنا بہت سی مشکلات پیدا کرتا ہے اور یہ دقت ہمارے ملک میں اور بھی زیادہ ہے لیکن یہی وہ حصہ سوانح عمری لکھنے کے کام کا ہے جس پر سوانح نگار کو اپنی پوری ہمت اور توجہ صرف کرنی چاہیے کیونکہ اسی حصے کے واقعات میں ممدوح کی آیندہ بڑائی کے راز چھپے ہوتے ہیں اور اسی سنگلاخ زمین کے کھودنے سے سوانح نگار کو کامیابی کے جواہر بے بہا مل سکتے ہیں ۔ ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ باوجود اس امر سے واقف ہونے کے کہ بچپن کا اثر بقیہ زندگی پر کیا ہوتا ہے ؟ جیسا کہ وہ

خود اپنی کتاب میں یہ وضاحت لکھتے ہیں - مولانا حالی نے سید احمد خاں مرحوم کے بچپن کے متعلق یہ کیوں کر باور کرلیا کہ ''ان کے بچپن میں جسمانی صحت کے سوا کوئی ایسی خصوصیت ، جس سے آن کے بچپن کو معمولی لڑکوں کے بچپن پر بے تکلف فوقیت دی جا سکے ، نہیں پائی جاتی تھی - یعنی جیسے کہ بعضے بچے ابتدا میں نہایت ذکی اور طباع اور اپنے ہمجولیوں میں سب سے زیادہ تیز اور ہوشیار ہوتے ہیں، آن میں کوئی اس قسم کا صریح امتیاز نہ تھا - خود ''حیات جاوید'' میں جہاں تک حالات سید احمد خاں کے بچپن کے درج ہوئے ہیں آن میں اندرونی شہادت آن کی ذہانت ، طباعی اور تیزی کی کسی حد تک موجود ہے اور ہم یقین کامل رکھتے ہیں کہ اگر کسی طرح سے زیادہ کرید اُس زمانے کی نسبت کی جاتی تو اور بھی ثبوت اس امر کے ملتے کہ ہونہار بروا کے چلے ہی سے چکنے چکنے پات تھے - چونکہ مولانا نے اس مقصد کو اتنا اہم نہیں سمجھا جتنا کہ وہ فی‌الواقع ہے اسی لیے انھیں پہلے باب میں سید احمد خاں کے خاندانی حالات اور ابتدائی سوانح مختصراً بیان کرنے کے بعد اس معذرت کی ضرورت محسوس ہوئی - وہ لکھتے ہیں : ''سر سید کے خاندان کا حال جس‌قدر کہ ہم نے لکھا ہے ، شاید ناظرین کتاب اُس قدر ضرورت سے زیادہ خیال کریں - لیکن بائیو گرافی کا اصل مقصد ، جو ''ہیرو'' کے اخلاق و عادات و خیالات کا دنیا پر روشن کرنا ہے ، وہ اس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک یہ نہ دکھایا جائے کہ ''ہیرو'' میں اخلاق و عادات اور خیالات کہاں سے آئے - ہمارے خیال میں بجائے اس معذرت کے اس سے بھی زیادہ تفصیل کی ضرورت تھی - جو کچھ سید احمد خاں آخر کار بنیں گے اور جو مفید کاموں میں انھوں نے کار گزاریاں کیں آن کا بیان اس شرح وبسط کے ساتھ

اتنا ضروری نہ تھا جتنا ابتدائی حالات زندگی کا۔ وہ باتیں تو اب زمانہ جانتا ہے اور الهی کی وجہ سے سب کو جستجو ہے کہ دیکھیں اس نمایاں زندگانی کی ابتدا کیسی تھی۔ اسی کے بیان میں سب سے زیادہ دلچسپی پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ ہمارے لائق مصنف نے وہیں اختصار سے کام لیا۔

بچپن سے جوانی تک اور جوانی سے بڑھاپے تک کے زمانے میں ضروری تفریق کرنے اور اس کے مدارج ترتیب وار دکھانے کی اہمیت کا پورا اندازہ نہ کرنے کے باعث ہی مولانا حالی ایک اور باریک سی غلطی میں پڑے ہیں ؛ اور وہ یہ کہ انھوں نے ابتدائی زندگی کے حالات لکھتے ہوئے بھی سید احمد خاں مرحوم کو سرسید کے خطاب سے یاد کیا ہے۔ دیباچہ چھوڑ کر اصل کتاب صفحہ پندرہ سے شروع ہوتی ہے۔ اس میں پہلے صفحے پر تو بیشک یہ لکھا ہے کہ "سید احمد خاں ۱۷۔ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دلی میں پیدا ہوئے لیکن آگے چل کر اسی پہلے باب میں جابجا انھیں "سرسید۔ سرسید" لکھا ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ بعض مقامات پر محض اس لفظی ہیر پھیر میں گویا ایک قسم کی تاریخی غلطی پیدا ہو گئی ہے جو مذاق صحیح کو کھٹکتی ہے۔ مثلاً صفحہ ۳۲ میں لکھا ہے : "۱۸۲۵ء میں سرسید فتح پور سیکری سے جہاں وہ خود منصف تھے دلی آئے۔" مگر ۱۸۲۵ء میں سرسید کا وجود کہاں تھا۔ سید احمد خاں تو البتہ موجود تھے مگر "سر" کا تو کسی کو خواب و خیال بھی نہ تھا۔ یا صفحہ ۳۴ میں درج ہے : "سرسید کو اول حاتم علی خاں کی والدہ نے دودھ پلایا" یا صفحہ ۳۵ میں "بچپن میں سرسید پر تو ایسی قید تھی" یہ اور ایسی اور عبارتیں ظاہر کرتی ہیں کہ اس بات کا التزام

نہیں کیا گیا کہ سید احمد خاں کے بچپن اور جوانی کے بیان میں اور اُس بوڑھے سید احمد خان کے بیان میں ، جو مسلمانوں کا مسلمہ سرگروہ اور خطاب ''سر'' سے مخاطب تھا ، ایک صاف امتیازی لکیر رکھی جاوے اور دونوں کو ملا کر بے لطفی نہ پیدا کی جائے ۔ سوانح عمری کیا ہوتی ہے ؟ ایک سچا ناول ۔ لکھنے والے کی کوشش ہونی چاہیے کہ اُس میں ناول کا سا مزا ہو ، بلکہ اُس سے بڑھ کر ہو ، کیونکہ ناول ملمع ہے اور سوانح عمری کی کتاب زرِ خالص ۔ ناول میں بڑی خوبی یہی ہوتی ہے کہ جوں جوں واقعات پیش آتے جاتے ہیں اُسی ترتیب کے ساتھ اُن کا تذکرہ ہوتا جاتا ہے ۔ یہ نہیں کہ ایک شخص جو آخر عمر میں کسی سلطنت یا ریاست کے وزیر کے رتبے کو پہنچ جاتا ہے آغاز ہی سے وزیر کے خطاب سے یاد کیا جائے ، بلکہ اس خطاب کا نام بھی نہیں آتا ، تاوقتیکہ اس کا مناسب موقع نہ آجائے ۔ بہت بہتر ہوتا اگر صرف دیباچے کو چھوڑ کر باقی کتاب میں سید احمد خاں کے نام کے ساتھ ''سر'' کا لفظ اُس وقت تک نہ آتا جس وقت یہ خطاب اُنھیں عطا ہوا ہے اور محض اُس تاریخ کے بعد کے واقعات میں ، جب لفظ ''سر'' اُن کے نام کا جزو بن گیا ، یہ نام کے ساتھ شامل کیا جاتا ۔ حیات نویسی کے پہلو سے جہاں مولانا حالی کی کتاب پر مندرجہ بالا اعتراض وارد ہوتا ہے وہیں اس خوبی کا اعتراف بھی کرنا واجب ہے کہ اُنھوں نے اس اصول پر کہ زندگی کے سب حالات ، جو معلوم ہوں ، من و عن کہہ دیئے جائیں اور کوئی کوشش بعض واقعات کو بڑھا کر دکھانے اور بعض پر پردہ ڈالنے کی نہ کی جائے ، عمل کیا ہے ، تاکہ لوگوں کو صحیح رائے قائم کرنے کا موقع ملے ۔ مثلاً مولانا

حالی نے سید احمد خاں کے ایامِ جوانی میں رنگین صحبتوں میں شریک ہونے کی جو روایتیں بیان کردی ہیں ، اُن سے نہ صرف انتہائے حق پسندی بلکہ غیر معمولی آزاد خیال کا ثبوت ملتا ہے اور یہ وہ بات ہے جس کی جرأت اس ملک کے سوانح نگاروں میں بہت کم ہے - یہ روایتیں بہت دلچسپ ہیں - مثلاً لکھتے ہیں : ''اُس زمانے میں خواجہ محمد اشرف ایک بزرگ دلی میں تھے ، اُن کے گھر بسنت کا جلسہ ہوتا تھا - شہر کے خوص وہاں مدعو ہوتے تھے - نامی نامی طوائفیں زرد لباس پہن کر وہاں آتی تھیں - مکان میں بھی زرد فروش ہوتا تھا - دالان کے سامنے ایک چبوترہ تھا جس میں حوض تھا - اس حوض میں زرد ہی پانی کے فوارے چھوٹتے تھے - صحن میں جو چمن تھا اُس میں بھی زرد پھول کھلے ہوئے تھے اور طوائفیں باری باری بیٹھ کر گاتی تھیں - سر سید کہتے تھے کہ میں ہمیشہ وہاں جاتا تھا اور اُس جلسے میں شریک ہوتا تھا''۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ایسے بیانات سے کوئی کمی اس وقعت میں ، جو سید احمد خاں مرحوم کی لوگوں کے دلوں میں ہے ، نہیں آسکتی - بلکہ یہ امر قابلِ تعریف معلوم ہوتا ہے کہ باوجود اُن شوقوں کے طبیعت میں موجود ہونے کے ، جو اکثر لوگوں کو مشاغلِ ضروری سے غافل کر دیتے ہیں ، وہ آخر اُن کے ایسے تارک ہوئے اور فرائضِ قومی کو اس طرح سرانجام کیا کہ دنیا دنگ رہ گئی - مولانا حالی کا یہ لکھنا بالکل حق بجانب ہے کہ ''سرسید نے جس حیرت انگیز طریقے سے اپنے تئیں اس دلدل سے نکالا ، حقیقت میں اُن کی زندگی کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے جس کو اُن کی اخلاق طاقت کا سب سے پہلا کرشمہ سمجھنا چاہیے - گویا یہ شعر اُس وقت اُن کے

حسبِ حال تھا :

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

سید احمد خاں کے حالات ملازمت اور ترقی مناصب ، آن کی مفید تالیفات اور آن کی شہرت ، آن کے سرکاری اور غیر سرکاری اعزاز اور خطابات اور آن کی قومی خدمات کا بیان جس بسط معلومات کے ساتھ مولانا حالی نے درج کیا ہے وہ اس کتاب کو بیش قیمت بناتا ہے ، اور یہ وہ مواد ہے جس سے آئندہ زمانے کا کوئی سوانح نگار ، جو سرسید کے حالات پر قلم آٹھائے ، مستغنی نہیں ہوسکتا ۔ ہمیں ضرورت نہیں معلوم ہوتی کہ کتاب کے اس حصے میں زیادہ تفصیل کے ساتھ کچھ لکھیں کیونکہ اس میں مولانا نے کچھ کسر نہیں چھوڑی ۔ بلکہ اقتباسات میں ، جو علی گڑھ اور تعلیمی کانفرنس وغیرہ کے متعلق مشاہیر کی تقریروں یا اخباروں کے مضامین سے لیے گئے ہیں ، ضرورت سے زیادہ طوالت سے کام لیا گیا ہے ۔ اور اچھا ہوتا اگر یہ چھپی ہوئی تقریروں کی نقلیں کم جگہ لیتیں اور آن کی جگہ کوئی دلچسپ خطوط خود سید احمد خاں کے لکھے ہوئے یا اور حالات جو دوسرے مقاموں پر چھپے ہوئے کہیں مل سکتے ، درج کیے جاتے ۔ ہمیں اس بات کا ذاتی علم ہے کہ ملک میں سید احمد خاں کے بےشمار دوستوں کے پاس اب بھی آن کے ایسے ایسے خطوط پڑے ہوئے ہیں جن کا شائع کرنا بہت مفید ہو سکتا ہے اور جن کے پڑھنے سے آن کی زندگی کے حالات پر مزید روشنی پڑسکتی ہے ۔ ایسے حضرات کو چاہیے کہ اس کتاب کی طبع ثانی سے پہلے ایسی چیزیں یا آن کی نقلیں مولانا حالی کی

خدمت میں پہنچا دیں ، تاکہ وہ آن کو کام میں لا سکیں ۔ نیز آن اخباروں اور تقریروں کے انتخابات کو ، جو بارہا چھپ کر لوگوں کی نظر سے گزر چکے ہیں ، نکال کر زیادہ ضروری مطالب کے لیے جگہ پیدا کی جائے کیونکہ دراصل ہمیں اس سے بحث ہے کہ سید احمد خاں کون تھے اور کیا تھے ، نہ اس سے کہ لوگ آن کی تعریف میں کیا عبارت آرائی کرتے تھے ۔ اور آن انتخابات میں ، جن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ، زیادہ تر ایسی ہی عبارت آرائیاں ہیں ۔

مولانا حالی نے اس کتاب میں کہیں کہیں ناظرین پر سر سید مرحوم کی بڑائی کا اثر ڈالنے کی کوشش کی ہے ۔ گو ایسا کرنا سوانح نگار کے لیے جائز ہے لیکن زیادہ خوبی اس میں سمجھی جاتی ہے کہ بڑائی کا نتیجہ ناظر کی طبیعت خود بخود نکالے ۔ وہ خود بخود دیکھے کہ کس کس معاملے میں لوگوں نے ممدوحِ کتاب کی نسبت غلط رائے قائم کر کے اس پر ظلم کیا ہے ۔ کس بارے میں اس نے سینہ زوری سے کام لیا اور لوگ حق پر تھے ۔ کس بات میں وہ زبردست تھا اور کس میں کمزور ۔ خوبیاں اپنے ہمسروں سے بڑھ کر کہاں تک آس کے حصے میں آئی تھیں ، اور انسانی کمزوریوں میں سے کون کون سی اس میں نمایاں تر تھیں ۔

اب ہم اس مشہور کتاب کا امتحان بہ حیثیت سوانح عمری کے ختم کر کے اس کے ادبیانہ پہلو کو لیتے ہیں ۔ اور یہاں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس کتاب نے ہمیں نہایت مایوس کیا ہے اور طرزِ عبارت میں (جسے انگریزی میں سٹائل کہتے ہیں) اور صفائی زبان میں یہ ہرگز ایسی تصنیف نہیں جس کی مولانا حالی کے سے مشاق آ تاد سے

توقع تھی - یا جس کو آئندہ نسلوں کے لیے یا موجودہ زمانے کے طالب علموں کے لیے بطور نمونہ پیش کیا جا سکے - اس میں شک نہیں کہ "حیات جاوید" میں کئی جگہ پُر زور اور دلآویز عبارت کی مثالیں ملتی ہیں - چنانچہ سرسید کی محبت وطن کا ذکر کرتے ہوئے فاضل مصنف نے یہ عبارت لکھی ہے : "اسی وطن کی محبت کا اقتضا تھا جس نے اُن کو اس اُجڑے دیار کے پرانے کھنڈروں اور قدیم یادگاروں کی تحقیقات میں بے انتہا مشقتیں اُٹھانے پر مجبور کیا - اور "آئین اکبری" کی تصحیح نے ، جس میں دلی کے افضل ترین بادشاہ کی ایک دھندلی تصویر کا اُجالنا مقصود تھا ، اُن سے فوق العادت مشقت کرائی - لیکن یہ سب کام ایسے تھے کہ اگر سرسید کی کوششیں انھی کاموں پر ختم ہو جاتیں تو شاید اُن کو ایک محب وطن کی خدمات کا درجہ نہ دیا جائے - مگر جب اُن کی آئندہ مسلسل خدمات پر ، جن کا سلسلہ اُن کے اخیر دم تک برابر جاری رہا ، نظر جاتی ہے تو لامحالہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ ان کے یہ معمولی کام اسی طلائی زنجیر کی ابتدائی کڑیاں تھیں جو زمانہ مستقبل میں اُن کی ملکی اور قومی خدمات سے ترتیب پانے والی تھی -"

دیباچہ کتاب میں ایک اس سے بھی پُر زور عبارت کا نمونہ ہے ، جہاں اصول سوانح نگاری پر بحث کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں : "ہم نے جو دو ایک مصنفوں کا حال اب سے پہلے لکھا ہے اُس میں جہاں تک ہم کو معلوم ہو سکیں اُن کی اور اُن کے کلام کی خوبیاں ظاہر کی ہیں اور اُن کے پھوڑوں کو کہیں ٹھیس نہیں لگنے دی - لیکن اول تو ایسی "ہالیو گرینی" چاندی سونے کے ملمع سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی - اس کے سوا وہ انھی لوگوں کے

حال سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے جنھوں نے اس موج خیز اور پُر آشوب دریا کی منجدھار میں اپنی ناؤ نہیں ڈالی اور کنارے کنارے ایک گھاٹ سے دوسرے گھاٹ صحیح سلامت جا اُترے۔ اُن کو سبھی نے بھلا جانا کیونکہ ان کو کسی کی بھلائی یا برائی سے کچھ سروکار نہ تھا۔ وہ کبھی رستہ نہیں بھولے کیونکہ انھوں نے اگلی بھیڑوں کی لیک سے کبھی ادھر اُدھر قدم نہیں رکھا۔ لیکن ہم کو اس کتاب میں اُس شخص کا حال لکھنا ہے جس نے چالیس برس برابر تعصب اور جہالت کا مقابلہ کیا ہے۔ تقلید کی جڑ کاٹی ہے، بڑے بڑے علما و مفسرین کو لتاڑا ہے، اماموں اور مجتہدوں سے اختلاف کیا ہے، قوم کے پکے پھوڑوں کو چھیڑا ہے اور ان کو کڑوی دوائیں پلائی ہیں، جس کو مذہب کے لحاظ سے ایک گروہ نے صدیق کہا ہے تو دوسرے نے زندیق خطاب دیا ہے، اور جس کو پالیٹکس کے لحاظ سے کسی نے ٹائم سرور سمجھا ہے تو کسی نے نہایت راستباز لبرل جانا ہے۔ ایسے شخص کی لائف چپ چاپ کیونکر لکھی جا سکتی ہے۔ ضرور ہے کہ اس کا سونا کسوٹی پر کسا جائے اور اُس کا کھرا پن ٹھوک بجا کے دیکھا جائے۔" روانی اور زور میں یہ عبارت عمدہ ترین عبارتوں میں شمار ہو سکتی ہے۔ پڑھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے انگلستان کے مشہور نصیح برک کی کوئی تقریر پڑھ رہے ہیں۔ یہ تو اُمید بیجا ہے کہ ساری کتاب میں ایسے زور کے فقرات ہوں، لیکن جس قدر ہیں اُس سے زیادہ ہو سکتے تھے اور ہونے چاہئیں تھے اور کھردرے اور خشک فقرے جس کثرت سے ہیں، اُن سے کم ہونے چاہئیں۔ عبارت کا روکھا پن غیرمانوس اور غیر مستعمل انگریزی الفاظ کی بھرمار سے اور بھی زیادہ

ہوگیا ہے ۔ انگریزی الفاظ کا جا و بیجا استعمال ہمارے خیال میں اس کتاب کے رخسار زیبا پر سب سے بدنما داغ ہے ۔ اکثر انگریزی خواں اس مرض میں مبتلا ہیں کہ اپنی اردو تقریر و تحریر میں حد سے زیادہ انگریزی الفاظ بھر دیتے ہیں ، یہاں تک کہ ایسے لوگ بھی جو بالکل انگریزی سے بے بہرہ ہیں اور اس کلام کو سمجھ ہی نہیں سکتے ۔ اہل نظر زبان دانوں کے نزدیک یہ گناہ قابل معافی نہیں ۔ لیکن یہ گناہ اور بھی بڑا ہو جاتا ہے جب اس کے مرتکب ایسے اصحاب ہوں جن کے ذہن کو انگریزی زبان حقیقت میں چھو بھی نہیں گئی اور جو یوں ہی تقلیدی طور پر سنے سنائے انگریزی الفاظ بکثرت اپنی تحریر میں لے آتے ہیں ۔ چنانچہ اسی بنا پر ہم جناب مولانا کے قلم سے اس قدر تعداد انگریزی الفاظ کی نکلتے دیکھ کر نہ صرف حیران بلکہ افسردہ ہوئے ہیں ۔ اگر زبان کے مسلّم اُستاد اس طرح اجازت عام انگریزی الفاظ کے استعمال کی دینے لگیں اور اس کی مثال قائم کرنے لگیں تو چند سال میں اردو کے پرانے سرمائے میں سے ہماری کتابوں میں صرف کا ۔ کے ۔ کی یا 'ہے' اور 'تھا' ہی نظر آئیں گے اور زبان کی بالکل کایا پلٹ ہو جائے گی ۔ اور اس وقت یہ مسئلہ پیش آئے گا کہ اس طرح انگریزی گوشت پوست ، استخوان لے کر محض ہندوستانی نام رکھنے کا کیا فائدہ ہے ۔ کیوں سیدھی طرح ہم سب انگریزی کو اپنی علمی زبان نہ قرار دے لیں ۔ اگر مولانا اس انجام کے لیے تیار ہیں تو بسم اللہ ! اس سے بھی زیادہ انگریزی الفاظ لکھیں ۔ لیکن اگر اس انجام کو روکنا چاہتے ہیں اور یہ آرزو رکھتے ہیں کہ اردو اپنی خاص شان اور حیثیت سے دنیا میں زندہ رہے تو اس میں انگریزی الفاظ اس نسبت سے داخل کریں جیسے کھانے میں نمک ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ

زبان بڑھتی بھی جائے گی ، بعض اچھے الفاظ اس میں شامل بھی ہوتے جائیں گے لیکن اس کی اپنی حیثیت بھی قائم رہے گی ۔ ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو سرے سے انگریزی الفاظ کی شمولیت ہی کے مخالف ہیں اور آسان ، عام فہم اور مروج الفاظ انگریزی کے استعمال سے بھی پرہیز کرتے ہیں ۔ وہ نہ صرف اقتضائے وقت کی بے فائدہ مخالفت کرتے ہیں بلکہ اصول زبان اردو کے خلاف کاروائی کرتے ہیں ۔ یہ زبان ہندی الاصل ہے مگر اس میں عربی فارسی کے الفاظ بکثرت آگئے ہیں اور آ کر کھپ گئے ہیں ۔ یہاں تک کہ بعض کی نسبت عام طور پر یہ لوگوں کو معلوم نہیں کہ وہ کسی غیر زبان کے لفظ ہیں ۔ تو انگریزی نے ہی کیا گناہ کیا ہے کہ اس کو بالکل دخل نہ دیا جائے ۔ اور اسی لیے تو بعض لفظ انگریزی سے بھی آ کر اس طرح جزو زبان ہوئے ہیں کہ نہ صرف ان کے لیے اور موزوں الفاظ زبان میں نہیں ، بلکہ ان کو بدلنا یا بدلنے کی کوششیں کرنا داخل تصنع اور تکلف ہے ۔ اور اکثر ایسا ہو سکتا ہے کہ اگر آپ انھیں بدل کر اور الفاظ ان کی جگہ لائیں تو سامع مطلب تک آسانی سے نہ پہنچ سکے گا ۔ مثلاً ریل ، سٹیشن ، پلیٹ فارم ، افسر ، جج ، بنچ وغیرہ ۔ ان کو چھوڑنے کی کوشش فضول ہے ۔ ان کے سوا بعض اور الفاظ ہیں جن کے لیے اپنے الفاظ تو ضرور موجود ہیں اور ہو سکتے ہیں ، مگر کثرت استعمال اور عام فہمی ان کے بولنے اور لکھنے کی اجازت دیتی ہے ۔ مثلاً ایڈیٹر ۔ مجسٹریٹ ۔ آنریری ۔ ممبر ۔ کمیٹی ۔ کالج ۔ سکول ۔ یونیورسٹی ۔ ہاسپٹل ۔ اسسٹنٹ ۔ ماسٹر ۔ سٹاف ۔ لیچر ۔ انسپکٹر ۔ آفس ۔ ٹائم ۔ ڈیوٹی ۔ چارج وغیر ۔ ان الفاظ کی ایک نہایت لمبی فہرست تیار ہو سکتی ہے اور یہ فہرست روز افزوں ہے ۔ بعض محتاط طبیعتیں

اب بھی موجود ہیں جو اڈیٹر کو مرتّب - آنریری کو اعزازی - ممبر کو رکن - کمیٹی کو جماعت - کالج کو مدرسۃ العلوم - سکول کو مدرسہ - یونیورسٹی کو دارالعلوم - ہاسپٹل کو شفاخانہ - اسسٹنٹ کو مددگار یا نائب - ماسٹر کو استاد - سٹاف کو عملہ - ٹیچر کو معلم - انسپکٹر کو معائنہ کنندہ - آفس کو دفتر - ٹائم کو وقت - ڈیوٹی کو فرض اور چارج کو جائزہ کہنا پسند کرتی ہیں - اور اس احتیاط کو تحریر و تقریر میں مد نظر رکھتی ہیں - اور ہم یہ کہنے کو تیار ہیں کہ باعتبار زبان وہ پاکیزگی اور فصاحت کے زیادہ قرین ہیں - مگر ساتھ ہی اُن لوگوں کو ، جو بالعادت ان الفاظ کو اور ایسے الفاظ کو بے ارادہ استعمال کرتے رہتے ہیں ، معذور سمجھتے ہیں اور اُن پر کچھ اعتراض نہیں کرتے - لیکن جب ان حدود سے نکل کر کوئی ایسے الفاظ اُردو عبارت میں لکھ دے جن کے معانی سے انگریزی نہ جاننے والے قطعی طور پر نا آشنا ہیں ، جن کا تلفظ فارسی حروف میں ہرگز صحیح طور پر ادا نہیں ہو سکتا ، جنھیں ناواقف غلط پڑھیں گے اور جن کے سبب عبارت مغلق ہو جائے اور عام فہم نہ رہے ، تو یہ صریح نقص ہے - اور بڑے افسوس کی بات ہے اگر یہ نقص مولانا حالی کی تصنیف اور پھر ایسی تصنیف میں ہو جس کے لیے ہم "حیات جاوید" کی دعا مانگتے ہیں - جو عبارت اُوپر نقل کی گئی ہے ، اُس میں بائیوگریفی ، ٹائم سرور ، لبرل ، لائف چار انگریزی الفاظ آئے ہیں - ان میں دو کسی قدر مانوس ہیں 'لبرل' اور 'لائف' - یہ دو الفاظ اخبارات کے ذریعے اکثر اردو خواں اصحاب کی نظر سے گزرے ہوں گے اس لیے انھیں نظر انداز کیا جاتا ہے - گو ہم یہ کہنے سے رک نہیں سکتے کہ 'لائف' کا لفظ ہمیں لفظ 'حیات' کے موجود ہوتے ، جو بالکل وہی معنے رکھتا ہے ، کتاب کے

سرورق پر لکھا جانا کھٹکتا ضرور ہے ۔ مگر انھیں چھوڑ کر 'بائیوگرافی' کی طرف آئیے ۔ ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ اردو خوانوں میں پچاس فی صدی اسے نہیں سمجھ سکتے ۔ اگر اس کی جگہ لفظ 'سوانح عمری' لکھ دیا جاتا تو معلوم نہیں کیا ہرج تھا ۔ آگے آیا 'ٹائم سرور' ۔ اس میں پہلے تو کیا وجہ ہے کہ جس طرح یہ لکھا ہوا ہے اسی طرح اردو خواں بجائے 'ٹائم سرور' نہ پڑھیں ، اور دوسرے کیونکر توقع ہو سکتی ہے کہ وہ اس کے معنے سمجھ جائیں ۔ مگر یہاں تو ایک لفظ کیا سینکڑوں لفظوں کا جھگڑا ہے ۔ چند الفاظ بطور نمونے کے لکھے جاتے ہیں : پبلک ، سپیکنگ ، آرکیو لوجی ، کرٹکل ، ورکس ، اوریئنٹ ، یونی ٹرین ، سرسنگ ، اسٹائل ، اتھارٹی ، پریچنگ ، یہ ان بے شمار الفاظ کے علاوہ ہیں جو انگریزی ہیں مگر نسبتاً آسانی سے سمجھے جا سکتے ہیں ، گو ان کا سمجھا جانا یہ ظاہر نہیں کرتا کہ وہ عبارت کی صورت بگاڑنے کا باعث ہیں یا ان سے بہتر اردو الفاظ مل نہیں سکتے تھے ، مثلاً صفحہ ۸۱ پر لکھا ہے : "کومپیٹیشن کے قاعدے نے ایجوکیٹیڈ کلاس کے سوا ہر درجے کے آدمیوں کو عمدہ خدمات سے گویا بالکل محروم کر دیا ہے ۔" بڑی آسانی سے اور بغیر کسی نقصان کے اس کے بجائے یہ کہا جا سکتا تھا : "مقابلے کے قاعدے نے تعلیم یافتہ جماعت کے سوا الخ" یا صفحہ ۹۳ کے ایک فقرے میں : "اس موقعہ پر ہم سرسید کی ایک مختصر سپیچ جو انھوں نے علی گڑھ میں ایک ڈنر پر مسٹر بلنٹ ممبر پارلیمنٹ کے جام صحت پروپوز کرتے وقت کی تھی ، نقل کرتے ہیں" ۔ تینوں الفاظ جن پر نشان کیا گیا ہے ، ایسے تھے جن کی بجائے اردو الفاظ استعمال ہو سکتے تھے اور لازم تھا کہ کیے جاتے ۔ کیونکہ ممبر اور پارلیمنٹ دو انگریزی الفاظ کے علاوہ اور ایک

انگریزی نام کے سوا ، جو اس چھوٹے سے فقرے میں موجود تھے ، اور انگریزی الفاظ لکھنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔

اب ہم انگریزی الفاظ کی کثرت کی بحث کو چھوڑ کر ایک اور اعتراض کی طرف آتے ہیں جو اس کتاب کو پڑھتے ہوئے ہمارے ذہن میں آیا ہے ۔ گو وہ کچھ بڑا اعتراض نہیں مگر ایسے نامور مصنف پر اس کا وارد ہو سکنا اسے ضروری بنا دیتا ہے ۔ ایک ہی لفظ یا فقرے کا اعادہ فصاحت کے خلاف ہے ۔ اگر کہیں ایک ہی قسم کے الفاظ یا فقرات کا متواتر استعمال ناگزیر بھی ہو تو اکثر اُستادان فن مترادف یا قریب قریب ہم معنی الفاظ سے کام لیتے ہیں اور تکرار سے حتی الوسع گریز کرتے ہیں ۔ مولانا حالی نے حسن کلام کی اس باریک مگر ضروری صنعت کا التزام نہیں کیا ۔ بعض عبارتیں ایک ہی کتاب یا ایک ہی مقام سے نقل کرتے ہوئے ''اس کے بعد'' اور ''پھر'' کا وہ تار باندھا ہے کہ پڑھنے والا حیران رہ جاتا ہے اور کہتا ہے یا الٰہی کہیں "اس کے بعد" کا خاتمہ بھی ہوگا ۔ مثال کے طور پر دیکھیے صفحہ ۱۴۷ جہاں یہ عبارت شروع ہوتی ہے : ''اس کے بعد سر سید نے معاشرت کے لحاظ سے اسی مسئلے پر بحث کی ہے ۔" ورق الٹ کر دیکھیں تو صفحہ ۱۴۸ کے وسط میں یہ عبارت ملتی ہے : ''اس کے بعد وہ ڈیون پورٹ کی کتاب سے مانٹیگو کی رائے تعدد ازدواج کی تائید میں نقل کرتے ہیں ۔'' صفحہ ۱۴۹ پر یہ سطر نظر آتی ہے : ''اس کے بعد سرسید اُن کی اخلاقی خرابیوں کا ذکر کرتے ہیں الخ ۔'' صفحہ ۱۵۰ اس خصوصیت میں بڑھ جاتا ہے اور تین ٹکڑے عبارت کے ''اس کے بعد'' سے شروع ہوتے ہیں ۔ صفحہ ۱۵۱ پر یہ دو مقبول لفظ دو جگہ ملتے ہیں ۔ صفحہ ۱۵۲ خالی نہیں اور صفحہ ۳ پر بھی

آن کا جلوہ ہے - صفحہ ۱۵۴ کچھ مستثنیٰ نہیں کہ محروم رہتا - آگے چل کر ''اس کے بعد'' کی آمد نسبتاً ذرا دیر سے ہوتی ہے مگر اوسط فی صفحہ شاید کچھ زیادہ کرنے نہیں پاتی اور یہ سلسلہ برابر ۱۶۴ تک چلا گیا ہے - ایک اور موقع پر صفحہ ۲۲۴ سے لے کر ۲۳۳ تک صرف ایک دو جگہ لفظ ''پھر'' کو چھوڑ کر یہی سلسلہ جاری ہے - ہرچند کہ انتخابات عبارات کے سلسلے میں ایسے الفاظ کا استعمال مجبوراً کرنا پڑتا ہے اور انگریزی میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں ، مگر وہاں کاملین فن یہ کوشش کرتے ہیں کہ مختلف الفاظ سے وہی مفہوم ادا کریں اور ایک لفظ یا جملے کی باری دیر میں آئے ، تاکہ پڑھنے والے کی طبیعت تھک نہ جاوے - اور جہاں تک ہو سکے انتخابات کم آویں یا ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر آویں تاکہ یہ معلوم نہ ہو کہ دوسروں کی عبارتیں جمع کر کے اوراق ُپر کر دیے گئے ہیں - خود لائق مصنف اس اصول کی خوبی سے باخبر ہے - چنانچہ صفحہ ۳۴-۵-۶ پر دو عبارتیں نقل کرتے ہوئے دو مختلف طریق اختیار کیے گئے ہیں - پہلے لکھا ہے : ''ایک مقام پر لکھتے ہیں'' پھر کہا ہے ''ایک جگہ لکھتے ہیں'' اور اس کا اثر اس حالت سے بہت بہتر ہے کہ دونوں جگہ ''مقام'' کا لفظ لکھا جاتا - ان چھوٹے چھوٹے نکات سے بے پرواہی بھی کلام کے رخ زیبا پر ایک دھبا سا لگتی ہے اور یہ بات انگریزی اصول تنقید کے موافق ''سٹائل'' کے نقائص میں داخل اور اس کی دلاویزی میں خلل انداز ہے - حقیقت میں مولانا حالی کے کلام میں یہ نقص انگریزی سادگی کی تقلید سے پیدا ہوا ہے - انگریزی میں سادگی کے ساتھ ساتھ طرز عبارت میں بعض ایسی خوبیاں پیدا کرنے کی گنجائش ہے جو اسے بہت دلچسپ اور پر زور بنا دیتی

ہیں ، مگر اردو میں اگر فارسی رنگینی اور انگریزی سادگی کے بین بین میں ایک خاص رنگ اختیار نہ کیا جائے تو محض انگریزی طرز تحریر نہایت روکھی سی رہتی ہے ۔ انگریزیت کے شوق نے مولانا کو کئی جگہ عجیب مشکلات میں ڈالا ہے ۔ چاہیے تھا کہ جب وہ انگریزی داں نہیں تو انگریزی الفاظ یا عبارات یا اشارات تاریخی سے حتی الوسع پہلوتہی کرتے ۔ مگر وہ ان میں پڑے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بعض مقامات پر معلومات پر حرف گیری ہو سکتی ہے ۔ چنانچہ فرماتے ہیں : (صفحہ ۱۸ ۔ سطر ۱) "یورپ اور امریکہ میں اب تک جس قدر ترقیات اور اصلاحات ظہور میں آئی ہیں ، اُن کے بانی مبانی تقریباً تمام وہی لوگ نکلیں گے جو مذہب کے سخت پابند تھے : لوتھر ۔ کالون ۔ بیکن ۔ ملٹن ۔ نیوٹن ۔ کلمبس ۔ بینجمن فرینکلن ۔ جارج سٹیفن ۔ واشنگٹن ۔ ہمپڈن ۔ میٹنی وغیرہ وغیرہ سب مذہب کے نہایت پابند تھے ۔" علاوہ اس کے کہ اس فہرست میں ایسے کئی نام جو شوق مذہب میں خصوصیت رکھتے تھے نہیں آئے اور بعض ایسے آئے ہیں جنھیں شاید بہت خصوصیت مذہب سے نہ تھی ، یہ بات قابل ذکر ہے کہ بیکن کا نام اس فہرست میں شامل کیا گیا ہے ، حالانکہ بیکن کی نسبت عام تاریخی رائے ذہنی اور اخلاق اعتبار سے اچھی نہیں ، گو اس کے علم و فضل کا ایک زمانہ قائل ہے ۔ شاید اس کی رشوت ستانی ، جس میں وہ خاص کر بدنام ہوا تھا ، "پابندیٔ مذہب" کا تقاضا کرتی ہوگی ۔[1]

ایک اور مثال لیجیے ۔ صفحہ ۳۱۰ پر لکھا ہے : "منجملہ اُن بے شمار مرثیوں اور نوحوں کے ، جو اس حادثۂ عظیم پر کہے گئے ہیں ، چند اشعار ایک یورپین فاضل لیڈی نے بھی انگریزی زبان میں

ترتیب دے ہیں ۔ چونکہ لٹریری دنیا میں یہ پہلی ہی مثال ہے کہ ہندوستان کے ایک مسلمان کی موت پر انگلستان کی ایک شریف لیڈی ایک نظم بطور مرثیے کے اپنی زبان میں لکھے اس لیے ہم اس لطیف سونٹ (مرثیہ) کا ترجمہ اس مقام پر لکھتے ہیں ۔" اول تو ہم مولانا سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ خدارا ہم کو بتلائیں کہ یہاں لفظ "سونٹ" کی کیا ضرورت تھی جب آگے لفظ "مرثیہ" موجود تھا جو اب خطوط وحدانی میں گھر ہوا ہے ۔ دوسرے یہ بادب عرض کیا چاہتے ہیں کہ جہاں تک انگریزی زبان کی نسبت ہمارا محدود علم ہے ، اس کے اعتبار سے "سونٹ" مرثیے کے معنی نہیں رکھتا اور عموماً عشقیہ اشعار پر ، جن میں چند عروضی خصوصات کا التزام کیا گیا ہو ، اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے ۔ ان مثالوں کے ذکر سے غرض یہ ہے کہ معلوم ہو جائے کہ باوجود جناب مولانا کی کوشش کے بعض باریک باریک غلطیاں رہ گئی ہیں جو اس حیثیت سے کہ یہ کتاب ایک فاضل ادیب کے قلم سے نکلی ہے اور ادب اردو میں مستقل جگہ پانے کی اُمیدوار ہے ، متقاضی ہیں کہ ان کی اصلاح کی جائے ۔ اعتراضات مذکورہ بالا کے علاوہ بعض اور متفرق اعتراضات بھی ہیں جو قابل غور ہیں ۔ مولانا حالی فرماتے ہیں : "ہم چاہتے تھے کہ کالج کی عمارات کا حال اور ان کی تفصیل مفصل طور پر بیان کی جائے کیونکہ ان تمام عمارتوں کا اس قدر جلد اور ایسی خوبی کے ساتھ تیار کرا دینا اور ایک ویران قطعہ زمین کو چند سال میں قومی چندے سے گلزار بنا دینا اور سینکڑوں پردیسی طلبہ کی تمام ضروریات اور آسائش اور تعلیم و تربیت اور ہر قسم کی ریاضت کا سامان مہیا کر دینا یہ بھی سرسید کی زندگی کے انہی بڑے بڑے کاموں میں سے ایک کام ہے جن کا

ذکر اُن کی لائف میں کرنا ضروری ہے ۔ لیکن ہم کو معلوم ہوا ہے کہ نواب محسن الملک کا ارادہ کالج کی مفصل تاریخ لکھنے کا ہے اور امید ہے کہ اس میں عمارات کا حال نہایت تفصیل کے ساتھ درج کیا جائے گا ، اس لیے ہم اس موقع پر تمام کالج اور بورڈنگ کی عمارتوں کا حال بیان کرنا ضروری نہیں سمجھتے ۔" یقین ہے کہ اکثر اصحاب سطور بالا کو تحیر سے پڑھیں گے ۔ اگر عمارات کا بیان فی الواقع ضروری تھا تو یہ علم کہ کوئی اور صاحب اس مضمون پر ایک کتاب لکھنے کو ہیں ، ایک سوانح نگار کو اُس کے اپنے فرائض سے سبک دوش نہیں کر سکتا ۔ اُس کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ جو چیز وہ تیار کرتا ہے وہ اپنے آپ میں مکمل ہو ، یہاں تک کہ اپنی ہی کسی دوسری تصنیف کا حوالا دینا بھی بہت موزوں نہیں ، چہ جائے کہ کسی دوسرے مصنف کی تصنیف کے بھروسے سے رہنا اور وہ بھی ایسی جو ابھی تکمیل کو نہیں پہنچی اور جس کے متعلق سو ایسے اسباب پیدا ہوسکتے ہیں کہ شائع ہی نہ ہو ۔ اگر اس کی نیت یہ ہے کہ اس کی تصنیف محض موجودہ نسل کے کسی فوری شوق کو پورا نہ کرے بلکہ آئندہ نسلوں کے لیے بھی مفید اور کارآمد ہوسکے اور مستقل قدر کے قابل ہو تو اُسے چاہیے کہ جو کچھ اس میں کہنا جانا چاہیے سب اُسی ایک کتاب میں بند کر دے ، خواہ اُسے جا بجا کتاب کے سارے ناظرین کو وہ دوسری کتاب جس کی وجہ سے ایک ضروری حصہ چھوڑا جاتا ہے ، میسر ہو جائے ۔ موجودہ صورت میں یہ اعتراض نہ صرف اصولی اعتراض ہے بلکہ عملی طور پر نظر آگیا ہے ، کیونکہ وہ کتاب آج تک نہیں تیار ہوئی ۔ اس اصول کو مدنظر رکھنے کی وجہ سے کہ ایسی کتابیں صرف

معاصرین کے لیے نہیں ہوتیں بلکہ مستقبل سے بھی آن کا تعلق ہوتا ہے - ایک اور غلطی ہے جو "حیات جاوید" میں کہیں کہیں نظر آتی ہے اور وہ یہ کہ وہ واقعات جو اس وقت ظہور پذیر ہو رہے تھے جب مصنف ترتیب کتاب میں مصروف تھا ، درج کر دیے گئے ہیں ، جن میں سے بعض کتاب کے چھپنے تک تغیر پا چکے ہیں - مثلاً سید محمود مرحوم اور مولوی سمیع اللہ خاں صاحب میں جو عارضی مصالحت سرسید کے انتقال کے بعد ہوئی تھی ، اُس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے : "خدا کا شکر ہے کہ گذشتہ جولائی میں نواب لفٹیننٹ گورنر اضلاع شمال مغرب نے مسلمانوں کی بدبختی پر رحم فرما کر آنریبل سید محمود اور مولوی سمیع اللہ خاں سی - ایم - جی - کے باہم صفائی کرا دی ہے ، اور خدا کی ذات سے امید ہے کہ اس صفائی کا انجام بہتر ہوگا -" مگر افسوس کہ یہ اُمید کتاب چھپنے سے پہلے منقطع ہو چکی تھی - پس ایسے واقعے کے اس طرح ذکر کرنے سے کیا فائدہ ہوا - علاوہ ہریں "گذشتہ جولائی" سے معلوم نہیں کیا مطلب ہے - آیا ۱۹۰۱ع یا ۱۹۰۰ع کا ماہ جولائی ، جیسا کہ کتاب کے سرورق سے مفہوم ہو سکتا ہے ، یا اس سے کسی پہلے سند کا ماہ جولائی ، جیسا کہ غالباً اصل واقعہ ہے -

تناسب واقعات باعتبار اہمیت بھی اس کتاب میں نبھ نہیں سکا - یعنی بعض ضروری اور اہم باتیں اجمال سے ذکر کر دی گئی ہیں اور بعض غیر ضروری باتیں ، جن کے ذکر سے ایسی سوانح عمری کے اوراق اگر بچے ہی رہتے تو بہتر ہوتا ، کسی قدر بسط سے بیان کی گئی ہیں - ان دوسری قسم کی باتوں کی مثال لاہور کے ایک اخبار نویس کی خط و کتابت کا اور اُس کے پہلے مداح سرسید اور

بعد میں مخالف ہونے کا تذکرہ ہے ۔ مولانا حالی نے اندازہ نہیں فرمایا کہ سرسید کی عظیم الشان زندگی کے واقعات میں ایسے معمولی درجے کے آدمیوں کی حرکات موافق و مخالف کس حساب میں ہوتی ہیں ۔ اور جیسا کہ بڑے آدمی اپنی زیست کے زمانے میں ان کو قابل توجہ نہیں سمجھتے اور اپنا کام کیے جاتے ہیں ؛ ایسے ہی ان کے سوانح نگار کو چاہیے کہ ایسے اشخاص کا ذکر کر کے خواہ مخواہ ان کی حیثیت سے زیادہ وقعت نہ دے ۔ جس شخص کی زندگی کا مقصد ایک گری ہوئی قوم کا سنبھالنا ، اس کی حالت کو سنوارنا اور اس و مذلت کے گڑھے سے عزت کی بلندی تک پہنچانا ہو اسے کہاں دماغ کہ پوچھتا پھرے کہ ع ''بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد ۔'' سرسید کو ان باتوں کی پروا ہی نہ تھی کہ کون اخبار ان کے موافق ہے اور کون مخالف ۔ کون صاحب ان کے مدحیہ قصیدے پڑھتے ہیں اور کون تکفیر کے فتووں پر دستخط کراتے پھرتے ہیں ۔ انھیں اپنے کام سے کام تھا ۔ اور یہی مولانا حالی کو چاہیے تھا ۔ انھوں نے ایک مختصر سے واقعے کا ، جس کا نتیجہ اس وقت بھی سوائے اس کے کچھ نہیں ہوا تھا کہ اس شخص کو، جس کی حرکات ناشائستہ ظاہر ہو گئی تھیں ، اس جماعت ، سے جس میں رہ کر وہ دوستی میں دشمنی کرنا چاہتا تھا ، نکال دیا گیا ، اس کتاب میں ذکر کرنے سے اسے ایک اہمیت عطا کی ہے جس کا وہ استحقاق نہیں رکھتا۔ ایسے ہی کچھ اور متفرق باتیں لکھی جا سکتی ہیں جن پر کم و بیش اعتراض ہو سکتا ہے ۔ لیکن ایک ایسی ضخیم کتاب میں ایسے نقائص کا راہ پا جانا کچھ تعجب کا محل نہیں ۔ بلکہ تعجب تو یہ ہے کہ اردو زبان میں انگریزی طرز کی سب سے بڑے حجم کی سب سے

مفصل ، نتیجہ خیز اور مفید سوانح عمری لکھنے کا فخر ایک ایسے مصنف کو حاصل ہوا ہے جسے علوم انگریزی سے واقفیت صرف بالواسطہ ہے۔ اور ہم یقین کرتے ہیں کہ اگر مولانا حالی نے اُن معروضات میں سے بعض پر، جو اس مضمون میں کی گئی ہیں ، توجہ فرمائی اور دوسری اشاعت کو نظر ثانی سے جلا دے دی تو اُن کی کتبِ نثر میں سب سے بلند پایہ تصنیف یہی سمجھی جائے گی ، اور حقیقت میں اس عزت کی یہ مستحق ہوگی ۔

* * *

حالی اور غزل[1]

مجھے اپنے ایک دوست کا قول یاد ہے کہ جب میں نے کہا "آپ نے مولانا حالی کا دیوان دیکھا ہے ؟" تو انھوں نے جواب دیا "نہ دیکھا ہے ، نہ دیکھنے کا ارادہ ہے" - میں نے تعجب سے پوچھا "یہ کیوں ؟" تو بولے "میں مولانا حالی کے مسدس کا قائل ہوں - وہ قومی رنگ میں خوب لکھتے ہیں مگر ان کو غزل گوئی سے کیا واسطہ -" یہ اس زمانے کی بات ہے جب "دیوان حالی" پہلے پہل شائع ہوا - میں نے اسے نہایت شوق سے پڑھا تھا - حالی کی غزلوں کی تاثیر میں ڈوبی ہوئی سادگی نے میرے دل پر ایک خاص اثر کیا تھا - میں نے اپنے دوست کی رائے کو تعجب سے سنا مگر بحث میں الجھنے کی بجائے میں نے اُن سے کہا کہ مجھے کچھ شعر پسند آئے ہیں ، وہ سناتا ہوں اور جو شعر یاد رہ گئے تھے ، انھیں سنائے - میرے وہ دوست منصف مزاج تھے - ان اشعار سے متاثر ہوئے اور کہنے لگے "یہ شعر تو واقعی خوب ہیں - آپ کے انتخاب کی داد دیتا ہوں" - میں نے کہا "ایسے ہی اور بہت سے ملیں گے - آپ دیوان حالی دیکھیں تو سہی" - انھوں نے دیوان منگوایا اور اس کے مطالعے کے بعد حالی کی غزل گوئی کے مداح ہوگئے -

حالی کی غزلیں کچھ پرانی ہیں کچھ نئی ، یعنی کچھ اس زمانے کی ہیں جب وہ عاشقانہ غزل لکھنے سے پرہیز نہ کرتے تھے ،

---

۱ - منقول از ماہنامہ 'زمانہ' (حالی نمبر) جلد ۶۵ ، نمبر ۶ ، دسمبر ۱۹۳۵ء صفحہ ۳۰۱ تا ۳۰۴ -

گو اس میں بھی متانت کو ہاتھ سے نہ دیتے تھے ۔ اور کچھ اُس وقت لکھی گئیں جب وہ چاہتے تھے کہ غزل کو پند و نصیحت کا ذریعہ بنالیں اور اپنے ملک اور قوم کے خیالات کو بلند کریں ۔ شعر کی نفاست اور خوبی کے دلدادہ خواہ پند آمیز شاعری کو شاعری تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوں مگر اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سعدی یا حالی جیسے استادانِ فن جب شعر کی خداداد دلفریبی کو حکمت آموزی کا آلہ کار بنائیں تو وہ نصیحت کے رنگ میں شاعری کا حق خوب ادا کرتے ہیں ۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جو بلند پایہ سخن‌ور شاعری کی معمولی روش کو چھوڑ کر شعر میں حکمت اور فلسفے کو ملا دیتے ہیں وہ اس مجبوری سے یہ طریق اختیار کرتے ہیں کہ پرانے رنگ میں وہ اپنے جوہر آسانی سے نہیں دکھا سکتے ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ قصداً ایسا رستہ اختیار کرتے ہیں جس میں وہ گمراہوں کی رہبری کرسکیں ، گرے ہوؤں کو اٹھالیں اور گرتے ہوؤں کو سنبھالیں اور اپنے ہم عصروں اور اپنے بعد آنے والی نسلوں کے لیے ایسی مشعل ہدایت جلائیں جس سے زندگی کی تاریک راہیں روشن اور کڑی منزلیں آسان ہوجائیں ۔ حالی نے اپنی غزلوں سے یہی کام لیا ہے اور مولانا حالی کی غزلوں کو اگر دو حصوں میں تقسیم کریں تو پہلا حصہ اُس زمانے سے تعلق رکھتا ہے جب ان پر دہلی کا اثر غالب تھا ۔ بلکہ بعض تو اُن دنوں لکھی گئی تھیں جب مولانا حالی دہلی میں مقیم تھے اور اپنے شفیق استاد مرزا غالب اور ان کے مقتدر معاصرین کے فیضِ صحبت سے مستفید تھے ۔ ان غزلوں میں تغزل کی طرز قدیم کے اچھے اچھے نمونے موجود ہیں ۔ دوسرے حصے کو اُس دور

سے تعلق ہے جس کا آغاز مولانا حالی کے لاہور میں آنے اور ان ادبی مجالس میں شریک ہونے سے ہوتا ہے جس میں مولوی محمد حسین آزاد اپنی طبع رواں کے جوہر دکھا رہے تھے اور جہاں اردو میں انگریزی طرز تحریر کا رنگ سرایت کر رہا تھا ۔ اس آغاز کی تکمیل کے لیے ایک اور زبردست اثر علی گڑھ کی تعلیمی تحریک سے پیدا ہوا ۔ مولانا حالی کے جو گہرے تعلقات سرسید احمد خاں بانی مدرسۃ العلوم علی گڑھ سے تھے اور جو دلچسپیاں سرسید کے لگائے ہوئے اس پودے سے ان کو ہمیشہ رہیں ، ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی شاعری کا رنگ یکسر بدل گیا اور انھوں نے اس پائے کی قومی نظمیں لکھیں جن کی بدولت مسلمانان ہند میں بیداری پیدا ہوگئی اور وہ ازسرنو ترقی اور عروج کے خواستگار بن گئے ۔ قوم کو جگانے اور قوم کے نوجوانوں میں ذوق عمل کی ایک نئی روح پھونکنے کا خیال مولانا کی غزلوں میں بھی برابر جلوہ گر ہے ۔ مثال کے طور پر ان کی دو مشہور غزلوں کے چند شعر پیش کرتا ہوں ۔ کامل انسان کا جو تخیل ان شعروں میں پیش کیا گیا ہے اس کی مثال آسانی سے نہیں مل سکتی ۔ مولانا فرماتے ہیں :

عالم آزادگاں ہے اک جہاں سب سے الگ
ہے زمیں ان کی اور ان کا آسماں سب سے الگ

پاک ہیں آلائشوں میں ، بندشوں میں بےلگاؤ
رہتے ہیں دنیا میں وہ سب کے درمیاں سب سے الگ

سب کی سن لیتے ہیں لیکن اپنی کچھ کہتے نہیں
ہے کوئی بھیدی اور ان کا رازداں سب سے الگ

ایک دوسری غزل اسی قسم کی ہے جس میں ایسی ہی اعلیٰ زندگی کا تخیل اس طرح سے پیش کیا گیا ہے :

کاٹیے دن زنــدگی کے اُن یگانوں کی طرح
جو سدا رہتے ہیں چوکس پاسبانوں کی طرح
رسم و عادت پر ہیں کرتے عقل کو فرماں روا
نفس پر رکھتے ہیں کوڑا حکم رانوں کی طرح
شادمانی میں گــزرنے اپنے آپے سے نہیں
غم میں رہتے ہیں شگفتہ شادمانوں کی طرح
کرتے ہیں تمکیں جوانی میں بڑھاپے سے سوا
رہتے ہیں چونچال پیری میں جوانوں کی طرح

ان دو غزلوں میں ایک اور خوبی یہ ہے کہ ہر ایک کا مقطع مولانا کی طرز شاعری پر ایک خاص روشنی ڈالتا ہے - پہلی غزل مقطع سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے اپنے لیے ایک نئی راہ ڈھونڈھ کر نکالی ہے اور جان بوجھ کر پرانی ڈگر کو چھوڑا ہے - کس قدر سچی بات مقطع میں کہہ دی ہے :

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خــبر
شہر میں کھولی ہے حالی نے دوکاں سب سے الگ

میرے خیال میں گاہکوں کے بے خبر ہونے کی جو شکایت اس شعر میں کی گئی ہے وہ اب تک درست ہے - گو مولانا حالی کے مداح ملک بھر میں بے شمار ہیں اور اُن کے کلام کا اکثر حصہ بہت مقبول ہوچکا ہے ، لیکن اب بھی بہت لوگ ہیں جنھیں اس بات کا

صحیح اندازہ نہیں ہے کہ اس با کمال محب قوم و وطن نے غزل میں ایک نیا رنگ پیدا کرکے ادب اردو کی کس قدر خدمت کی ہے ۔

دوسری غزل کا مقطع "سب سے الگ" والے مضمون سے بھی زیادہ پُر لطف ہے ۔ اس میں شعر کی اس خوبی پر زور دیا گیا ہے جسے سادگی کہتے ہیں ۔ مقطع ملاحظہ ہو :

کیجیے کیا ، حالی نہ کیجیے سادگی گر اختیار
بولنا آئے ہمیں جب رنگیں بیانوں کی طرح

اس مقطع میں مزے کی بات یہ ہے کہ اس میں ایک لطیف تعلی ہے مگر انکسار کے ساتھ ۔ بظاہر تو شاعر یہ کہہ رہا ہے کہ وہ مجبوراً سادہ اشعار لکھتا ہے کیونکہ اسے رنگین بیانی نہیں آتی ، لیکن دکھانا یہ مقصود ہے کہ سادگی اختیار کرنے کے قابل چیز ہے اور کلام حالی کی خاص صفت ہے ، چنانچہ اس مشہور قطعے میں جو حالی نے شاعر کو مخاطب کرکے لکھا ہے ، اس خیال کی یوں توضیح کی گئی ہے :

صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام
ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو

مولانا حالی نے یہ اصول نہ صرف بطور نصیحت پیش کیا بلکہ عمر بھر خود اس اصول پر کاربند رہے ۔ لیکن اس کے ساتھ یہ ان کے کمال فن کا ثبوت ہے کہ ان کے سادہ سے سادہ شعر بھی اثر سے بھرے ہوئے ہیں ۔ ذیل میں دو شعر ملاحظہ ہوں :

ہوا کچھ اور ہی عالم میں چلتی جاتی ہے
ہنر کی ، عیب کی صورت بدلتی جاتی ہے
عجب نہیں کہ رہے نیک و بد میں کچھ نہ تمیز
کہ جو بدی ہے وہ سانچے میں ڈھلتی جاتی ہے

ان اشعار کی سلاست کو دیکھیے ، بلاغت کو دیکھیے کہ چار مصرعوں میں کیا کچھ کہہ دیا ہے اور زمانے کے بدلتے ہوئے حالات پر کیسا تبصرہ کیا ہے ۔ اس مختصر سے مضمون میں یہ گنجائش نہیں کہ میں مولانا کے دیوان کے بہت سے قابل انتخاب شعر پیش کروں ۔ شائقین خود اس بحر میں غواصی کریں اور بے بہا موتی نکالیں۔ مگر ایک اور غزل کے دو شعر لکھے بغیر نہیں رہ سکتا جو مجھے بہت پسند ہیں اور جو میں اکثر پڑھا کرتا ہوں ۔ پہلے تو مطلع دیکھیے :

پردہ ہو لاکھ کینۂ شمر و یزید کا
چھپتا نہیں جمال تمہارے شہید کا

میرے خیال میں واقعۂ شہادت حضرت امام حسین (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے بیان کرنے کا اس سے بہتر پیرایہ ذہن میں آنا مشکل ہے ۔ اس شعر میں ایک طرف تو رتبۂ شہادت کو غیر معمولی طور پر بلند دکھایا ہے اور دوسری طرف شیعہ و سنی کے جھگڑے کو کس خوبی سے ختم کیا ہے ۔ یعنی شمر و یزید کی کیا مجال تھی کہ وہ حضرت امام حسین کو مار ڈالتے ۔ شہادت کی دولت جو حضرت کے حصے میں خدا کی طرف سے آئی تھی ، وہ ان کو ملنی تھی ۔ شمر و یزید کا کینہ ایک بہانہ بنا جس کے پردے میں مشیت ایزدی پوری ہوئی ۔

اسی غزل میں ایک اور شعر جانِ غزل ہے اور وہ یہ ہے :

قفلِ درِ مراد سب اک بار کھل گئے
چھوڑا جب آرزو نے بھروسہ کلید کا

اس زمین میں حالی کے دو مشہور معاصرین یعنی داغ دہلوی اور امیر مینائی لکھنوی نے بھی معرکے کی غزلیں کہی ہیں اور داد سخن دی ہے مگر کلید کا قافیہ جس خوبی اور لطافت سے حالی نے باندھا ہے وہ اسی کا حصہ ہے۔

* * *

شعرالعجم[1]

شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی کی تازہ ترین تصنیف ''شعرالعجم'' کئی وجوہ سے قابلِ قدر کتاب ہے ۔ اس قسم کی کتابیں اردو لٹریچر کے لیے سرمایۂ ناز ہیں ۔ اردو لٹریچر پر یہ اعتراض ایک عرصے سے وارد ہے کہ اس میں سوائے نظم کے دواوین اور نثر کے ناولوں اور افسانوں کے علمی ذخیرہ بہت کمیاب ہے ۔ زمانۂ حال کی بعض تصانیف سے رفتہ رفتہ یہ اعتراض رفع ہوتا جاتا ہے ۔ مصنفینِ حال میں سے مولانا شبلی نے اردو کے دامن سے اس دھبے کو جھٹانے میں نہایت معقول حصہ لیا ہے اور جو کتابیں تاریخ و سیر و فلسفۂ مذہب کے متعلق آن کے قلم سے لکلی ہیں وہ نہایت کارآمد ہیں اور نہایت درجہ کاوش اور جستجو کا نتیجہ ہیں ۔ یہ کتاب ''شعرالعجم'' جس کے ہم دیر سے منتظر تھے اردو لٹریچر میں ایک مفید اضافہ ہونے کے علاوہ فارسی لٹریچر کے دلدادگان کے لیے ایک بے بہا نعمت ہے ۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اردو میں اس مضمون پر کوئی کتاب پہلے موجود نہیں مگر یہ تعجب خیز ہے کہ خود فارسی زبان میں بھی کوئی مبسوط کتاب فارسی شعرا کے احوال کے متعلق یا ایرانی شاعری کی تاریخ پر نہیں لکھی گئی ۔ یورپ میں فرانسیسی اور انگریزی زبانوں میں تو ایرانی شاعری کی

---

۱ ۔ یہ کتاب مطبع فیض عام علی گڑھ سے شائع ہوئی ۔ اُس زمانے میں مولانا شبلی نعمانی دارالعلوم ندوہ لکھنؤ میں معتمد تھے ۔ ''شعرالعجم'' کے بارے میں یہ مضمون ''مخزن'' بابت جولائی ۱۹۱۰ع (جلد ۱۹ نمبر ۴) میں چھپا ۔ (مرتب)

تاریخیں لکھی جائیں مگر ایشیا کی کسی زبان میں اور خود ایران میں کوئی کتاب فارسی شاعری کے متعلق نہ ہو ، یہ ایک ادنیٰ نمونہ اس ہستی کا ہے جس میں اہلِ ایشیا ان دنوں اپنے آپ کو پاتے ہیں ۔ ہندوستان پھر غنیمت ہے کہ فارسی زبان کی اس کساد بازاری کے دور میں اس ملک میں ابھی ایسے علماء موجود ہیں جن کو ایرانی اساتذہ کے کلام پر عبور حاصل ہے اور جو فارسی شاعری کے نکات سے اہل زبان کی طرح آگاہ ہیں اور اس کی خدمت کے شوق میں آن سے بڑھ کر ہیں ۔ مولانا شبلی کی فارسی دانی مسلّم ، کلام اساتذہ پر ان کی نظر وسیع اور ذوق شاعری خداداد ہے جس کا ظہور کبھی کبھی فارسی غزل گوئی اور قصائد کی صورت میں ہوتا ہے ۔ اس پر شوق کا یہ عالم کہ فرانسیسی میں کتاب چھپے تو اس سے باخبر اور انگریزی میں چھپے تو اس سے بذریعہ ترجمہ آگاہ ہو جائیں ۔ ایسی صفات اور اتنی صفات کا مجموعی اثر شعر العجم میں جلوہ گر ہے ۔ جس قدر محنت سے یہ کتاب لکھی گئی ہے ہم امید کرتے ہیں کہ ملک کے علم دوست حضرات اسی قدر عالی حوصلگی سے اس کی داد دیں گے اور یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ بک جائے گی ۔ اس کے تین حصے شائع ہوچکے ہیں ۔ حصہ اول کی ضخامت ۲۵۶ صفحے ہے اور اس میں عباس مروزی سے نظامی تک کے حالات ہیں ۔ حصہ دوم کی ضخامت ۳۰۲ صفحے ہے اور حصہ سوم کی ۲۲۰ صفحے اور اس میں ابو طالب کلیم تک کے حالات ہیں ۔ تینوں حصوں میں فارسی شاعری کی عہد بہ عہد ترقیوں اور اس کی خصوصیات سے بحث کی گئی ہے اور مشہور شعرا کے حالات درج کرنے کے علاوہ ان کی شاعری پر نقادانہ نگہ ڈالی گئی ہے ۔

* * *

کلیاتِ اکبر[1]

نظم اُردو کے شائقین بالعموم اور کلامِ اکبر کے شیدائی بالخصوص یہ معلوم کر کے بہت خوش ہوں گے کہ جناب خان بہادر سید اکبر حسین صاحب کے فرزند ارجمند سید عشرت حسین صاحب بی۔ اے نے جو تھوڑا عرصہ ہوا کیمبرج سے فارغ التحصیل ہو کر واپس تشریف لائے ہیں، اپنے والدِ ماجد کے کلام کا مجموعہ ترتیب دے کر شائع کرا دیا ہے۔ اُنھوں نے اس اشاعت سے نہ صرف اپنا ایک اہم فرض ادا کیا ہے بلکہ اردو عالمِ ادب کی ایک معقول خدمت کی ہے اور وہ ہمارے دلی تشکر کے مستحق ہیں۔ یہ کتاب کئی حصوں پر منقسم ہے۔ پہلے حصے میں حال کی غزلیں درج ہیں جنھیں دور سوم کی غزلیں کہا گیا ہے۔ دوسرے میں بیس پچیس سال قبل کا کلام ہے اور اس حصے کا نام دور دوم رکھا گیا ہے۔ تیسرے حصے میں اس سے بھی پیشتر کا کلام ہے جسے جناب اکبر کی طبعِ رسا کی مشق اول کہنا چاہیے اور اسی لیے اس کا نام دورِ اول رکھا گیا ہے۔ ان کے علاوہ رباعیات و قطعات و متفرقات ہیں جن میں سے اکثر ظرافت کا پہلو لیے ہوئے ہیں۔ یوں تو ہر حصہ دلچسپ ہے مگر اس میں شک نہیں کہ فاضل مصنف کی طبیعت کا اصلی رنگ

۱۔ منقول از 'مخزن' اپریل ۱۹۰۹ع (جلد ۱۷ نمبر ۱) ص ۳۷ - ۴۷۔
سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی (۱۶ نومبر ۱۸۴۶ع —— ۹ ستمبر ۱۹۲۱ع) 'لسان العصر' مشہور شاعر، انشاء پرداز، ظرافت نگار و بذلہ سنج۔ آپ کی یادگار آپ کے چار "کلیات" ہیں۔

دور سوم ہی میں نظر آتا ہے ۔ گویا شاعر کا بڑھاپا آس کے کلام کا شباب ہے ۔ وہ سارے جوہر جو ازل سے آس کی طبیعت میں ودیعت کیے گئے تھے اور جو دور اول میں بھی تغزل کے زمانے میں اپنی جھلک دکھا جاتے تھے اور دور دوم میں رفتہ رفتہ ترقی پا رہے تھے، آخرکار جناب اکبر کی شاعری کا جزو اعظم بن گئے ۔ آس زمانے کا کوئی سیاسی ، مذہبی ، تمدنی اور اخلاقی مسئلہ ایسا مشکل سے ہوگا جس پر اکبر نے رائے زنی نہیں کی اور وہ بھی ایسے لطیف پیرائے میں کہ جس فریق کی رائے سے موافقت کی وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ آس کی خوشامد کی جا رہی ہے اور جس سے مخالفت ہو آسے شکایت کا موقع نہ ملے ۔ ہنستے بولتے، لطیفہ کہتے زلف و سنبل سے قطعی گریز کیے بغیر اور بندش کی خوبیوں اور چستی کا لحاظ رکھ کر اس عہد کا یہ بے نظیر سخن ور اپنا مطلب کہہ جاتا ہے اور ملک و ملت کی حمایت کا فرض ادا کر جاتا ہے ۔ ان نئی خصوصیتوں کی بنا پر میں نے رباعیات اکبر کا دیباچہ لکھتے وقت اپنے ایک دوست کا یہ قول نقل کر دیا تھا کہ اکبر کو لسان العصر کہیں تو بجا ہے ۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت مسرت ہوئی کہ یہ لقب عام طور پر موزوں قرار دیا گیا اور مقبول ہوا اور اب ''کلیات اکبر'' کے سرورق پر موجود ہے ۔ چند اشعار نقل کرتا ہوں جن سے اس لقب کی یہ موزونی اور مناسبت واضح ہو جائے گی :

بتوں کے پہلے بندی تھے مسوں کے اب ہوئے خادم
ہمیں ہر عہد میں مشکل رہا ہے یا خدا ہونا

طریق مغربی کی کیا یہی روشن ضمیری ہے
خدا کو بھول جانا اور محو ماسوا ہونا

نہ کتابوں سے نہ کالج کے ہے در سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا
جو خردمند ہیں وہ خوب سمجھتے ہیں یہ بات
خیر خواہی وہ نہیں ہے جو ہو ڈر سے پیدا

جیسی جسے ضرورت ویسی ہی اُس کی چیزیں
یہاں قمت ہے تو پھر کیا وہاں میز ہے تو پھر کیا
کیسی ہی سلطنت ہو سب خوش نہ رہ سکیں گے
گر ٹُرک ہے تو پھر کیا، انگریز ہے تو پھر کیا

اب ہر شعر لفظ غور سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ ہر ایک بجائے خود ایک مضمون کا مسالحہ ہے۔ پہلے شعر میں آج کل کی ایک خاص دقت کا، جیسے بسا اوقات اکثر لوگ محسوس کرتے ہیں، بیان ہے یعنی اس ملک میں مسلمانوں کو ایک طرف ہندو تمدن اور دوسری طرف انگریزی تہذیب سے سروکار ہے۔ کبھی ایک کے زیر اثر کبھی دوسرے کے تابع فرمان ہیں اور انھیں اپنے اصلی رنگ پر قائم رہنے اور اپنے فرائض کا حقہ ادا کرنے میں طرح طرح کی دشواریاں ہیں۔ اس مطلب کو بُت اور مس کے استعارے میں ادا کرنا انتہائے بلاغت ہے اور یہ استعارات جناب اکبر ہی نے اپنے لیے ایجاد کیے ہیں۔ جیسے حافظ ساقی و مے سے طرح طرح کے معانی پیدا کرتا ہے، جنھیں اربابِ نظر سیاق کلام سے سمجھ جاتے ہیں، اسی طرح کلامِ اکبر میں بُت اور مس کئی معنی رکھتے ہیں۔ کہیں بت سے مراد ہندو اور مس سے مراد انگریز ہے۔ مثلاً ان دو شعروں میں جو اردو ناگری کے ناگوار جھگڑے کے دنوں میں کہے گئے تھے:

بُتوں نے کہہ دیا چل ہٹ تجھے ہندی نہیں آتی
مِسوں نے کہہ دیا جا تجھ کو انگریزی نہیں آتی
مگر اکبر کہ اب تک مر رہا ہے ان حسینوں پر
قیامت ہے کہ بے عزت کو شرم اب بھی نہیں آتی

کہیں بت سے مراد ہندی عورتیں اور مس سے مراد انگریزی عورتیں لی جاتی ہے ، اور شاعر جدید تحریکوں میں سب سے زبردست تحریک یعنی سودیشی کی طرف اشارہ کر کے ہندی نوجوانوں کو اپنے ملک کی عورتوں کی قدردانی کی ترغیب دیتا ہے ۔ جیسا اس شعر میں :

بتوں کو چھوڑ کر کیوں جاؤں میں آس مس کی پیشی میں
متاعِ حسن بھی داخل ہے تحریکِ سودیشی میں

اور کہیں لفظ بت ہندو تمدن کا اور لفظ مس انگریزی تمدن کا قائم مقام ہوتا ہے جس کی مثال خود یہی شعر ہے جو سب سے پہلے نقل کیا گیا ہے ۔ اس کے ساتھ کے دوسرے شعر میں مغربی طریق تعلیم پر مذہب سے بیگانہ ہونے کا اعتراض نہایت زور سے ظاہر کیا گیا ہے اور ایک معنی میں اسی اصول پر زور دینا کہ نئی تعلیم بغیر مذہبی تعلیم کے مفید نہیں ، جناب اکبر کے کلام کا خاص مقصد اور موضوع ہے ۔ مدتیں ہوئیں جب سرسید احمد خاں مرحوم نے علی گڑھ میں علوم جدیدہ اور زبان انگریزی کی ترویج کا جھنڈا گاڑا اور اُن کے مداح اور دوست اُن کے ہم خیال ہوکر اُن کی تائید میں کھڑے ہوئے تو خان بہادر اکبر حسین صاحب نے اس تحریک کی بعض کمزوریوں کی طرف اپنے شاعرانہ اور ظریفانہ پیرائے میں قوم کو متوجہ کرنا شروع کیا ، اور سید صاحب کو اس طرح اپنا مخاطب بنایا جیسے پرانے شاعر

واعظ اور زاہد سے خطاب کر کے اپنے اشعار کو دلچسپ بناتے تھے ۔ گویا سید صاحب کی ذات سے خطاب کرنے کے علاوہ اس نئی تعلیم اور انگریزیت کا قائم مقام انھیں ٹھہرایا ۔ ابتدا میں کہیں کہیں ایسی تیزی سے نکتہ چینی کی کہ بعض لوگوں نے اکبر کو سید مرحوم کا مخالف اور اُن کے کام کا دشمن جانا لیکن آخر ان دونوں بزرگوں کے تعلقات باہمی اور خود جناب اکبر کے طرزِ عمل نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ انگریزی تعلیم کے مخالف نہیں ، مگر یہ ضرور چاہتے ہیں کہ انگریزی تعلیم پا کر نوجوان اپنے مذہب سے بالکل غافل اور بے خبر نہ ہو جائیں ۔ اور اس پر اصرار کرتے ہیں کہ اول اور مقدم ضرورت مسلمانوں کا باخدا رہنا ہے اور باقی سب خوبیاں اسی صورت میں خوبیاں ہیں کہ جب یہ صفت ان میں موجود ہو ۔ اُس زمانے میں تعلیمِ جدید کے نئے جوش کے سبب سے کسی نے اس آواز پر کان نہ دھرا مگر آج افسرانِ محکمۂ تعلیم ، حکام انگریز اور دیگر اہل الرائے کیا ہندو کیا مسلمان مذہبی تعلیم کی ضرورت کے مقر ہیں اور اُن خراب نتائج کا احساس کر رہے ہیں جو تعلیم یافتہ جماعت میں مذہب سے الگ رہ کر پیدا ہوئے ۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کی نصیحت گو تلخ معلوم ہوتی تھی لیکن کس قدر حق بجانب تھی اور کتنی دور اندیشی پر مبنی تھی ۔ شاید کوئی یہ کہے کہ سید صاحب نے خود اس ضرورت کو محسوس کر کے کالج میں مذہبی تعلیم کو رواج دے دیا تھا ، پھر اکبر کی تاکید مزید کی کیا ضرورت تھی ؟ اس کا جواب ان شعروں میں سے جو آغاز مضمون میں نقل کیے گئے ہیں ، تیسرے شعر میں موجود ہے ۔ یعنی مذہب صرف کتابوں اور کالج سے پیدا نہیں ہو سکتا ، بلکہ نور ایمان انسان کے قلب کو بزرگانِ باعمل کی نظر

سے میسر ہوتا ہے - آن کی پاکیزہ زندگی اور آن کی مثال آدمی کو انسان بنا دیتی ہے - اور اکبر کو یہ شکایت تھی کہ جدید تعلیم لوگوں کو اس رستے سے ہٹائے لیے جاتی ہے اور عالمان باعمل دن بدن کم ہوتے جاتے ہیں - اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ شکایت بے جا تھی - اکبر نے جیسے مشرق و مغرب کے باہمی تعلقات اور مغربی تعلیم کی کمزوریوں میں نہایت معقول رائے دی ہے ، اسی طرح بہت سے اہم پولیٹیکل مسائل پر اس کے خیالات نہایت غور کے قابل ہیں - آن کا یہ کہنا کہ جو خیرخواہی ڈر سے پیدا ہو وہ خیر خواہی نہیں ہے ، اس ملک میں حکام وقت کے لیے ایک اصول نصیحت ہے - مگر افسوس ہے کہ بہت کم حاکم ایسے ہوں گے جو بے غرضانہ خیرخواہی اور غرض مندانہ وفاداری میں فرق کر سکیں - اسی طرح یہ اصول کہ کوئی سلطنت سب کو خوش نہیں رکھ سکتی ، ایک بالکل سچا اصول ہے جو ہر وقت پیش نظر رہنا چاہیے - اور اس اصول کو بیان کرتے ہوئے اکبر کا یہ کہہ جانا کہ ”گر ترک ہے تو پھر کیا انگریز ہے تو پھر کیا“ ایک نہایت پُرلطف نکتہ ہے جس کی خوبی محتاج بیان نہیں -

مذہبی اور پولیٹیکل امور کے بعد سوشل امور کا درجہ ہے - جب ہم دیکھتے ہیں کہ مغربی اشیا کا استعمال کس سرعت کے ساتھ ہمارے گوروں میں بڑھ رہا ہے ، اور کس طرح لوگ دیوانہ وار یہ سمجھتے ہیں کہ لباسوں میں لباس ہے تو انگریزی ، گھر میں فرنیچر اگر انگریزی ہے تو ٹھیک ورنہ خانہ بے در ، اور جو آرام اور آسائش ہے تو انگریزی طرز بود و باش میں ہے ورنہ ہمارا طریق ماند و بود بے لطف و بے آرام ہے ، تو یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اپنائے ملک کو جتا

دیا جائے کہ وہ اس قسم کی یک طرفہ رائے قائم کر کے بہت غلط رستے پر جا رہے ہیں۔ اور یہ نہیں سوچتے کہ ہماری ضروریات ہمارے ملک کی حالت اور اس کی آب و ہوا کے لحاظ سے بہ حیثیت مجموعی ہماری اپنی زیادہ موزوں اور آرام دہ ہیں اور اندھا دھند ہمارا شوق سامانِ مغربی ہمیں بے شمار مشکلات میں ڈال رہا ہے اور ڈالنے والاؔ ہے۔ چنانچہ "یہاں تخت ہے تو بھر گیا وہاں میز ہے تو بھر گیا" میں کس سلیس اور عام فہم طریق سے اور کس قدر اختصار کے ساتھ یہ بسیط اور ضروری مضمون ادا ہوگیا ہے۔

یہ چند اشعار جو میں نے نمونۃً پیش کیے اُن سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اکبر کے ہر قسم کے خیالات اُن سے معلوم ہوگئے۔ اس میں شک نہیں کہ کچھ موٹی موٹی باتیں جو اُن کے کلام میں اکثر آتی ہیں اُن شعروں کو پڑھ کر سمجھ میں آ سکتی ہیں، لیکن کلیات اکبر مضامین رنگارنگ کا ایک دریا ہے، جس کی غواصی کیے بدون معلوم نہیں ہو سکتا کہ اس خوش فکر شخص نے اپنے کلام میں کیا موتی پروئے ہیں۔ بہ حیثیت مسلمان ہونے کے اکبر نے اپنی نصائحُ کا مخاطب بیشتر اپنے ہم قوموں کو بنایا ہے۔ چنانچہ بہت سی دل آویز نصیحتیں ایسی ملیں گی جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شاعر ایک غیور مسلمان ہے، تاہم تنگ خیالی سے بری ہے اور اُس کے دل میں اپنے مذہب کی محبت کے بعد اپنے ملک کی محبت بھی گہری ہے۔ اسی سبب سے وہ جابجا نہایت وسیع خیالی سے اپنے ہندو بھائیوں کو بھی کارآمد مشورے دیتا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے:

شعر میں اکبر یہ ہی مضمون تو ہر بار باندھ
اے مسلماں سبحہ لے، اے برہمن زنار باندھ

یعنی جیسے مسلمانوں کو یہ مشورہ دیتا ہے کہ تسبیح ہاتھ سے نہ چھوڑیں ، اسی طرح ہندوؤں کو یہ رائے دیتا ہے کہ وہ زنار کو باندھے رہیں اور اپنے مذہب سے نہ ہٹیں۔ اور ان دونوں مشوروں کو ایسا ضروری سمجھتا ہے کہ انھیں بار بار لکھنا عیب میں داخل نہیں سمجھتا بلکہ اپنا فرض قرار دیتا ہے ۔ ہندوستان کی آج کل کی زندگی میں شاید انگریزوں اور ہندوستانیوں کے میل جول کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہے اور اس پر اخبارات میں سینکڑوں کالم اور رسالوں میں سینکڑوں اوراق سیاہ ہو چکے ہیں ۔ اکبر اس کے متعلق ایسا خیال ظاہر کرتا ہے جو ہندو مسلمان ہر طبقۂ رعایا کے دل میں موجود ہے اور جسے انگریزوں میں بہت تھوڑے لوگ سمجھتے ہیں ۔ کہتے ہیں :

یہ فقط نہیں ہے کافی کہ مرا مزاج پوچھیں
مرے دردِ دل کو سمجھیں مری احتیاج پوچھیں

اہل مغرب نے مشرقی ممالک پر تسلط حاصل کرنے کے لیے جو باریک طریقے ایجاد کیے ہیں اُس کی توضیح کے لیے یہ شعر قابلِ ملاحظہ ہے :

مشرق کو سر دشمن کو کچل دیتے ہیں
مغربی اُس کی طبیعت کو بدل دیتے ہیں

اس مضمون کو جو اس شعر میں مختصراً بیان ہوا زیادہ شرح کے ساتھ ایک غزل میں بیان کیا ہے جس کے تین چار شعر ذیل میں درج کیے جاتے ہیں :

برق کی صورت پہنچتا ہے طبائع پر اثر
آ گیسا تــار امید و بیم اُن کے ہاتھ ہیں

مغربی رنگ و روش پر کیوں نہ آئیں اب قلوب
قوم اُن کے ہاتھ میں تعلیم ان کے ہاتھ میں
جج بنا کر اچھے اچھوں کا لبھا لیتے ہیں دل
ہیں نہایت خوش نما دو جیم اُن کے ہاتھ میں
مغرب ایسا ہی رہا اور ہے اگر مشرق یہی
ایک دن دیکھیں گے ہفت اقلیم ان کے ہاتھ میں

اب تک ہم نے اکبر کی ظرافت کے کوئی نمونے پیش نہیں کیے مگر ظریفانہ اشعار کے بغیر اُن کے کلام کی تنقید نامکمل رہ جائے گی ، کیونکہ ظرافت ایسی چیز ہے کہ تشریح سے اُس کا لطف جاتا رہتا ہے ، اس لیے یہ اشعار بغیر کسی حاشیہ چڑھانے کے نقل کیے جاتے ہیں۔ البتہ یہ بات قابل ملاحظہ ہے کہ ان اشعار میں بھی اس زمانے کا ہر ضروری مسئلہ بڑی خوبی سے حل کیا گیا ہے :

حیراں ہیں اس زمانے میں ہم جی کے کیا کریں
جائز سہی شراب مگر پی کے کیا کریں
تعلیم اونچے درجے کی ہوتی نہیں نصیب
پھر گھر میں بیٹھ کر بجز اے بی کے کیا کریں

اگر مجھے شک نہیں تیری تیزی میں
اور تیرے بیاں کی دل آویزی میں
شیطاں عربی سے ہند میں ہے بے خوف
لاحول کا ترجمہ کر انگریزی میں

وضع مغرب سے اگر دیکھا تو یہ کافور تھی
اب میرسمجھا واقعی ڈاڑھی خدا کا نور تھا

اردو کے تین ربع کے مالک ہیں خود ہنود
پھر کیا سبب جو اس سے ہیں انحراف ہے
یعنی آرد ہے چیز الھیں کے مذاق کی
اردو کے تین جزو یہ ہی صاف صاف ہیں

اے شیخ جب لکیل نہیں دست قوم میں
پھر کیا خوشی جو اونٹ ترے ریل ہوگئے

اضافہ ہوئی مجھ سے گندم یہ سے
یہ ہونے سے بھی اِک خطا ہوگئی

رہی رات ایشیا غفلت میں سوتی
نظر یورپ کی کام اپنا کیا کی
ابھی انجن گیا ہے اس طرف سے
کہے دیتی ہے تاریکی ہوا کی

ظریفانہ اشعار کے متعلق کچھ اور لکھنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ لفظ انجن کی تھوڑی سی تشریح کر دی جائے۔ کلام اکبر میں لفظ انجن بت اور مس کی طرح استعارے کا رتبہ رکھتا ہے۔ آج کل کی مادی ترقی کا مجسم قائم مقام ہے اور اس پر جو پھبتی کہی جائے وہ مادی ترقی پر اعتراض ہوتا ہے۔ شعر مندرجہ بالا میں جو ہوا کی تاریکی کی طرف اشارہ کیا ہے اس میں گویا ظاہری لطف بھی موجود ہے کہ انجن جدھر سے نکل جائے ہوا تاریک ہو جاتی ہے۔ مگر یہ باطنی اعتراض بھی صحیح ہے کہ مشینوں اور کلوں کی ترقی کے ساتھ ساتھ اخلاق اور روحانی تاریکی اکثر ممالک میں داخل ہوتی جاتی ہے۔

ظرافت اس میں شک نہیں کہ ہمیشہ مہذب نہیں ہوتی ۔ گو ہم نے جو اشعار انتخاب کر کے پیش کیے ہیں ، وہ جوہر تہذیب سے آراستہ ہیں ۔ تاہم کلیات کے حصہ ظرافت میں بہت سے اشعار ایسے بھی ہیں جو ہمارے نزدیک صفحہ کاغذ پر نہ آترنے چاہییں تھے ۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ اکبر جیسا طباع شخص اگر کوئی اس کو لطیفہ سوجھے تو اس کے کہنے سے رک جاتا ، مگر اس صورت میں کہ وہ مہذب ظرافت کے دائرے سے خارج ہو اس کو چھپوانا مناسب نہیں ، کیونکہ چھپی ہوئی چیز ہر کہ و مہ ، زن و مرد ، پیر و جواں کے ہاتھ میں جا سکتی ہے اور اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ نوعمر طبائع پر ایسی ظرافت کا کیا اثر پڑ سکتا ہے ۔ ایسے لطیفے بے تکلف صحبتوں کی تفریح کے لیے زبانی تو بیان ہو سکتے ہیں مگر اس کتاب میں ان کا آ جانا کتاب کی عام وقعت میں کسی قدر خلل انداز ہوگا ۔ اور ہمارا خیال ہے کہ جب اس کے دوبارہ طبع ہونے کی نوبت آئے تو اس پہلو سے نظرثانی نہایت مفید ہو گی ۔

ایک اور اعتراض قابل ذکر ہے اور وہ یہ کہ گو انگریزی الفاظ کے استعمال میں جناب اکبر کو ایک مہارت خاص حاصل ہے اور وہ انھیں اکثر جگہ اردو میں نہایت خوبصورتی سے کھپاتے ہیں ، پھر بھی کہیں کہیں یہ استعمال حد سے زیادہ بڑھ جاتا ہے جو نامناسب معلوم ہوتا ہے اور اس بارے میں کسی قدر احتیاط سے کام لینا کلام اکبر کی بے شمار خوبیوں کو بڑھا دے گا ۔ جن اشعار میں انگریزی لفظ بے تکلف بندھے ہیں اور لطف دے رہے ہیں یا ناگزیر تھے اُن کے نمونے ہم پیش کرتے ہیں ، اور اس کے بعد کچھ ایسے اشعار نقل کریں گے جن میں وہ تکلف سے لائے گئے ہیں ، یا ضرورت

سے زیادہ بھرتی کیے گئے ہیں - اس مقابلے سے اس اعتراض کی توضیح ہو جائے گی :

کہتے ہیں جرح کیا ہے جو باریک ہے وہ پُل
بائیسکل پہ گزریں گے ہم پُل طراط سے

ایسی پری اور مجھ کو پیارا لکھے
القاب میں دیکھیے ڈیر کلو ہے

حکمتوں سے ہوئی ہے جزو شکم
روح تو اب کورس جیتی ہے

کرکٹ ، جمناسٹک ٹریننگ کالج
مولانا سیکھتے ہیں بالفعل لٹی

اجل آئی اکبر گیا وقت بحث
اب 'اف' کیجیے اور نہ 'ہٹ' کیجیے

ممکن نہیں اے مس ترا نوٹس نہ لیا جائے
گال ایسے پریزاد ہوں اور کس نہ لیا جائے

جب میں کہتا ہوں کہ ''گیو می کس ڈیر''
سر جھکا کر کہتے ''ہو سے ٹیک'' ہیں

زیادہ قابل افسوس یہ ہے کہ ان انگریزی الفاظ اور فقرات کے ساتھ اُن کے اردو معنی بھی درج نہیں کر دیے گئے ، اور اس وجہ سے جو

لوگ انگریزی سے بالکل ناآشنا ہیں وہ اُن کی معنی سمجھنے سے بالکل قاصر رہیں گے ۔

آخر میں ہم بحیثیت مجموعی اس لاجواب کتاب کی دل سے داد دیتے ہوئے اتنی بات اور کہہ دینی ضروری سمجھتے ہیں کہ ترتیب کے لحاظ سے اگر دورِ اول کو پہلے اور دورِ سوم کو بعد میں رکھا جاتا تو اُس سے علاوہ قدرتی تناسبِ ترتیب کے یہ فائدہ حاصل ہوتا کہ کلام کے ناظرین کو جناب اکبر کی شاعری کی رفتار کی تدریج نظر آ جاتی کہ کس طرح شروع ہوئی اور کہاں تک بڑھی ۔ اُس کے ابتدائی دور میں کون سی چیز تھی جو اس کمال ترقی کا پتہ دیتی جو آخر اُن کے کلام نے حاصل کیا ہے اور جس کی بدولت وہ جدید ادب اردو کے اُن اساتذہ میں آ گئے جن کا نام اُس وقت تک زندہ رہے گا جب تک یہ زبان اور اس کا علمِ ادب زندہ ہے ۔

★ ★ ★

دیوان سید محمد کاظم حبیب پر ایک نظر[1]

سید محمد کاظم حبیب المتخلص بہ حبیب کنتوری یادگار خاندان شیخ ناسخ[2] مرحوم شعرائے زمانہ حال کے اعلیٰ طبقے میں شمار ہونے کے قابل ہیں۔ حال میں ان کا دیوان مطبع شمسی حیدر آباد دکن میں شائع ہوا ہے۔ اور اتنا اندازہ تو اس پر سرسری نظر ڈالنے سے ہی ہو سکتا ہے کہ کہنہ مشق استاد ہیں اور خداداد قوت سخن کے زور سے لکھ رہے ہیں۔ کلام میں آمد زیادہ ہے اور آورد کم۔ مگر یہ معلوم کرکے کہ سید حبیب ایک ایسے خاندان سے ہیں جو علماء کا خاندان ہے اور خود بھی ذی علم آدمی ہیں، اُن کے کلام کی ایک وقعت خاص دل میں پیدا ہوتی ہے کیوں کہ ذی علم آدمی عموماً اپنے ہر کام کے لیے کوئی انجام اور مقصود قرار دیتا ہے۔ اگر وہ ذوق شعر رکھتا ہے تو شعر گوئی اور سخنوری سے محض اپنی فطرت کے ایک پر زور تقاضے کو ہی پورا نہیں کرتا بلکہ چاہتا ہے کہ اس ذریعے سے اپنے بھائیوں کی کچھ خدمت کرے اور ان کو مقبول پیرائے میں اخلاق، مذہبی یا علمی مسائل اور نکات سمجھا دے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سید محمد کاظم صاحب حبیب کے دل میں یہ خیال ایک عرصے سے موجود ہے کہ ان کی شاعری وہ شاعری نہ ہو جس پر فعل عبث کا فتویٰ لگ سکے یا جس سے بعض شائقین سخن کی فوری تفنن

---

۱ - منقول از ماہنامہ "مخزن"، فروری ۱۹۰۲ء، ص ۲۷-۳۳ -

۲ - امام بخش ناسخ (۱۸۳۸-۱۷۷۱ء) شعرائے اُردو کے اُستاد۔ آپ کی یادگار دو دیوان ہیں۔

طبع سے بڑھ کر کوئی نتیجہ پیدا نہ ہو ۔ اور اس خیال کا ان کے دل میں جاگزیں ہونا خصوصیت سے قابل داد ہے ، کیونکہ یہ خیال ہندوستان کی دنیائے شاعری میں ایک زمانے سے کمیاب ہے اور دہلی اور لکھنو کی صحبتیں اس شوق سے اتنی ہی دور ہیں جتنا چین انگلستان سے۔ لکھنو کی صحبتوں میں حبیب کنتوری کو تحصیل فن کے لیے رہنے کا موقعہ ہوا ہے ۔ ان میں سے نکل کر ان کی جانب سے یہ کوشش شروع ہونا کہ اردو زبان میں غزل کا رنگ بدل جائے اور غزل سے وہ کام لیا جائے جو صوفیا اپنے صوفیانہ کلام سے تہذیب اخلاق کے متعلق لیتے رہے ہیں اور جو مصلحان قوم نثر کی پُر زور تقریروں اور مولانا حالی صاحب مسدس اور ترجیع بند قومی نظموں سے ، خالی از تعجب نہیں ۔ اور یہ تعجب اور بھی بڑھ جاتا ہے جب یہ معلوم ہو کہ ان کو بسلسلۂ ملازمت حیدر آباد دکن سے تعلق ہے اور مدت سے وہیں رہتے ہیں ، وہاں کی مجالس میں آتے جاتے ہیں ، وہاں کے لوگوں سے ملتے ہیں ، وہیں کے اہل ذوق سے داد پاتے ہیں اور وہیں ایک خاصا حلقہ اپنے شاگردوں اور مداحوں کا رکھتے ہیں ۔ بلدۂ حیدر آباد اس وسیع مگر بدقسمت ملک ہند کے ان چند بڑے شہروں میں ہے جہاں اب تک رفتار زمانہ سے بہت کچھ بے پروائی ہوتی ہے ۔ بے پروائی تو ایک طرف شاید بے خبری ہے ۔ اُمرا ہیں کہ (خاص مستثنیات کو چھوڑ کر) یوں محو آرام پرستی ہیں کہ گویا دنیا ان کے لیے ہے اور وہ دنیا کے لیے ۔ گویا نہ کبھی اس سے پہلے زمانے میں انقلاب آئے ہیں نہ اب آ رہے ہیں، نہ آیندہ آئیں گے اور اگر کھٹکا ہو بھی تو بلا سے ۔ کم از کم ان کے لیے تو انقلاب پیدا ہی نہیں کیے گئے ۔ بزرگوں کی بدولت جھوٹا سچا شوق علمی اگر کسی میں ہوا بھی تو وہ لفظی دل چسپیوں تک محدود ہے ۔ کسی سخن ور کا کلام اُن کے کان تک اگر اتفاق سے پہنچ گیا تو

صلہؑ داد اسی صورت ممکن ہے کہ کوئی لفظی صنعتیں ایسی ہوں جو انہیں سمجھ آجائیں ، کوئی بندش یا نشست الفاظ ایسی ہو کہ اُن کے دل میں بیٹھ جائے یا کوئی مضمون رنگین ، عشق و عاشقی یا بادہ نوشی کا ایسا ہو جو حسب حال معلوم ہو۔ فلسفی خیالات اور اخلاق مضامین سے تو واسطہ نہیں۔ کہیں اگر سن پالیں تو فوراً منہ پھیر کر کہہ دیں ''کیا پھیکا پھس پھسا کلام ہے۔ اسے کہو مسجد میں جاکر وعظ کہے ، جس کو ضرورت ہوگی خود جا کر سن لے گا۔ اگر خدا نے شاعر نہیں بنایا تو کیا ضرورت ہے کہ خواہ مخواہ السان شعر ہی کہے۔ اپنا وقت ضائع اور دوسروں کا دماغ پریشان کرے۔ آئے وہاں سے بڑے متقی اور پرہیزگار ، ناصح مشق بن کے۔ واللہ ہم ایسے لوگوں سے سخت جلتے ہیں''۔ دو چار حاشیہ نشینوں نے ہاں میں ہاں ملائی اور چلیے فلسفی شاعر کو اپنی عرق ریزی کا صلہ مل چکا۔ اس سے بھی کم قدر ایسے حلقوں میں اُس شاعری کی ہے جس کو قومی شاعری کہتے ہیں۔ جہاں قوم کا نام کسی شعر میں آ گیا اور ہمارے نازک مزاج رئیس بگڑے ''اجی کوئی اور اچھی سی چیز پڑھو۔ خدا جانے آج کل کیا مرض پھیل گیا ہے۔ جسے دیکھو قوم قوم پکار رہا ہے۔ بس یہی ایک حیلہؑ رزق ہاتھ لگ گیا ہے''۔ اگر کسی شاعر نے اس سے بڑھ کر غلطی کی ہے اور غزل میں قومی رنگ بھر دیا ہے ، بس اس نے تو اپنا گلا آپ کاٹ ڈالا۔ اگر شہرت پائی بھی تھی تو کھو دی۔ اس خنجر ستم کے سب سے پہلے مجروح مولوی الطاف حسین صاحب حالی ہیں۔ چند سال ہوئے کہ ان کا دیوان چھپا۔ بہت لوگوں نے تو نثر کا جو دیباچہ اس کے پہلے لکھا ہوا تھا اس کو پڑھ کر اصل دیوان کو پڑھا ہی نہیں۔ ان

کے نزدیک حالی کی غزلوں کا پڑھنا غزل گو شعرا کے مذہب کی تکفیر کا مستوجب ہوتا تھا ۔ بعض نے ورق گردانی کی اور جہاں غزل میں قومی مضمون دیکھے آسے پھینک دیا ''ابھی اب مسدس حالی کے بعد انہی خیالات کو غزل میں کیا پڑھا کرے'' ۔ بعض ایسے بھی نکلے جنھوں نے ذرا غائر نظر ڈالی اور اس جھگڑے میں پڑ گئے کہ شاذ اور لاز کا قافیہ، جو مولانا حالی نے لکھ دیا ہے ، اس کے واسطے عدالت شاعری سے کوئی تعذیر مقرر ہونی چاہیے ۔ کوئی صاحب آئے کہ ''اینڈیں آچاٹ دیتی تیری کہانیاں ہیں'' اچھا مصرع نہیں ۔ آچاٹ کا یہ استعمال بہت نا مذاق اور نفیس نہیں ۔ ایک صاحب بولے : ''خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا'' باعتبار مضمون کے تو عشق کی سچی تعریف ہے مگر ''شخص'' ایک ایسا لفظ ہے کہ نثر کے لیے مخصوص ہے اور مصرع میں گھبرایا ہوا بیٹھا ہے کہ میں کہاں آپھنسا ۔ ایک زمانہ آئے گا کہ شاعری کے اُس رنگ کی ، جسے حالی نے اپنا بنایا ہے ، قدر کی جائے گی اور اسی کے یہ عنوان ہیں کہ حبیب کنتوری ، جو اساتذہ لکھنئو سے تلمذ رکھتے ہیں اور حیدر آباد میں مقیم ہیں ، وہاں سے بیٹھے ہوئے حالی کو پہچانتے ہیں ۔ انھوں نے ایک غزل لکھی ہے جس میں ہر شعر نتیجہ خیز ہے اور مقطع میں جتا دیا ہے کہ وہ اور حالی اس حصہ مذاق میں ہمدرد ہیں ۔ وہ لکھتے ہیں :

عیاں ہے سنگ سے آہن کے اشتیاق کا درد
ہر ایک نوع میں موجود ہے فراق کا درد
وہ سنگ ہے نہ ہو جس دل میں اتفاق کا درد
ہمیشہ مہلک اقوام ہے نفاق کا درد

نہ سمجھے کا جو ہمیشہ رہا ہے ناساماں
کبھی بھی گر کوئی بے ساز بے براق کا درد
تمہیں بھی بھائیو لازم ہے اس کی چارہ گری
ہمارے دل پہ بہت شاق ہے نفاق کا درد
حبیب خوب تھی طرز کلام اہل عرب
ہوا ہے ہند میں حالی کو اس مذاق کا درد

حبیب نے سیدھے سادے رنگ میں غزلیں لکھی ہیں اور لطف یہ ہے کہ خوبیٔ زبان کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ۔ اس میں شک نہیں کہ صوفیانہ، اخلاق اور مذہبی رنگ رندانہ مذاق کے ساتھ ساتھ ہر استاد فن کے ہاں کم و بیش پایا جاتا ہے ۔ حالی اور حبیب کے رنگ کے سخن وروں میں اور پرانے شعرا میں اس بارے میں تمیز یہ ہے کہ وہاں رندانہ رنگ اصل مقصود ہے اور تصوف اور اخلاق کی تھوڑی سی چاشنی داخل وضعداری اور یہاں اخلاق شاعری مدنظر ہے، اور عاشقانہ مضامین وضع کے لباہ کا تقاضا ۔ ہم چند غزلیں اور چیدہ اشعار دیوان حبیب سے اقتباس کر کے ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں تاکہ وہ اندازہ لگا سکیں کہ دیوان بھر میں اخلاق مضامین کس کثرت سے موجود ہیں :

قید تکلیف سے ہیں اہل طریقت آزاد
غم دنیا سے یہ رکھتے ہیں طبیعت آزاد
ہو گا تنہائی و غربت سے ضرر کیا اے چرخ
ہو گئے روز کے جھگڑوں سے فراغت آزاد
نہیں جتے کسی چہرے پہ کبھی ہو کے غبار
بنتے ہیں ابر کرم جن کی ہے طینت آزاد

یار شاطر بھی کہیں ہوتے ہیں بار خاطر
روز احباب کو دیتے نہیں زحمت آزاد
متکفل ہے خدا بار علائق کا حبیب
خلق میں چاہیے انسان کی ہمت آزاد

اس غزل کو پڑھتے ہوئے بالکل اسی رنگ کی ایک غزل مولانا حالی کی یاد آ گئی جس کے کچھ شعر درج کر دینے کو بے اختیار جی چاہتا ہے :

عالم آزادگاں ہے اک جہاں سب سے الگ
ہے زمیں ان کی اور آن کا آسماں سب سے الگ
پاک ہیں آلائشوں میں ، بندشوں میں بے لگاؤ
رہتے ہیں دنیا میں سب کے درمیاں سب سے الگ
یوں علائق میں یہاں جکڑا ہوا ہے بند بند
پر جو دل ڈھونڈو تو آن کا ہے وہاں سب سے الگ
سب کی سن لیتے ہیں لیکن اپنی کچھ کہتے نہیں
ہے کوئی بھیدی اور آن کا رازداں سب سے الگ
مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں حالی نے کھولی ہے دوکاں سب سے الگ

یہ الگ دوکان جو اس جدید مذاق کے پسند کرنے والوں نے کھولی ہے ، اسے کچھ عرصے تک قبول عام سے ہاتھ دھونا پڑے گا اور چند قدردانوں کی قدردانی پر قناعت کرنی ہوگی ۔ لیکن وہ دن آئے گا کہ یہ دکانیں غیر آباد اور بے رونق نہ رہیں گی ۔ پرانے اور مشہور بازاروں سے کئی بڑے بڑے سوداگر اسی بازار کی طرف

جھکیں گے اور جوہریانِ سخن کی نئی نسلیں اس بازار کی گاہک ہوں گی ۔ سر دست تو انھیں بھی تسلی ہونی چاہیے کہ اپنی اپنی خدمت انجام دے کر فرض سے سبکدوش ہو جائیں ۔ دیکھیے تو سہی اس تہذیب کے راگ کے جو حبیب نے گایا ہے، سننے والے ابھی کہاں ملتے ہیں :

مہر و الفت ہے مالِ تہذیب
خاکساری ہے کمالِ تہذیب

ہے وہ آرائشِ حسنِ باطن
جس کو کہتے ہیں جمالِ تہذیب

کم نہیں مردمکِ چشم سے کچھ
رخِ انسان پہ خالِ تہذیب

آج کل ہم میں اگر سچ پوچھو
شکل عنقا ہے مثالِ تہذیب

رخ پہ کرتا ہے متانت پیدا
دل میں آتے ہی خیالِ تہذیب

قوم کا اپنے نہ گھٹتا وہ عروج
ہو نہ جاتا جو زوالِ تہذیب

جامِ جم سے ہے کہیں پُر تمکیں
بزمِ خلّت میں سفالِ تہذیب

مردہ قوموں کے لیے آبِ حیات
بنتا جاتا ہے زلالِ تہذیب

بدر بن جائے گا چندے میں حبیب
حق نے چاہا تو ہلالِ تہذیب

اُن غزلوں کے سوا جن میں سوائے نصیحت آمیز رنگ کے دوسرا رنگ آنے نہیں پایا ، جابجا اس مجموعے میں ایسی غزلیں ملتی ہیں جن میں اکثر اشعار میں مفید خیالات کا پہلو مد نظر رکھا گیا ہے - مثلاً ایک موقعے پر فرماتے ہیں :

مانگوں خدا سے اپنے نہ کیوں نفس مطمئن
بس اک یہی مقام ہے بیم و رجا کے بعد
ہوتی ہے جس طرح شب دیجور کی سحر
آتا ہے روز عید یوں ہی ہر بلا کے بعد
ہو التیام زخم زباں کا ، محال ہے
کیا لطف معذرت سخن ناسزا کے بعد
بد ہیں معاملات میں درپردہ سازشیں
یاران سینہ صاف سے عہد وفا کے بعد
سمجھو بنا رہا ہے خطا کار کو دلیر
راضی جو درگذر پہ نہ ہو التجا کے بعد
انداز ساز دہر ہے حیرت فزا حبیب
دلچسپ تر ہے یاں جو صدا ہے صدا کے بعد

ایک اور غزل میں نہایت مشکل زمین میں مفید مضمون آفرینی کا شوق پیدا کیا گیا ہے :

خود ہیں جو سچے وہ کر لیتے ہیں باور جھوٹ سچ
روح کی قوت سے ہو جاتا ہے اکثر جھوٹ سچ
غیر ممکن ہے کہ فرق آئے محبت میں مری
اس میں کیا بس کوئی کہہ دے تم سے کچھ گر جھوٹ سچ

اہل دنیا کو نہیں مرغوب خالص راستی
شاید اغراض کو گویا ہے زیور جھوٹ سچ
پڑ گیا افواہ میں سچ بھی تو ہو جاتا ہے جھوٹ
یہ بھی دیکھا ہے کہ ہو جاتا ہے اکثر جھوٹ سچ
ہے مبصّر کو حبیب اس وقت مشکل امتیاز
خاق میں ہوجائے شائع جب کہ مل کر جھوٹ سچ

اسی غزل کے لہجے ہی یہ دو تین شعر چبھتے ہوئے نظر آتے ہیں :

کیوں نہ آ جائے فرومایہ کو غصہ جلدی
آگ لگتے ہی بھڑکتی ہے خس و خار کی آنچ
حرص میں جوش میں اچھا نہیں لڑنا بھڑنا
خاک اقوام کو کر دیتی ہے پیکار کی آنچ
ہیں کثافت سے بری جن کے طبائع ہیں لطیف
نہ دھواں ہے نہ کہیں آتشِ گلزار کی آنچ

غرض کہاں تک حبیب کے گلزار سخن کی گل چینی کی جائے ۔ صاحبان ذوق خود پڑھیں اور اپنی اپنی پسند کے اشعار چن لیں ۔ ہاں اتنا جتا دینا ضروری ہے کہ جابجا تغزل پر بھی قادر ہونے کا ثبوت دیا گیا ہے ۔ لکھتے ہیں اور کیا بے ساختہ لکھتے ہیں :

اتفاقاً آن کا آنا ہو گیا
دل کے جانے کا بہانا ہو گیا
تھا سبک رو توسنِ عمر رواں
عشق کا کل تازیانہ ہو گیا

کہتے ہیں سن سن کے ہاں پھر کیا ہوا
حال میرا اک فسانہ ہو گیا

تم جو آئے سب کو حیرت ہو گئی
میرا گھر آئینہ خانہ ہو گیا

دن بہت گزرے ، بدلنا چاہیے
جامۂ ہستی پرانا ہو گیا

پوچھتے کیا ہو کہاں ہے اب حبیب
مر کے بھی اس کو زمانہ ہو گیا

تصوف کا مذاق گو اکثر اشعار میں پایا جاتا ہے مگر بعض اشعار میں کمال کو پہنچ گیا ہے :

مبداء قدرت ہے حسن صورت آرائے ازل
اس نے جب آئینہ دیکھا اک حسیں پیدا ہوا
کیا عجب باہم ہوا گر ارتباط جسم و روح
درد سے پہلے مرا قلب حزیں پیدا ہوا

غرض مختلف مذاق کے اشعار کو جو اس دیوان میں ملتے ہیں ، پڑھنے کے بعد یہ کہنا پڑتا ہے کہ ایک مقطع میں جو حبیب نے سخن گسترانہ تعریف اپنی کی ہے وہ حقیقت میں اس کا مستحق ہے ، اور وہ تعریف یہ ہے :

دانائے فن سنیں گے تو فرمائیں گے حبیب
پختہ کلام ہے کسی نازک خیال کا

اس کے سوا بالکل جدید طرز میں مسلسل مضامین نظم لکھنے میں بھی حبیب صاحب دستگاہ کامل رکھتے ہیں اور اس طرز کے

کلام کا ایک نمونہ ، جو انھوں نے ''مخزن'' کے واسطے خاص طور پر لکھا ہے ، آج حصہ' نظم میں درج کیا جاتا ہے ۔ شائقین پڑھیں اور داد دیں ۔ آن سے اختلاف اگر ہم کو ہے تو صرف ایک بات میں اور وہ یہ کہ شاعرانہ رقابت کے جوش میں انھوں نے بعض معاصرین کی طرف ایسے کھلے اشارے حقارت آمیز کیے ہیں جو پایہ' متانت سے گرے ہوئے ہیں ۔ رقابت شعرا کے ساتھ ساتھ رہی ہے اور ایشیائی شعرا میں بالخصوص بہت کم اس سے خالی ملیں گے ۔ ہندوستان میں یہ اور بھی ترقی کر گئی ہے اور بعض دفعہ شاعروں کی باہمی چشمک ناظرین کے لیے لطف خاص رکھتی ہے ، بشرطیکہ نزاکت کے ساتھ چوٹ کی جائے ۔ کہیں کہیں اس قسم کے اشعار دیوان حبیب میں بھی ہیں جن کے لیے خواہ مخواہ داد زبان پر آتی ہے مگر جہاں بہت کھلے اشارے ملتے ہیں وہ صحیح مذاق کو ضرور کھٹکتے ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ اگر طبع ثانی کی نوبت آئے تو ایسے اشعار نکال دیے جائیں کیونکہ ان کی موجودگی سے اس نصیحت آمیز کلام کی تاثیر میں فرق آنے کا ڈر ہے جس سے ان کے دیوان کی بہت سی غزلیں مملو ہیں ۔

* * *

جنگِ روس و جاپان پر ایک تنقیدی نظر

"جنگِ روس و جاپان" کے عنوان سے حیدر آباد کے مشہور و مقبول رسالے "دکن ریویو" میں ایک قابل قدر اور نتیجہ خیز مضمون شائع ہوا ہے جسے اردو میں پہلا پولیٹکل ڈراما کہہ سکتے ہیں - جب خود ڈراما ہی اردو میں ایک نئی چیز ہے اور چند تازہ کتابوں کے سوا کام کے ناٹک ابھی ہماری زبان میں نایاب ہیں تو ڈرامے کی مختلف اقسام کی نوبت کہاں سے آتی - لیکن اس میں شک نہیں کہ روزمرہ کے واقعات اور سیاسی خیالات کے ذہن نشین کرنے کے لیے واقعات کو افسانے کا لباس پہنانا اور ڈرامے کے دلچسپ مکالموں کی صورت میں ادا کرنا ایک نہایت ہی مؤثر پیرایہ' بیان ہے ، اور مغربی دنیا کے صاحبانِ تصنیف اس سے عموماً بڑے بڑے کام لیتے ہیں - "دکن ریویو" کے باخبر ایڈیٹر محمد ظفر علی خاں صاحب بی - اے نے اس مثال سے فائدہ اٹھایا ہے اور جاپان کی نمایاں فتح کی یادگار میں ایک ایسی چیز لکھی ہے جس کا اثر ہندوستان کے ہر حصے میں محسوس ہونا چاہیے - یہ ڈراما "ریویو" کے دو سو صفحے کے قریب گھیرے ہوئے ہے اور اس کی اشاعت کی خاطر چار مہینوں کے پرچے یک جا چھاپے گئے ہیں - قصے کے شروع ہونے سے پہلے ایک تمہیدی مضمون مولوی عبدالحق صاحب بی - اے سابق ایڈیٹر رسالہ "افسر" کا لکھا ہوا ہے جو بجائے خود بہت تعریف کے قابل ہے - حقیقت یہ ہے کہ

۱ - ماہنامہ "مخزن" بابت فروری ۱۹۰۶ع (جلد ۱۰ نمبر ۵) ، ص ۴۳ تا ۵۲ -

ڈراما تو ایک جالہ ہے ۔ قابل مصنف کا مدعا اپنے ملک میں شوق ترق پھیلانا ہے اور اس مدعا کے حصول کے لیے اس تصنیف کے بعض حصے نہایت موزوں ہیں ۔ ہمارے ذخیرۂ ادب کو ایسی کتابوں کی بے حد ضرورت ہے جو سیاسیات کے مسائل دلچسپ طریقوں سے اور عام فہم پیرائے میں اردو داں جماعت کے روبرو پیش کریں ، اور ہمارے ہم وطنوں میں ان مسائل پر غور و فکر کرنے کی عادت ڈالیں ، اور انھیں دنیا کے دوسرے ملکوں کی عملی قوت کی تقلید کے لائق بنائیں ۔ یہ ڈراما چار باب پر منقسم ہے اور ہر باب میں متعدد سین ہیں ۔ پہلا پردہ اُٹھتے ہی شہنشاہ مکاڈو کی مجلس شوریٰ دکھاتا ہے جس میں شہنشاہ اپنے ارا کین سے یوں مخاطب ہوتا ہے :

گرچہ اقصائے شرق میں بج رہا ہے کوس وقار اپنا
نواحِ مغرب میں لیکن اب تک جما نہیں اعتبار اپنا
مزا تو جب ہے کہ جرمنی اور فرانس مانیں ہمارا لوہا
ہمارے آگے سر تفاخر جھکائے مغرور زار اپنا *

دربار کے امراء شہنشاہ کے ہم خیال اور ہم آہنگ ہیں اور روس سے جنگ ٹھن جاتی ہے ۔ دوسرا پردہ محل شاہی سے ہمیں ایک غریب بڑھیا کی جھونپڑی میں لے جاتا ہے جو اپنے اکلوتے بیٹے اوکیو کو خدمت ملک و قوم کے لیے آزاد کر دینے کی غرض سے جان پرکھیل جاتی ہے اور یہی اوکیو ، جس سے ہمیں ابتداء سے ہی ہمدردی پیدا ہوتی ہے ، اس قصے کا ''ہیرو'' بنتا ہے اور اسی کی بدولت اس ڈرامے میں حسن و عشق کی چاشنی پیدا کی جاتی ہے ۔ تیسرا پردہ ہمیں مشرق کی سرزمین سے منتقل کر کے دفعتاً مغرب کا نقشہ دکھاتا ہے اور زار روس اپنے مشیروں سے سرگرم مشورت نظر آتے ہیں اور

اُن کے متکبر امرا لڑائی پر آمادہ کرتے ہیں ۔ دونوں درباروں کا نقشہ کھینچنے میں اُن کی اندرونی حالت کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور مکاڈو اور زار کے خیالات اور جذبات کا فرق دکھایا گیا ہے ۔ اسی طرح جاپان اور روس دونوں ملکوں کے رہنے والوں کی حالت کا مقابلہ بھی جابجا کیا گیا ہے ۔ جاپانی اپنے حاکم سے خوش اور اپنے ملک پر جان فدا کرنے کو تیار دکھائی دیتے ہیں اور روسی مدتوں کے ظلم و تعدی سے تنگ آ کر زار اور اُس کی حکومت کے تزلزل کے خواہاں ہیں اور جاپانیوں کو زار کے لیے ایک خدا ساز سامان تہدید سمجھتے ہیں ۔ جاپانی افسروں کا ایثار اس سے ظاہر ہے کہ اوکیو اپنی ایمی کو ، جس کا وہ سچا جاں نثار اور عاشق ہے ، خدا کے حوالے کر کے جنگ میں سربازی کو جاتا ہے ۔ روسی افسروں کی تباہی اُن کی عیاشی سے ہویدا ہے کہ میدان کارزار میں بھی ناچ کے جلسے رچاتے ہیں اور وہاں امیر البحر ایک افسر کی بیوی کو بھگانے کی فکر میں نظر آتا ہے ۔

دوسرا باب جس پردے سے شروع ہوتا ہے وہ آہنائے کوریا کا منظر ہے اور جاپانی امیر البحر ٹوگو کے جہاز وہاں مقیم نظر آتے ہیں ۔ امیر البحر اور اُس کے افسروں کا مکالمہ پُرحوصلہ خیالات سے لبریز ہے ۔ دوسرا سین آہن پوش جہاز اساما کی تصویر دکھاتا ہے جہاں کپتان صاحب اُن سپاہیوں اور افسروں کا جام صحت پی رہے ہیں "جو پورٹ آرتھر کا دہانا بند کرنے والی مہم کے ہمراہ جانے کے لیے" نامزد ہوئے ہیں ۔ یہ جام صحت شراب کی جگہ پانی کا جام ہے اور کپتان صاحب کی تقریر میں ایک بلا کا کاٹتا ہوا فقرہ اہل یورپ کے شوقِ شراب نوشی کے متعلق ہے ۔ وہ کہتے ہیں :

"یہ ہانی کا پیالہ جو میں اس وقت تمھیں پینے کے لیے دیتا ہوں اس سے مجھے تمھاری جرأت یا حوصلہ بڑھانا مقصود نہیں بلکہ یہ اس بات کی علامت ہے کہ تم اس آہن پوش کے چیدہ چیدہ جانبازوں میں سے ہو۔ ہم لوگوں کے لیے اس سے بڑھ کر ذلت اور شرم کی اور کوئی بات نہیں ہو سکتی کہ مقام ہلاکت میں جاتے وقت اہل یورپ کی اس مصنوعی جرأت کا سہارا ڈھونڈیں جو شراب کے پیالے کی تہہ میں چھپی ہوئی ہوتی ہے۔"

دونوں حریفوں کے عادات و اطوار کے امتیاز کو ایک فقرے میں ادا کر دینے کے لیے اس سے بہتر ترکیب مشکل تھی۔ تیسرا سین ہمیں پھر زار کے محل کی سیر کراتا ہے جہاں امراء کی باہمی رقابتیں اور اپنے اپنے رفقا کی طرف داریاں بڑے زور سے موجود ہیں اور خود غرضی حب وطن کا بھروپ لیے کھڑی ہے۔ اُن کی باتیں سنو تو یہی معلوم ہوتا ہے جیسے اُس کی عزت کے دل سے خواہاں ہیں اور اُن کے طرز عمل کو دیکھو تو اپنے ملک کی صاف جڑ کاٹتے معلوم ہوتے ہیں۔ چوتھا سین روسی مسلمانوں کی ایک مجلس اور اُن کی بددلی کا نقشہ ہے۔ پانچویں، چھٹے اور ساتویں سین میں باغی روسیوں کی سازشیں اور ایک عورت کے سبب سے اُن کی سب سے بڑی سازش کا افشا۔ اس عورت کا قید ہونا اور اپنے عاشق کے ذریعے، جو فوج میں عہدہ دار ہے، اس کا بچ نکلنا بیان کیا گیا ہے۔ آٹھواں پردہ اُس عورت کو مردانہ بھیس بدلے ہوئے پاتا ہے اور وہ اپنے رہا کرنے والے عاشق کی نوکری کر کے اُس کے ساتھ لڑائی میں جاتی ہے۔ ان دونوں کی سچی دلدادگی کا تذکرہ بھی ضمناً دلچسپی رکھتا ہے۔ ان سے ہماری آخری ملاقات ڈرامے کے اختتام کے قریب ہوتی ہے جہاں وہ فوجی افسر زخم کھا

کر ہسپتال میں جان دے دیتا ہے اور اُس کی فدائی محبوبہ بستر مرگ پر اس سے بیاہی جاتی ہے اور خود بھی وہیں جان دے دیتی ہے۔ تیسرے باب میں ہم اوکیو سے پھر روشناس ہوتے ہیں مگر حضرت پہچانے نہیں جاتے۔ پہچانے کیوں کر جائیں، ایک چینی کسان کے بھیس میں دشمن کے خیموں میں گھس کر جاسوسی کر رہے ہیں اور ایسے اُستاد ثابت ہوئے ہیں کہ غنیم کے ہاں سے مجوزہ نقشۂ جنگ تک اڑا لاتے ہیں۔ اس سے مصنف کا مطلب جاپانیوں کے اُس کمال کی داد دینا ہے جو انھوں نے اپنے محکمۂ اطلاع میں دکھایا اور جس کے سامنے روسی محکمۂ اطلاع کا انتظام بالکل ناقص تھا۔ جاپانی جان پر کھیل کر ہر طرح کی خبریں لے آتے تھے اور روسی اول تو اُس طرح آنے کی جرأت ہی نہ کرتے تھے اور اگر کرتے تھے تو منہ کی کھاتے تھے اور اپنے بھدے پن سے پکڑے جاتے تھے۔ دوسرا پردہ اوکیو کو اپنے کیمپ میں دیکھتا ہے اور تیسرے میں اس کی محبوبۂ دلنواز ایمی، جو ایک امیر کبیر کی بیٹی ہے، اپنی سہیلی سے ہم کلام ہے۔ اسی موقع پر انھیں اوکیو کا خط ملتا ہے جس میں فتح یاموکی خوشخبری مندرج ہوتی ہے۔ اور اس باب کا آخری پردہ اُن خیالات کا اظہار ہے جو قسطنطنیہ میں سلطان المعظم کے ہاں روس کی پے در پے شکستوں اور جاپان کی فتوحات کو دیکھ کر پیدا ہوئے ہوں گے۔ چوتھا باب ہمیں روزولسکی کا وہ بدقسمت بیڑا دکھاتا ہے جو نہایت شد و مد کے ساتھ بالٹک سے روانہ ہوا تھا اور جس سے یہ توقع تھی کہ جاتے ہی جاپانی جہازوں کے دھوئیں اُڑا دے گا۔ یہی وہ امیر البحر تھا جس نے چھوٹتے ہی چند انگریزی ماہی گیروں پر تو بزدلانہ ہاتھ صاف کیا لیکن آگے چل کر فرانسیسی

زندگیوں میں طرح طرح کے بہانوں سے پناہ ڈھونڈھنے لگا اور ٹوگو کے مقابلے سے جان چراتا رہا ۔ اور آخر جب اس کے سامنے آیا تو اس کا بیڑا بلبلے کی طرح بیٹھ گیا ۔ مصنف اس سین میں غریب ماہی گیروں پر جو ظلم ہوا وہ ناظرین کو دکھاتا ہے ۔ لیکن توجہ اس تصویر غم سے گھبرا کر دوسرے سین کی طرف بھاگتی ہے جہاں پاکباز اینی ، جس کے دل میں ملک کی محبت اوکیو سے بڑھ کر اور اوکیو کی اُلفت ملک سے بڑھ کر ہاری ہاری موج زن ہے ، سمندر کے کنارے بیٹھی سمندر کی لہروں سے باتیں کر رہی ہے اور کہتی ہے :

اے دریا کی مصفّا لہرو
اُٹھو ، اُبھرو ، اُترو ، ٹھہرو
ختم سفر ہوتا ہے تمہارا
آ پہنچا دریا کا کنارا
محنت لگ گئی ساری ٹھکانے
مشکل کی آسان خدا نے
مضطرب و بیتاب ہو پھر کیوں
رنگ رخ سیماب ہو پھر کیوں
ساحل کا ٹھکرانا کیسا
ساتھی پھر پل لانا کیسا

یہ باب آخری ہے اور اس میں پچھلے بابوں سے بہت زیادہ سین ہیں ۔ قصے کا انجام تو وہی ہے جو دنیا بھر کو معلوم ہے ۔ متواتر فتوحات جاپان کے بعد امریکا کے توسط سے روس اور جاپان میں صلح ہو جاتی ہے ۔ شخصی معاملات میں سب سے بڑھ کر قابل ذکر

بات یہ ہے کہ اوکیو کامیابی کے ساتھ گھر لوٹتا ہے ۔ ابی کا باپ اُسے فرزندی میں قبول کر لیتا ہے اور دونوں کی شادی دھوم دھام سے رچتی ہے ۔ ان مطالب کے بیان کے لیے چار پانچ سین کافی ہوتے مگر مصنف نے اس باب کو بارہ سین تک پہنچایا ہے اور وہ اس طرح کہ تمام دنیا کے مشہور دارالخلافوں میں جو رائیں اس واقعے پر دی جا سکتی تھیں اُن کا خلاصہ کیا ہے ۔ کہیں کابل کا دربار ہے کہیں لنڈن کا ، کہیں قیصر ولیم جاپانی فتوحات پر رائے زنی کر رہے ہیں اور کہیں امریکہ کے پریسیڈنٹ روزولٹ ۔ یہ سب لوگ باتیں تو کام کی کرتے ہیں اور ایک پولیٹکل ڈرامے میں ایسے مکالمے ، جو ان فصلوں میں درج ہیں ، جائز بھی سمجھے جانے چاہئیں ، تاہم یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان کے اضافے سے کسی قدر غیر ضروری طوالت پیدا ہوگئی ہے جس کا اثر قصے کی دلچسپی پر اچھا نہیں پڑتا ۔

ہم نے اس قصے کا مختصر سا خاکہ کھینچ دیا ہے مگر پھر بھی کئی عمدہ سین رہ گئے ہیں جن کا ذکر نہیں ہو سکا اور مناسب بھی یہی تھا ، کیونکہ ہم یہ نہیں چاہتے کہ پورا خلاصہ دے کر لوگوں کو اصل سے مستغنی کردیں ۔ ہم چاہتے ہیں کہ اردو خوانوں کی کثیر جماعت کے بیشتر افراد اصل کتاب سے مستفید ہوں اور اس لیے ہمارا یہ خیال ہے کہ اگر اس کو علیحدہ کتاب کی صورت میں چھاپ کر عام طور پر ملک میں پھیلایا جائے تو بہت مفید ہو ۔ اور جب تک ایسا نہیں ہوتا شائقین ''دکن ریویو'' کا پرچہ بابت ستمبر و اکتوبر و نومبر و دسمبر ۱۹۰۵ء ایڈیٹر صاحب سے منگوا کر پڑھیں اور مصنف کی محنت اور حب وطن کی داد دیں ۔ یہاں تک تو تھا اس تصنیف کا خلاصہ اور اُس کی خوبیوں کا اعتراف مگر ابھی تنقید کا

دوسرا پہلو باقی ہے کہ جو کمی اس میں رہ گئی ہو اس کا اظہار بھی خوبیوں کے ساتھ ساتھ کیا جائے تا کہ قابل مصنف دوسری اشاعت کے موقع پر ، جس کی اُمید قوی ہے کہ ضرورت پڑے گی ، یا آئندہ اسی قسم کی تصنیف کے وقت ، اس کمی کی تلافی کر سکے ۔

سب سے بڑھ کر جو شکایت اس دلچسپ کتاب سے ہمیں ہے وہ یہ ہے کہ اسے ڈراما کہا گیا ہے مگر اصلی معنوں میں ڈراما بنانے کی پوری کوشش نہیں کی گئی ۔ اس میں شک نہیں کہ انگریزی میں کئی ڈرامے ایسے ہیں جو کبھی فی الواقعہ تماشے کے طور پر ایکٹ نہیں کیے گئے ، صرف کتب خانوں کی زینت رہے ہیں اور کمرے میں بیٹھ کر پڑھنے کے کام آئے ہیں ، اگر ہمارے دوست کا بھی اس ڈرامے سے اتنا مدعا ہے تو خیر انھیں اس ارادے میں کامیابی ہے لیکن اگر ڈرامے سے مراد ہے ایسی تصنیف جو سٹیج کے لیے موزوں ہو اور جسے اگر کوئی ہوشیار ناٹکہ والے تماشے کے طور پر دکھالیں تو ہزارہا لوگ اسے دیکھنے کے لیے کھنچے آویں ، تو اس میں بہت کچھ تغیر و تبدل کی ضرورت اور ترقی کی گنجائش ہے ۔ مولوی ظفر علی خاں صاحب نے، جو نظم و نثر دونوں میں مہارت اور مشق رکھتے ہیں ، اپنی اس دوہری قوت سے کام لیا ہے اور اکثر مکالمے نظم کر ڈالے ہیں ، اور اس نظم کے حق میں یہ کہنا انصاف ہے کہ اکثر ناٹک کے تماشوں میں جو نظم پیش کی جاتی ہے وہ اس کے مقابل میں نظم کہلانے کی مستحق نہیں ہوتی ۔ اس ڈرامے میں اکثر اشعار اچھے پائے گئے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان غزلوں میں سے اکثر سٹیج کی گوں کی نہیں ، وہاں نہ بڑے بڑے لفظوں کی گنجائش ہے نہ مشکل مشکل بندشوں کی ۔ اور اگر اشعار اس غرض سے

درج کیے گئے ہیں کہ جن کی طرف سے وہ لکھے گئے ہیں، وہ انھیں گائیں تو اتنی لمبی غزلیں گاتے گاتے آن کے گلے بیٹھ جائیں گے۔

چند مثالیں مندرجہ بالا اعتراض کی توضیح کو کافی ہوں گی۔ اس مراسلے کو لیجیے جو باب اول کے تیسرے سین میں روس کا وزیر صیغۂ خارجیہ زار کو پڑھ کے سناتا ہے۔ اس کے اٹھارہ شعر ہیں اور یوں شروع ہوتا ہے:

اے شہنشاہ فلک پایہ و خورشید رکاب
اے جہاں دار ملک سایہ و ناہید جناب
جس کی شان اور جلالت کے مقابل میں ہوئی
شوکت صدر نشینان زمن نقش برآب
غیرت ابر گہر بیز ترا لطف و کرم
صورت برق شرر ریز ترا قہر و عتاب

یا ساتویں سین میں اس نظم کو دیکھیے جو اوکیو، مکاڈو سے خطاب کر کے پڑھتا ہے:

اے شہنشاہ فلک درگہ و خورشید نشاں
رونق بزم جہاں فخر سلاطین زماں
مرکز دائرۂ دولت و اقبال و شکوہ
مصدر قاعدۂ مکرمت و شوکت و شاں
منتہائے نظر دانش و تدبیر و خرد
مبتدائے خبر عافیت و امن و اماں

یا جہاں بز مجسٹی سراج الملت والدین امیر کابل کے دربار میں صدر اعظم یوں افتتاح کلام کرتے ہیں:

چھکنے لگے شاخساروں میں بلبل
چٹکنے لگے غنچے ، کھلنے لگے گل
زمانہ ہوا محو جشن بہاراں
پیالہ ہوا لالہ ، شبنم بنی مُل
چمن میں ہیں انبار نسرین و گل کے
مزا دے رہی ہے بہار تقابل
پکارے یہ کہتی ہیں سنبل کی زلفیں
غلط ہے کہ باطل ہے دور و تسلسل
نواریز ہیں نغمہ سنجان گلشن
دکھاتے ہیں شان کمال تغزل
ہیں صرف دعا گوئی خان اعظم
ہیں وقف ثنا خوانیٔ شاہ کابل
امیر فلک قدر ، فخر اماثل
مہین کنز اکرام و گنج تفضل

یہ تینوں ٹکڑے نظم کے، جو مثال کے طور پر لیے گئے ہیں، قصیدے کے رنگ میں لکھے ہوئے ہیں اور یہ وہ رنگ ہے جس کے لیے ہمارے دوست ظفر علی خان صاحب کی طبیعت خصوصیت سے موزوں واقع ہوئی ہے ۔ اگر انھوں نے کوئی قصیدہ لکھا ہوتا اور اس میں یہ اشعار آتے تو ہم ان شعروں کی دل کھول کر داد دیتے مگر اس ڈرامے کے مکالموں میں یہ برمحل نہیں معلوم ہوتے ۔ ڈرامے کے مکالموں کے لیے سب سے ضروری چیز ہے آن کا نیچرل ہونا اور وہی ان اشعار میں موجود نہیں ۔ اول تو یہی بہت موزوں نہیں کہ نائب السلطنتہ کے مراسلات منظوم ہوں اور صدر اعظم سیاسیات کی گفتگو چھیڑتے

کے لیے قصیدہ کہنے لگیں اور پھر قصیدہ بھی کیسا جو فوراً ممدوح کی ثنا سے شروع ہونے کی بجائے ایک لمبی تشبیب سے شروع ہو، جیسا کہ آخری نمونے سے ظاہر ہے۔ یہ گل و مُل، یہ سنبل کی زلفیں، یہ تغزل، یہ تشبیب سب ایک پولیٹکل ڈرامے میں کیوں کر کھپ سکتے ہیں۔ جو مثالیں اوپر بیان ہوئیں اُن سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ اس ڈرامے میں حصہٴ نظم سب اسی طرح کا ہے۔ نہیں بعض مقامات میں طباع مصنف نے سادہ اور پُرزور اشعار لکھنے میں کمال دکھایا ہے اور وہ اشعار ایسے ہیں کہ اگر یہ ڈرامہ اسٹیج پر دکھایا جائے تو نہایت مؤثر ثابت ہوں۔ ایسے اشعار کا ایک نمونہ آپ ابھی کی زبان سے سن چکے ہیں۔ ایک دوسرا نمونہ اوکیو سے سن لیجیے جو اُس سے رخصت ہوتے وقت یوں سخن سرا ہوتا ہے:

تیری آنکھیں ہیں مجھے مست بنانے والی
بادۂ ناب کے دو گھونٹ پلانے والی
اس محبت کا برا ہو کہ یہ وہ آتش ہے
جو مرے ساتھ تمہیں بھی ہے جلانے والی
شکوہ بے سود ہے آنا تھا طبیعت کو ضرور
کہ بلا ٹل نہیں سکتی کبھی آنے والی
کیا عجب ہے کہ محبت تری ثابت ہوجائے
مری تقدیر کے لکھے کو مٹانے والی
کیا عجب ہے کہ یہی جنگ بنے آخر میں
تجھ کو مجھ سے تو مجھے تجھ سے ملانے والی

یہ وہ اشعار ہیں جو اسٹیج پر کسی خوش گلو اور ماہر فن ایکٹر کی زبان سے نکل کر سینکڑوں دلوں کو بیتاب کر دیں اور جو کہنے

جانے کے لیے بنے ہوئے معلوم ہوتے ہیں ۔ مکاڈو کے وہ اشعار جن میں وہ ایشیا کے مستقبل کا بیان کرتا ہے اور جاپان کے فرائض اس مقصد کے حصول کے متعلق ظاہر کرتا ہے، ہمیں خاص کر پسند ہیں اور پولیٹکل پہلو سے اہل ہند میں ایک نئی روح پھونکنے کے لیے اس ڈرامے کے بہترین اشعار میں سے ہیں :

ہے بننا ہمیں رہ نما ایشیا کا
جلانا ہے ہم کو دیا ایشیا کا
وہ تہذیب جو ہوگئی ہے پرانی
اسے کسے وہ بادۂ ارغوانی (؟)

———

وہی آگ اگلی ہی جس میں بھری ہے
وہی مے ہے، بوتل مگر دوسری ہے
بھریں گے ہم اس کو نئی ساتگیں میں
پلائیں گے بھر بھر کے جاپان و چیں میں
اسے پی کے جو مست و آزاد ہوں گے
وہ حکمت میں یورپ کے اُستاد ہوں گے

باوجودیکہ یہ اشعار جوش سے بھرے ہوئے ہیں اور تاثیر میں نظم عموماً نثر سے بڑھ کر ہوتی ہے مگر نثر کے بعض سیدھے سادے جملوں میں بھی کبھی کبھی غضب کا جادو ہوتا ہے ۔ چنانچہ ایسے چند جملے اس کتاب میں آئے ہیں ۔ مثلاً جہاں اوکیو اپنی ماں کے گزر جانے کے بعد تنہائی میں اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہے :

”دنیائے ناپائیدار میں میں اکیلا رہ گیا ۔ خویش و اقربا اور اعزہ و احباب پیوند زندگانی ہوا کرتے ہیں ۔ میرا نہ کوئی قریبی

رشتہ دار ہے ، نہ کوئی دلی دوست ۔ اب جینے میں کیا لطف رہا ۔ میرے گھر کی مرادوں اور خوشیوں کی کل کائنات ایک میری بیوہ ماں تھی ۔ اُس کا جو حشر ہوا وہ ملک میں آشکار ہے ۔ وہ مجھے بتا گئی ہے کہ مجھے اس دنیا میں رہ کر کیا کرنا چاہیے ۔ وہ میرے مقدر کا پروگرام اپنے خون سے تیار کرتی گئی ہے ۔''

جہاں مصنف کے قلم سے ایسے پُرزور جملے نکل گئے ہیں ، جن پر وہ ناز کر سکتا ہے ، وہیں ایک آدھ جگہ نہایت رکیک عبارت لکھی گئی ہے جو باقی کتاب کی شان کے خلاف ہے ، مثلاً دوسرے باب کے چوتھے سین میں ، جہاں ایک تمسخر آمیز مخمس لکھی گئی ہے اس میں دوسرا بند ایسا ہے جو کسی اعتبار سے جائز نہیں رکھا جا سکتا ہے اور خصوصاً اس بند کو نکال ڈالیں ۔

ایک اور ضروری امر جتلانے کے قابل ہے اور وہ یہ کہ گو اس کتاب کا مقصد ہندوستان میں حب وطن کی گرم جوشی پیدا کرنا ہے لیکن ہندوستان ہی میں اس کا کوئی سین نہیں رکھا گیا ۔ ہندوستان سے اس کا کچھ تعلق پیدا کرنے کے لیے اتنا کیا گیا ہے کہ دو قابل ہندوستانی یعنی اقبال خاں اور مظفر خان رزم گاہ سے متعلق کر دیے گئے ہیں جو وہاں اپنے ملک کی حالت پر گفتگو کرتے ہیں ۔ مگر ہمارے خیال میں یہ کافی نہیں ۔ چاہیے تھا کہ جیسے باقی دنیا پر اس عالیشان معرکے کا اثر دکھایا گیا ہے اُسی طرح یہ بھی دکھایا جاتا کہ ہندوستان میں اس کے بعد کیا خیالات اور تحریکیں پیدا ہوئیں ، اور اُس جوش سے جو اہل ہند کے دلوں میں جاپانیوں کی کامیابی دیکھ

کر پیدا ہوا ، پائیداری کی کہاں تک اُمید ہے۔ ان قابلِ تلافی امور سے قطع نظر کر کے بہ حیثیتِ مجموعی مولوی ظفر علی خاں صاحب کی یہ تصنیف نہایت قدر کے قابل ہے اور ہم اُمید کرتے ہیں کہ ملک اُن کی حوصلہ افزائی کرنے میں کوتاہی نہیں کرے گا۔

* * *

مغرب کا اثر ادبِ اردو پر[1]

(حال ہی میں ایک انگریزی کتاب "موڈرن انڈیا اینڈ دی ویسٹ" کے نام سے آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے شائع کی ہے جس میں جدید ہندوستان کے متعلق جغرافیائی، تاریخی، اجتماعی، اقتصادی اور تعلیمی موضوعات پر مختلف اصحاب نے مختلف ابواب لکھے ہیں۔

ان میں "ادبیات" کے باب میں شعبۂ اردو پر جو مضمون ہے وہ ہمارے مخدوم و مکرم جناب شیخ سر عبدالقادر مدظلہ' کے قلم کا مرہونِ منّت ہے۔ موصوف نے ہمیں اس کا ترجمہ اورینٹل کالج میگزین میں شائع کرنے کی اجازت دے کر میری جو حوصلہ افزائی فرمائی ہے اس کے لیے ہم ان کے تہ دل سے ممنون ہیں۔

یہ ترجمہ ہماری درخواست پر ڈاکٹر سید عبداللہ لیکچرار اردو پنجاب یونیورسٹی نے کیا ہے جس کے لیے وہ ہمارے دلی شکریے کے مستحق ہیں — اڈیٹر)

اردو ہندوستان کی ملکی زبانوں میں سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ یہ شمالی ہندوستان کے بیشتر علاقوں اور جنوب کے بعض خطوں میں (جن میں حیدر آباد دکن بھی شامل ہے) بولی جاتی ہے۔ اور ملک کے باقی حصوں میں عموماً لیکن بڑے بڑے

۱۔ اورینٹل کالج میگزین، فروری ۱۹۴۳ء، جلد ۱۹، عدد ۲، عدد مسلسل ۷۲، صفحہ ۵۳ — ۷۲۔

شہروں میں خاص طور پر سمجھی جاتی ہے ، لہٰذا اردو ادب کا دائرۂ مقبولیت بہت وسیع ہے اور جوں جوں ادبیات اردو میں مختلف علوم و فنون کا ذخیرہ فراہم ہوتا جاتا ہے توں توں اس کا حلقہ اثر بھی وسیع سے وسیع تر ہوتا جاتا ہے -

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ زبان اردو نے شاہجہان کے اردوی معلیٰ میں جنم لیا لیکن یہ خیال صحیح نہیں - گو ہم یہ تسلیم کر سکتے ہیں کہ اس کی وجہِ تسمیہ میں اردو یا ''شاہی لشکرگاہ،، کا تصور ضرور موجود ہے -[۱]

اردو کی پیدائش کے متعلق بہت سے نظریے ہیں -[۲] ان میں سے کون سا نظریہ آخری ، قطعی اور مسلّم قرار پائے گا ، میں اس سے قطع نظر کرتے ہوئے سر دست تاریخِ ادبِ اردو کے مصنف مسٹر رام بابو سکسینہ کے خیال سے اتفاق کرتا ہوں - مصنف مذکور کا بیان ہے کہ :

''اردو اپنی اصل کے اعتبار سے مغربی ہندی کی ایک شاخ ہے - یہ وہ بولی ہے جو صدیوں سے دہلی اور میرٹھ کے مضافات میں بولی جاتی تھی - یہ بلاواسطہ سوراسینی پراکرت سے نکلی ہے اور بعد میں اردو کے نام سے موسوم ہوئی - غرض اردو کی بنیاد اسی پراکرت پر رکھی گئی ہے جس کی

---

۱ - اردو ایک ترکی لفظ ہے جس کے معنی لشکرگاہ کے ہیں -

۲ - ایک نظریہ یہ ہے کہ دہلی میں پہنچنے سے پہلے زبان اردو نے دکن میں ترقی حاصل کی - دوسرا نظریہ پروفیسر محمود شیرانی (اورینٹل کالج لاہور) کا ہے کہ زبانِ اردو پنجاب میں پیدا ہوکر دہلی پہنچی -

بنیادی خصوصیات ، قواعد ، محاورات اور بے شمار ہندی الفاظ
اب بھی اس کی اصل کا پتہ دیتے ہیں ۔''

فارسی مسلمان سلاطین کے ساتھ ہندوستان میں آئی ۔ علی الخصوص شاہان مغلیہ نے اس کی بڑی سرپرستی کی ۔ اس کو ہندی کے ساتھ پیوند دینے سے ایک عجیب و غریب لسانی آمیزہ تیار ہوا اور جب ہندوستان کا مغربی اقوام سے اختلاط ہوا تو اردو پر مغرب کے افکار و ادبیات کا خوشگوار اثر پڑا ۔ یہی وجہ ہے کہ ادب اردو آج نہایت لطیف اور عمدہ عناصر کا مجموعہ ہے ۔ ہندوستان کے ساتھ مغربی اقوام کے تعلقات کی ابتدا پرتگیزوں سے ہوئی ۔ ان کے بعد فرانسیسی آئے ۔ چنانچہ ان دونوں کی زبانوں کے بے شمار الفاظ ، جو آج عام طور پر استعمال ہو رہے ہیں ، اسی دور کی یادگار ہیں ۔ مثلاً الماری ، میز ، پستول ، لیلام وغیرہ وغیرہ ۔ اسی طرح بہت سے فرنچ الفاظ مثلاً چانڈ ماری (Champ de Mars) ، اپڈی کانگ (Aide-de-Camp) ، قمیض (Chemise)، صابون (Savon) اور بوتام (Bouton) آج ہماری زبان کا جزو بن کر عہد قدیم میں فرانسیسیوں کے ساتھ ہمارے تعلقات کی یاد تازہ کر رہے ہیں ۔

ان کے بعد انگریز آئے ۔ ان کے دور میں ہندوستان اور مغرب کے درمیان جو اختلاط اور تعلق ظہور میں آیا وہ فرنچ اور پرتگیزی اثر کی نسبت بدرجہا زیادہ گہرا اور دیرپا ثابت ہوا ۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اردو میں انگریزی کے سینکڑوں الفاظ مل جل گئے ہیں ۔ ان الفاظ کی صحیح تعداد تو متعین نہیں کی جا سکتی لیکن بعض حضرات نے اردو میں انگریزی عنصر کا اندازہ لگانے کی کوشش کی ہے ۔ مثلاً مرحوم پروفیسر وحیدالدین سلیم نے اپنے ایک مضمون میں

لکھا ہے کہ "فرہنگ آصفیہ" میں کم و بیش انگریزی کے پانچ سو الفاظ موجود ہیں ۔ لیکن "فرہنگ آصفیہ" ایک پرانی کتاب ہے اور پروفیسر وحید الدین سلیم کے مذکورہ بالا مضمون سے تیس سال قبل مرتب ہو چکی تھی ۔ اس کی تالیف کے بعد انگریزی کے بہت سے نئے الفاظ ذخیرۂ اردو میں شامل ہوئے ہیں (اس لیے میرے خیال میں پروفیسر سلیم کا اندازہ قرین صحت نہیں) اس معاملے میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کی مرتبہ New Urdu Dictionary شاید بہتر رہنمائی کر سکے ۔ میرے اپنے اندازے کے مطابق ان مورد الفاظ کی تعداد ایک ہزار سے کم نہ ہوگی ۔ ان میں سے بہت سے الفاظ ہماری معمولی ضروریات زندگی سے متعلق ہیں ۔ مثلاً سکول ، کمپنی ، ڈاکٹر ، ریل ، ٹکٹ وغیرہ وغیرہ ۔ بعض الفاظ ایسے ہیں جو سائنس کی جدید ایجادات سے متعلق ہیں جن کے لیے ہماری زبان کے اصلی ذخیرے میں سرے سے الفاظ موجود ہی نہ تھے ۔ بعض اوقات ان کی جگہ ترجمے کے ذریعے (خالص اردو ، عربی یا فارسی) الفاظ گھڑنے کی کوشش کی جاتی ہے ، لیکن ایسی کوششیں اکثر ناکام ہی ثابت ہوتی ہیں ، اور ایسے نو تراشیدہ الفاظ قبول عام نہیں پا سکتے ۔ ان مورد اور دخیل الفاظ کی فہرست میں وہ الفاظ بھی شامل ہیں جن کا تعلق سیاسی نظاموں یا شہری اداروں سے ہے ، مثلاً کونسل ، پارلیمنٹ ، پریزیڈنٹ ، ووٹ ، بیلٹ وغیرہ ۔ یہ الفاظ ہندوستانی رسائل و اخبارات میں ، نیز مقرروں کی تقریروں میں بڑی کثرت کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں ۔

انگریزی کا اثر صرف ذخیرۂ الفاظ کی توسیع سے ہی ظاہر نہیں ہوتا بلکہ اظہار خیال کے اسالیب اور پیرایہ ہائے بیان میں بھی خاص طور پر

نمایاں ہے۔ یہ شاید انگریزی اثر ہی کا نتیجہ ہے کہ ہم اردو میں زاویۂ نظر، نقطۂ نگاہ، طریق بحث و استدلال اور اسی طرح کی بے شمار نئی ترکیبوں کو دیکھتے ہیں۔ اس طرح کی تراکیب بیشتر انگریزی کے ترجمے ہوتے ہیں جن سے پیرایہ ہائے بیان میں بڑی وسعت پیدا ہوگئی ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس قسم کے ترجموں میں بڑی احتیاط کرنی چاہیے کیونکہ اردو میں انگریزی الفاظ و تراکیب کا ترجمے کے ذریعے اندھا دھند استعمال بعض اوقات سلاست اور لطافت بیان کے منافی ہوتا ہے۔

میں نے ادو میں انگریزی الفاظ کے داخل ہونے کے ذکر کو اس لیے مقدم رکھا ہے کہ اردو پر انگریزی اثرات کے ظہور کی پہلی شکل یہی ہے۔ لیکن درحقیقت اس سے بہت زیادہ قوی اور لائق توجہ اثر وہ ہے جو اردو نثر اور اس کے مختلف اسالیب اردو کی شاعری اور ڈرامے پر پڑا جس کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے۔

بیسویں صدی سے قبل اردو میں کوئی خاص نثری سرمایہ موجود نہ تھا۔ نثر کی ابتدائی کتابیں یا تو مذہبی مضامین سے متعلق تھیں یا مذہبی قصے کہانیوں پر مشتمل تھیں۔ انیسویں صدی کے اواسط میں "فسانۂ عجائب"، "باغ و بہار"، "داستان امیر حمزہ"، اور "طلسم ہوشربا" اور "بوستان خیال" شائع ہوئیں۔ پہلی دو کتابیں ایک عرصے تک آن انگریز افسروں کے نصاب تعلیم میں شامل رہیں جو زبان اردو کی تحصیل کے متمنی تھے۔ باقی تین طویل و ضخیم قصے ہیں جو محض تفریح اور تفنن طبع کے لیے لکھے گئے تھے۔ ان میں خیالی کارنامے بیان ہوئے ہیں آن بہادروں کے جو دیوں اور جنوں کو شکست دیتے تھے۔ جنوں اور پریوں کے قلعوں کو مسخر

کرتے تھے اور سحر و طلسم اور نیرنجات کے بڑے بڑے حصاروں کو سر کر سکتے تھے - اس میں شک نہیں کہ جدید معیار کے مطابق ان کتابوں کے طرز بیان میں تصنع اور طمطراق کے سوا کچھ نہیں - تاہم سچ یہ ہے کہ جس زمانے میں یہ کتابیں لکھی گئی تھیں اس کا لحاظ کرتے ہوئے یہ تصانیف ہمیں اچھا خاصا کارنامہ معلوم ہوتی ہیں - یہ عجیب اتفاق ہے کہ اردو نثر کو ترقی اور فروغ دینے کا خیال سب سے پہلے بلدۂ کلکتہ میں پیدا ہوا - تعجب اس لیے ہے کہ یہ شہر اردو کے دو اہم مراکز یعنی دہلی اور لکھنؤ سے خاصا دور ہے - یہاں ڈاکٹر جان گلکرائسٹ نے جو فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے پرنسپل[1] تھے ، اردو کی ترقی کا کام شروع کیا - یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ انھیں "بابائے نثر اردو" کہہ کر پکارتے ہیں - موصوف اس پُرافتخار لقب کے مستحق ہوں یا نہ ہوں ، اس قدر ضرور صحیح ہے کہ انھوں نے زبان اردو کی اہمیت اور اس کی روشن تقدیر کا پہلے سے ہی اندازہ لگایا اور اس کی ترقی کے لیے وسائل پیدا کیے - انھوں نے ایک اردو لغت تیار کیا - اس کے علاوہ انگریز طلبہ کے فائدے کے لیے ایک ہندوستانی گرامر بھی مرتب کی - ان ہی کے مقناطیسی اثر سے دہلی اور شمال مغربی صوبوں (یعنی صوبجات اودھ وغیرہ) سے علماء و فضلاء بڑی تعداد میں کھنچے ہوئے کلکتہ پہنچے جن کے اجتماع سے کلکتہ میں اردو کا ایک نیا مرکز قائم ہو گیا - ان علماء و ادبا میں میر امن دہلوی بھی تھے - انھوں نے "باغ و بہار" لکھی جو دراصل امیر خسرو دہلوی کی "چہار درویش" کا ترجمہ ہے - فورٹ ولیم کالج میں گلکرائسٹ اور ان کے جانشینوں کے زیر سایہ

١ - پرنسپل نہیں پروفیسر تھے -

ہندو مسلم فضلا و ادبا نے فارسی اور دوسری زبانوں سے عمدہ ترجمے کیے جس سے نثر اردو کا معقول ذخیرہ پیدا ہوگیا ۔ مگر ان سب کوششوں کے باوجود ، یہ کہنا پڑتا ہے کہ معیاری اردو نثر کے سلسلے میں بعد میں جو کچھ ہوا اس کے لحاظ سے فورٹ ولیم کا دور نثر اردو کا ابتدائی اور تعمیری زمانہ تھا ۔

جدید معیاری نثر اردو کی ابتدا مرزا غالب سے ہوتی ہے مگر اس کی تکمیل ایک طرف تو سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء مثلاً نذیر احمد ، حالی ، شبلی وغیرہ کے ہاتھوں سے ہوئی (یہ حضرات ادبستان دہلی سے متعلق ہیں) اور دوسری طرف دبستان لکھنؤ کے دو ممتاز ادیبوں یعنی پنڈت رتن ناتھ سرشار اور مولانا عبدالحلیم شرر کی کوششوں سے ۔ سچ یہ ہے کہ مرزا غالب پہلے شخص تھے جنھوں نے نثر اردو کے محاسن اور اس کی دلکشی کا صحیح اندازہ کیا ۔ جیسا کہ اس زمانے کی شائستہ سوسائٹی کا قاعدہ تھا ، مرزا غالب بڑی مدت تک فارسی میں خط و کتابت کرتے رہے ۔ لیکن انیسویں صدی کے وسط میں انھوں نے اردو میں مراسلت اختیار کر لی اور مکاتیب میں مکالمے کا رنگ پیدا کیا ۔ خوش قسمتی سے ان کے یہ قابل قدر خطوط آج بھی محفوظ ہیں اور ''اردوئے معلی'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں[1] ۔ بے نظیر اسلوب بیان کے اعتبار سے ، نیز اس لحاظ سے کہ ان سے مصنف کی سیرت اور نفسیات کے گہرے اسرار پر مفید روشنی پڑتی ہے ، یہ خطوط بڑی وقعت اور قدر کے لائق ہیں ۔

---

۱ ۔ دوسرے مجموعے کا نام ''عود ہندی'' ہے ۔ ایک اور مجموعہ رام پور سے ''مکاتیب غالب'' کے نام سے شائع ہوا ہے (مترجم) ۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مرزا غالب کی نثر مغربی اثرات کی شرمندۂ احسان نہیں ۔ لیکن ان کے بعد آنے والے نثرنگاروں پر یہ بات صادق نہیں آتی ۔ مثلاً سید احمد خاں کا رابطہ و تعلق انگریزوں کے ساتھ بہت گہرا اور استوار تھا ۔ مسلمانوں میں ترقی تعلیم کی مہم شروع کرنے سے پہلے وہ حکومت انگریزی کے عہدہ دار تھے ۔ جب انھوں نے علی گڑھ کالج (جو اب یونیورسٹی کے درجے تک پہنچ چکا ہے) کی بنیاد رکھی تو اس کے لیے انھوں نے بہت سے ممتاز انگریزوں کی خدمات حاصل کیں، مثلاً مسٹر بیک، سرتھیوڈور ماریسن اور سر ٹامس آرنلڈ۔

ان لوگوں کے خیالات و تصورات سے سید صاحب بہت متاثر ہوئے۔ اگرچہ ایک لحاظ سے یہ کہنا بھی غلط نہیں کہ یہ انگریز صاحبان بھی سید صاحب کی عظمت اور شخصیت سے کچھ کم متاثر نہیں ہوئے ۔ یہ شاید انھی اثرات کا نتیجہ ہے کہ سید صاحب کی تحریر سلاست ، صفائی اور سادگی کے اوصاف کی حامل اور مبالغہ اور عبارت آرائی کے تکلفات سے خالی نظر آتی ہے ۔ ان کے نزدیک معقول پیرایۂ بیان اور مو ... ع کی جزالت ، بیکار بلاغت اور بدیع و معانی کی فضول آرائشوں سے کہیں زیادہ تاثیر اور اثر پیدا کر سکتی ہے ۔

رسالہ "تہذیب الاخلاق" میں سید صاحب اور ان کے رفقا کے بلند پایہ مضامین شائع ہوتے رہے جن کا ان کے معاصرین کے قلب و دماغ پر بڑا اثر پڑا ۔ اس ادبی اور علمی کام میں سید صاحب کا ہاتھ بٹانے والے لوگ بہت سے تھے جن میں نواب محسن‌الملک مرحوم کا نام خاص امتیاز رکھتا ہے ۔ نواب صاحب نہایت فصیح البیان اور خوش کلام مقرر بھی تھے ۔ ان کی تقریریں سن کر یہ ثابت ہوتا تھا

کہ اردو زبان میں خطیبانہ جوہر کے اظہار کی کس قدر گنجائش موجود ہے ، اور اگر مقرر زبان پر قدرت رکھتا ہو اور فن میں مہارت ہو تو اردو زبان اس بارۂ خاص میں بھی دنیا کی بلند پایہ زبانوں کا مقابلہ کر سکتی ہے - نواب محسن الملک مرحوم اگرچہ انگریزی نہ جانتے تھے لیکن آخری عمر میں انھوں نے اس حد تک شد بد پیدا کر لی تھی کہ اخبار کو سن کر اس کا مطلب سمجھ سکتے تھے -

رفقائے سرسید میں مولوی الطاف حسین حالی کا نام خاص طور پر ذکر کے لائق ہے - حالی مرزا غالب کے شاگرد تھے اور اگرچہ آپ کی شہرت کی بنیاد زیادہ تر ان کی شاعری پر ہے ، پھر بھی آپ مؤثر اور سادہ نثر نگری کے لحاظ سے نثر نگاران اردو میں نہایت بلند مقام رکھتے ہیں - ان کے دیوان کا مقدمہ ادبی تنقید اور اردو شعر و شاعری کی اصلاح کے اصولوں پر مشتمل ہے جس سے کچھ کچھ اس امر کا سراغ ملتا ہے کہ مولانا حالی نے مقدمہ لکھنے سے پہلے میتھیو آرنلڈ کی Essays on Criticism کا مطالعہ ضرور کیا ہوگا - "حیات جاوید" اور "یادگار غالب" بھی مولانا حالی کی تصانیف ہیں - ان سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا حالی کو انگریزی زبان سے واقفیت نہ ہونے کے باوجود مغربی ادب کے اصول سے روشناسی ضرور تھی - شبلی بھی سرسید احمد خان کے ساتھیوں میں سے تھے - وہ بھی بہت حد تک سید صاحب ہی کی تحریک اور ترغیب سے ادب کے میدان میں آئے - شبلی علی گڑھ کالج میں پروفیسر تھے - یہاں سرطامس آرنلڈ سے ان کی ملاقات ہوئی (جن کے روابط و تعلقات کا اثر ان کی ادبی زندگی میں بڑا نمایاں نظر آتا ہے) - شبلی کا محبوب اور مرغوب مضمون "فن سیرت" تھا - "سیرت النبی" ان کی بہترین تصنیف ہے جس

کی تالیف و تدوین میں انھوں نے تحقیق و تدقیق کے مغربی طریقوں اور اصولوں سے بڑا کام لیا۔ ''شعر العجم'' اردو زبان میں فارسی شاعری کی تاریخ ہے۔ ان کتابوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے تنقید و تحقیق کے مغربی نظریوں سے خاص واقفیت بہم پہنچا لی تھی۔ مگر یہ معلومات انھوں نے براہ راست حاصل نہ کی تھیں بلکہ کچھ تو مغربی کتابوں کے ترجموں کی وساطت سے اور کسی حد تک یورپین علماء و فضلا سے اختلاط کے ذریعے۔

اردو کے دوسرے مرکز (لکھنؤ) کا ذکر کرنے سے پہلے میں ''دبستان دہلی'' کے ایک اور نامور فاضل مولوی نذیر احمد خاں کی تصانیف کا تذکرہ ضروری خیال کرتا ہوں۔ مولوی نذیر احمد ایک بلند مرتبہ مصنف اور خوش بیان مقرر تھے۔ زبان اردو پر ان کو مسلمہ قدرت حاصل تھی اور ان کے کمالات میں یہ بات خاص طور پر شمار کے لائق ہے کہ انھوں نے اپنی کتابوں میں دہلی کی ٹھیٹھ بیگماتی زبان اور روزمرہ کا استعمال کیا ہے۔ مولوی صاحب انگریزی جانتے تھے اسی لیے انھوں نے انگریزی ادب سے کچھ نہ کچھ خیالات ضرور لیے ہوں گے۔ مگر اس بات پر ضرور تعجب ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی تحریر کو بقدر امکان خارجی عناصر سے پاک رکھنے کی کوشش کی۔ چنانچہ ان کی کتابوں میں انگریزی الفاظ اور جملے شاذ ہیں۔ انھوں نے اکثر کتابیں خواتین کے فائدے کی لکھیں اور اس طبقے میں بہت مقبول بھی ہوئیں۔ مگر مردوں میں بھی ان کا کچھ کم چرچا نہیں اور سبھی لوگ ان کی تصانیف کو شوق سے پڑھتے ہیں۔ ان میں ''مرآۃ العروس'' کو بہت قبول عام نصیب ہوا۔ اس کا ترجمہ انگریزی میں ہو چکا ہے جو مسٹر وارڈ (آئی۔ سی۔ ایس) کے قلم سے ہے۔

لکھنؤ کے نثر نگاروں میں رتن ناتھ سرشار اور مولوی عبدالحلیم شرر کے نام سب سے ممتاز ہیں - یہ دونوں حضرات ناول نگار تھے اور ان دونوں نے ادبیات اردو کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں - شرر اور سرشار دونوں انگریزی سے واقف تھے - ان کی تصانیف میں مغربی اثرات کے نقوش صاف صاف نظر آتے ہیں - سرشار کشمیری برہمن تھے - انھوں نے بہت سے ناول لکھے ہیں جن میں "فسانۂ آزاد" سب سے زیادہ مقبول ہوا - سرشار کی شہرت کا دار و مدار بھی بیشتر اسی طویل قصے پر ہے - یہ کتاب چار ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے - آزاد اس افسانے کا ہیرو ہے - "فسانۂ آزاد" کے سلسلے میں سرشار پر ڈکنس (Dickens) کا پرتو نظر آتا ہے - اس قصے میں ہمارا اردو ناول نگار Dickens کی طرح عوام کی زبان میں لکھنے کی کوشش کرتا ہے - وہی غلط تلفظ ، وہی نادرست محاورے ، وہی زبان و بیان کی خامیاں ، وہی بے قاعدگیاں ، وہی غلطیاں !ـــــ بڑی کامیابی کے ساتھ عامة الناس کی بول چال کو اپنی عبارتوں میں منعکس کیا ہے -

اسی طرح آزاد اور اس کے خوجی کو Don Quixoto اور Sancho Panza کے ساتھ جو مماثلت ہے وہ محتاجِ بیان نہیں - سرشار کا ایک وصفِ خاص یہ ہے کہ ان کی تحریریں بذلہ سنجی و ظرافت سے پُر ہوتی ہیں -

مولوی عبدالحلیم شرر نے قصہ نویسی میں جو راستہ اختیار کیا وہ سرشار کی شاہراہ سے مختلف ہے - انھوں نے سر والٹر سکاٹ کی مثال پر عمل کرتے ہوئے ''تاریخی ناول'' لکھے - ان کے بہترین ناولوں میں سے ایک صلیبی لڑائیوں کے زمانے سے متعلق ہے جس میں

ایک عیسائی شہزادی اور مسلم جانباز کی داستان عشق و محبت بیان کی ہے -

حکیم محمد علی طبیب لکھنوی شرر کے پیروؤں میں سے ہیں - انھوں نے بہت سے ناول شرر کی طرز پر لکھے -

مرزا محمد ہادی رسوا کرسچین کالج لکھنؤ کے پروفیسر تھے - انھوں نے بھی چند عمدہ ناول لکھے ہیں -

یہ عجیب بات ہے کہ ناول اکثر و بیشتر لکھنؤ میں لکھے گئے - اس کے برخلاف دہلی کے مصنفین نے اخلاقی قصے لکھے ہیں - نذیر احمد کے قصوں میں گرمیٔ ہنگامہ بالکل نہیں بلکہ ان کے سامنے تعلیم و تربیت کا واضح اور معین مقصد ہے - مولوی راشد الخیری نے مولوی نذیر احمد کے طرز کی پیروی کی لیکن انھوں نے غم و الم کی تصویر و تشریح کو اپنا خاص موضوع بنایا - یہی وجہ ہے کہ انھیں "مصور غم" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے - دہلی کے انشاپردازوں میں خواجہ حسن نظامی جو بفضلہ زندہ و سلامت[1] ہیں ، بڑی دلکش اور مؤثر نثر لکھتے ہیں - ان کی نثر میں مغربی رنگ خاصا ہے اور یہ دیکھ کر کہ انھوں نے جدید طرز کے کسی سکول یا کالج میں تعلیم نہیں پائی (اور سوائے اس کے کہ ترجموں کے واسطے سے یا انگریزی داں دوستوں کے ذریعے سے انگریزی خیالات سے کچھ آگاہی حاصل کر لی ہو ، انگریزی ادب سے روشناس نہ تھے) ان مغربی اثرات کی موجودگی تعجب سے خالی نہیں معلوم ہوتی -

---

۱ - یہ مضمون ۱۹۴۳ء میں لکھا گیا ، اُس وقت خواجہ صاحب زندہ تھے -

مولوی محمد حسین آزاد بھی ان مشہور مصنفین اُردو میں سے ہیں جن کی تعلیم قدیم طرز پر ہوئی لیکن ان کی تصانیف میں مغرب کے اثرات بہت روشن نظر آتے ہیں ۔ ان کا تعلق دہلی سے تھا لیکن ان کی تصنیفی زندگی کا غالب حصہ لاہور میں گزرا جہاں انھوں نے ادب اُردو کا ایک نیا دبستان قائم کیا جو اب (دہلی اور لکھنئو کی طرح) زبان اُردو کا ایک بڑا مرکز سمجھا جاتا ہے ۔ جس زمانے میں کرنل ہالرائڈ محکمۂ تعلیم پنجاب کے ڈائرکٹر تھے ، مولوی محمد حسین آزاد بھی محکمہ تعلیم کے ملازم تھے ۔ کرنل ہالرائڈ کی تشویق اور حوصلہ افزائی سے آزاد کو بہت مدد ملی ، جن کے زیر اثر آزاد نے ادب اُردو کو مغربی خیالات اور افکار سے روشناس کیا ۔ ان کی کتاب ''نیرنگ خیال'' ایک عمدہ تمثیل ہے اور ''قصص ہند،، تاریخ ہند سے متعلق کہانیوں کا دلچسپ مجموعہ ہے ۔ ایک اور کتاب ''دربار اکبری'' ہے جس میں جلال الدین اکبر کے امرائے دربار کے مرقعے کھینچے ہیں ۔ آزاد کی کتابیں جس طرز میں لکھی گئی ہیں وہ بے مثال اور بے نظیر ہے ۔ یہ طرز (بہت بڑی حد تک) مغربی ادبا اور فضلا سے میل جول کا نتیجہ ہے ۔ بایں ہمہ یہ آزاد کی خاص خوبی ہے کہ ان کی تحریریں بے حد شستہ ، رواں اور صاف ہیں اور نامناسب آمیزش سے بالکل پاک ہیں ۔ ادبیات اُردو کے ذخیرے میں انگریزی کتابوں کے ترجموں کے ذریعے اچھا خاصا اضافہ ہوا ۔ ان ترجموں میں بہت سی کتابیں افسانے وغیرہ سے متعلق ہیں ، لیکن ان کے علاوہ علمی طرز کی کتابوں کے ترجمے بھی ہوئے ۔ مترجمین میں مولوی ظفر علی خاں اور مسٹر عنایت اللہ خاں دہلوی کو بڑی

مقبولیت اور شہرت نصیب ہوئی ۔ مولوی ظفر علی خاں نے ڈریپر کی کتاب Conflict of Religion and science[۱] ، کرزن کی کتاب Persia[۲] اور کپلنگ کی کتاب The Jungle book[۳] کا ترجمہ کیا ۔ مولوی عنایت اللہ کئی سال تک حیدر آباد میں دارالترجمہ (عثمانیہ یونیورسٹی) کے صدر یا ناظم اعلیٰ کے فرائض انجام دیتے رہے ۔ بطور جملۂ معترضہ ، عثمانیہ یونیورسٹی وہ تعلیمی ادارہ ہے جہاں عرصے سے فلسفے اور سائنس اور دیگر علوم و فنون کی اعلیٰ تعلیم غیر معمولی کامیابی کے ساتھ اُردو ہی میں دی جا رہی ہے ۔

اُردو میں جن مغربی افسانہ نگاروں کے ناولوں کے ترجمے ہوئے ہیں ان میں سکاٹ ، لٹن ، ڈکنز ، رائڈر (Rider) اور ہیگرڈ (Haggard) قابل ذکر ہیں ۔ طالسطائی کے بعض قصے بھی اُردو کا لباس پہن چکے ہیں ۔ اسی طرح کچھ فرانسیسی افسانے بھی براہ راست فرنچ سے یا کسی دوسری زبان کی وساطت سے اُردو میں منتقل ہو چکے ہیں ۔ فرنچ ناولوں سے سید سجاد حیدر یلدرم سب سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں ، لیکن بلاواسطہ نہیں بلکہ ترکی ترجموں کے ذریعے ۔! سید صاحب ترکی میں کافی دستگاہ رکھتے ہیں اور اس زبان کے ادب کی خوبیوں کے دلدادہ اور معترف ہیں ۔ سید علی بلگرامی نے لیبان کی کتاب Civilisation des Arabs کا براہ راست فرنچ زبان سے

---

۱ - معرکۂ مذہب و سائنس ۔
۲ - خیابان فارس ۔
۳ - جنگل میں منگل ۔

ترجمہ کیا جس کا نام "تمدن عرب" رکھا۔ باوجود کہ اس کتاب کی قیمت زیادہ تھی ، پھر بھی اس کی توقع سے زیادہ بکری ہوئی ۔ اس کے بعد ۱۹۳۶ع میں حیدر آباد سے اس کا ایک ارزاں اڈیشن بھی شائع ہوا۔

کچھ عرصے سے یورپ کے جدید ترین تصورات اور عقائد سے متعلق کتابوں مثلاً نطشہ ، کانٹ ، برگساں ، کارل مارکس وغیرہ کی تصانیف کو اردو میں منتقل کرنے کی طرف خاص توجہ ہو رہی ہے۔ ان مغربی مصنفوں اور مفکروں کی زندگی کے حالات بڑے شوق سے پڑھے جاتے ہیں ۔ خصوصاً نوجوان طبقہ ان افکار و خیالات سے گہری دل چسپی کا اظہار کر رہا ہے ۔ ان مغربی علماء و حکما کا نوجوانوں کے ذہن و فکر پر عمیق اثر موجود ہے ۔ اس کے علاوہ جرائم اور جاسوسی کے ناولوں اور قصوں کی طرف بڑی رغبت ہے ۔ ایسے بہت سے قصوں کا انگریزی سے ترجمہ ہوا ہے مگر بعض اوریجنل اور طبع زاد ہیں ۔ افسانہ نگاری (short stories) بطور فن کے بڑی ترقی کر رہی ہے اور گذشتہ پندرہ بیس برسوں میں نوجوانوں میں بعض ایسے قابل اور ہونہار افسانہ نگار پیدا ہوئے ہیں جن سے مستقبل میں بڑی بڑی امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔

مغرب کے زیر اثر سب سے زیادہ جس فن کو ترقی نصیب ہوئی ہے وہ صحافت ہے ۔ ہندوستان میں اخبارات اور جرائد صرف عہد جدید کی پیداوار ہیں ۔ مطبع جو حقیقتاً ہماری ترقی کے بڑے اسباب میں سے ہے ، یورپ کے طفیل ہندوستان میں رواج پذیر ہوا ۔ صحافت اور طباعت لازم و ملزوم ہیں ۔ مطبع کے رواج پاتے ہی صحافت کا بھی آغاز ہوا ۔ وہ آج ترقی کی منزلیں طے کرتے کرتے اس مقام پر پہنچ

چکی ہے کہ ہم اسے قوت ، اثر اور طاقت کا ایک مؤثر سرچشمہ قرار دے سکتے ہیں ۔ انگریزی میں بھی بعض ایسے اخبارات موجود ہیں جن کے ایڈیٹر ہندوستانی حضرات ہیں ۔ یہ اخبارات حکومت پر اثر اور دباؤ ڈالنے کے معاملے میں بڑی حد تک کامیاب ہیں ۔ لیکن ان کا دائرۂ اثر محدود ہے ۔ ان کے مقابلے میں اردو اور دوسری ہندوستانی زبانوں کے اخبارات ، پروپاگنڈہ اور رائے عامہ کو ابھارنے کے معاملے میں بدرجہا زیادہ مؤثر ہیں ، اور اثر اور اشاعت کے لحاظ سے روز افزوں ترقی کر رہے ہیں ۔ چند مستثنیات سے قطع نظر ، زبان اور طرز بیان کے لحاظ سے ان اخبارات میں ایک بڑا عیب یہ ہے کہ ان کے مقالہ نگار بے سوچے سمجھے اور بے ضرورت اپنی تحریروں میں انگریزی اور دوسری مغربی زبانوں کے ایسے الفاظ اور محاورات ٹھونس دیتے ہیں جو اردو کے خمیر اور فطرت سے کسی طرح کا لگاؤ نہیں رکھتے ۔ ظاہر ہے کہ اگر زبان اردو کے حسن اور خوبصورتی کو قائم رکھنا منظور ہے تو یہ دخیل الفاظ اور جملے جس قدر کم تعداد میں اور جس قدر زیادہ احتیاط سے استعمال کیے جائیں اتنا ہی اچھا ہے ۔

اردو کے رسالوں اور معیاری جریدوں سے بھی نثر اردو کو بہت تقویت حاصل ہوئی ہے ۔ ان میں دلگداز ، معارف ، مخزن ، زمانہ ، ادیب ، نگار ، ادبی دنیا ، نیرنگ خیال ، ہمایوں اور شاہکار کے نام لائق ذکر ہیں ۔ ان میں سے دو تین تو اب بند ہو چکے ہیں ، لیکن انھوں نے جس مقصد کو اپنے سامنے رکھا تھا وہ اب بھی بڑے جوش اور قوت کے ساتھ جاری ہے ۔ آج کل جو رسالے شائع ہو رہے ہیں ، ان میں سے بعض مصور ہیں اور ظاہری دل کشی اور

محاسن کے اعتبار سے مغربی ممالک کے اکثر رسالوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں ۔ کبھی کبھی ان کے سالانہ نمبر بھی نکلتے ہیں جو مظاہر کی خوبی ، مضامین کی عمدگی اور معلومات کے لحاظ سے بہت پسند کیے جاتے ہیں ۔

اُردو کے رسالوں کے ضمن میں چند زنانہ پرچوں کا تذکرہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے ۔ ''تہذیب نسواں'' (لاہور) جس نے عورتوں کی تعلیم و ترقی کے سلسلے میں بڑی شائستہ خدمات انجام دی ہیں ، شاید سب سے پرانا زنانہ پرچہ ہے ۔ اس کے بعد ''خاتون'' (علی گڑھ اور ''عصمت'' (دہلی) جاری ہوئے ۔ ان کے ذریعے بھی تعلیم نسواں کے مقصد کو بڑی ترقی حاصل ہوئی ۔ ''خاتون'' نام کا ایک اور رسالہ بمبئی سے شائع ہوتا ہے ۔ یہ اس لحاظ سے بہت قابل قدر ہے کہ اس کے ذریعے احاطہ بمبئی میں اُردو کی ترویج ہو رہی ہے ۔ حال ہی میں ''انیس نسواں'' کے نام سے ایک زنانہ رسالہ دہلی سے شائع ہوا ہے جو امید ہے کہ اچھا کام کرے گا ۔

ہندوستان میں بچوں کے رسالوں کا رواج بھی یورپ کے تتبع میں ہوا ۔ چنانچہ اُردو کے یہ پرچے جب نکلے تو عام طور پر ان کا ڈھنگ یورپ کے رسالوں کا سا تھا ۔ ''بچوں کا اخبار'' (لاہور) شاید اپنی نوعیت کا پہلا پرچہ تھا ۔ اس کے بعد چند اور رسالے بھی شائع ہوئے جن میں ''پھول'' سب سے پرانا اور مقبول ترین ہے اور اب تک بڑی کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے ۔

جدید طرز کا فن مزاح نگاری بھی ہمارے چمنستان ادب کا ایک گلبن شاداب ہے ۔ لکھنئو کا ''اودھ پنچ'' جو منشی سجاد حسین کی

ادارت میں نکلتا تھا اسی حیثیت سے بڑا ممتاز تھا - منشی سجاد حسین بڑے بلند پائے کے مزاح نگار تھے - ان کے اکثر رفقا انہی کے انداز پر لکھتے تھے اور بڑی شہرت رکھتے تھے - یہ اخبار کئی برس تک کامیابی کے ساتھ چلتا رہا ۔ افسوس ہے کہ اب اس کی اشاعت بند ہو چکی ہے - لیکن اس کا اثر اس لحاظ سے اب تک باقی ہے کہ لوگوں کو اب مزاحیہ تحریروں کی خاص چاٹ لگ گئی ہے - چنانچہ اسی کا تقاضا ہے کہ اب اکثر روزانہ اخبارات میں ایک کالم مطائبہ و ظرافت کے لیے مخصوص ہوتا ہے -

اُردو نثر پر مغربی اثرات کا اجمالی ذکر ہو چکا - اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اردو شاعری مغرب سے کہاں تک متاثر ہوئی - اس اثر کی ابتدا بھی نثر کی طرح انیسویں صدی کے اواسط سے ہوتی ہے - سطور بالا میں کرنل ہالرائڈ اور انجمن پنجاب (لاہور) کا تذکرہ آ چکا ہے - اس انجمن کے اجلاسوں میں آزاد اور حالی نے جدید طرز کی اولین نظمیں پڑھیں - حالی جو کچھ دیر محکمۂ تعلیم پنجاب کے ملازم رہے ، اس انجمن کے رکن تھے - ان کے علاوہ دوسرے ارکان بھی مناظر قدرت یا دوسرے معاشرتی اور مجلسی مسائل کے متعلق نظمیں لکھا کرتے تھے - غالب نے "تنگنائے غزل" سے نکل کر اظہار اور ترجمانی کے لیے جن وسعتوں کی ضرورت محسوس کی تھی افسوس ہے کہ وہ خود تو ان کو نہ پا سکے لیکن ان کے شاگرد حالی اور ذوق کے شاگرد آزاد کو قدرت نے ان کے پا لینے کی توفیق عطا فرمائی - سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی نے آزاد اور حالی کے شروع کیے ہوئے کام کو کچھ اور بڑھایا - وہ انگریزی کی تعلیم حاصل کیے ہوئے تھے - چنانچہ اس ذریعے سے انھوں

نے بہت سے جدید مغربی خیالات و تصورات اخذ کیے ۔ لیکن انھوں نے ان مغربی معلومات کو قدیم مشرق روح تمدن کے ابقا اور احیاء کے لیے استعمال کیا ۔ اکبر مادی ترقی کو روحانی فضیلت پر ترجیح نہیں دیتے ۔ انھوں نے شاعری کے ذریعے اپنے ملک والوں کو تلقین کی کہ وہ مغربی تہذیب کی ظاہری چمک دمک سے متاثر نہ ہوں اور ان شاندار اور قیمتی روایات کو ، جو انھیں مشرق حکیموں اور رشیوں سے ورثے میں ملی ہیں ، اپنے سینے سے لگائے رکھیں ۔

اکبر بذلہ و ظرافت کے دلدادہ تھے ۔ انھوں نے اپنی ہجویہ اور طنزیہ قوت کو بڑی شدت کے ساتھ ان لوگوں کے خلاف استعمال کیا جو مغرب کی اندھا دھند تقلید اور پیروی پر مصر ہیں ۔ وہ اُردو شعر میں انگریزی الفاظ کو بڑی عمدگی اور خوبی کے ساتھ کھپا سکتے تھے ۔ بعض لوگوں نے اس معاملے میں ان کا تتبع کرنا چاہا ہے لیکن اکبر کی سی قابلیت کہاں سے لاتے ۔ لہذا انھیں اس میں کامیابی نہیں ہوئی ۔ اکبر کو زبان اُردو پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی ۔ اس کی تائید میں ہم وہ نظم ، جس کا عنوان "آب لوڈور" ہے اور جو سودے کی انگریزی نظم کا ترجمہ ہے ، پیش کرسکتے ہیں ۔ (جو یہ ثابت کرتی ہے کہ اکبر کا ذخیرۂ الفاظ کتنا وسیع اور وافر تھا) ۔

مشرق و مغرب کے باہمی میل جول کے اہم ترین نتائج ہمیں سر محمد اقبال کی ذات مستجمع الصفات میں ملتے ہیں ۔ وہ اسلامی علوم و فنون کے غیر معمولی تجربے کے ساتھ ساتھ مغربی ادب و حکمت کا گہرا مطالعہ رکھتے تھے ۔ انھوں نے فارسی میں بھی بہت

سی لظمیں (=کتابیں) لکھی ہیں جن کی بنا پر انھیں بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی ۔ اس مضمون میں ان کی فارسی شاعری پر تبصرہ کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا ، مگر خوش قسمتی سے ان کے اولین مجموعۂ کلام اردو یعنی "بانگ درا" میں بھی ہمیں ان خیالات و تصورات کے مدھم نقوش ملتے ہیں جنھیں بعد میں انھوں نے اپنے فارسی کلام میں ایک مربوط و مبسوط شکل میں پیش کیا ۔ پھر اردو کی جو کتابیں ان کی فارسی تصانیف کے بعد شائع ہوئیں ان میں بھی کم و بیش انھی خیالات کا اعادہ ہے جو فارسی تصانیف میں ظاہر کیے جا چکے ہیں ۔ پس اگر ہم علامہ کی اردو کتابوں سے ان کے اہم افکار کا سراغ لگانا چاہیں تو (فارسی تصانیف کی مدد کے بغیر بھی کسی حد تک) ہم اس میں کامیاب ہو سکتے ہیں ۔

علامہ اقبال کے نظام فکر کے چند اہم مسائل یہ ہیں : (۱) فرد کی اہمیت اور خودی کی تربیت کی ضرورت (۲) نظام عالم میں انسان کا مقام بلند اور اس کے استکمال کے وسیع اور لا محدود امکانات ۔ (۳) مادی ترقی کی کوششوں میں تزکیۂ روحانی کی ضرورت جس کے بغیر مادی ترقی ہلاکت اور بربادی کا پیش خیمہ ہے ۔ (۴) اقوام یورپ کو یہ پیام عبرت کہ اگر وہ روحانیت سے بیزار ہوکر "این جہانی" تصور حیات پر مصر رہیں گے تو آن کی تہذیب تباہ ہوکر رہے گی ۔ (۵) اقوام مشرق علی الخصوص مسلم اقوام مشرق میں روحانی فضیلت اور برتری کا از سر نو احساس پیدا کرنا ۔

(یہ فلسفیانہ اور حکیمانہ مسائل ہیں) جو اقبال کی شاعری کا خلاصہ ہیں ۔ ان ٹھوس حقیقتوں کو اقبال نے شعر و شاعری کے لطیف و نازک قالب میں ڈھالا ہے ۔ اس کوشش میں انھیں جو کامیابی

حاصل ہوئی ہے وہ ان کے شاعرانہ کمال پر دال ہے - اقبال نے فلسفہ و حکمت کے علاوہ حسن و عشق اور مناظرِ قدرت سے متعلق مضامین بھی بڑی خوبی سے باندھے ہیں -

اقبال کے لیے مغربی اثرات کا واحد سر چشمہ صرف انگریزی علم و ادب ہی نہ تھا بلکہ مغربی دنیا کے بعض اور ملکوں سے بھی انھوں نے کسبِ فیض کیا - وہ جرمن زبان جانتے تھے - پھر جرمنی میں قیام کی وجہ سے انھیں اس زبان کے ادب اور علوم سے روشناس ہونے کا موقع ملا - اس کے علاوہ فرانس، اٹلی، اور سپین کی سیاحت بھی کی - ان کے افکار میں نطشہ اور برگساں کا رنگ صاف جھلکتا نظر آتا ہے - مگر ان سب باتوں کے باوجود ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ وہ اصلاً ایک صوفی تھے جن کے افکار میں ایرانی (اسلامی) تصوف اور فقر و طریقت کے خیالات بنیادی حیثیت رکھتے ہیں - ان کا پیغام مغرب کی مادیت کے خلاف ایک پر زور احتجاج ہے -

جدید نوجوان شاعروں میں سے بیشتر اردو ادب میں قابل قدر اضافے کر رہے ہیں - مگر ان اوراق کی تنگ دامانی ان کے رجحانات اور میلانات پر تبصرہ کرنے کی اجازت نہیں دیتی - پھر بھی ایک دو حضرات کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے جو اس وقت مغربی اثرات کے ماتحت، دو خاص طرزوں کی نمائندگی کر رہے ہیں - ان میں سے ایک تو حفیظ جالندھری ہیں - انھوں نے اپنی شاعری میں ہندوستانی زندگی اور معاشرت کی تصویر نہایت سادہ الفاظ میں کھینچی ہے - ان کے شعروں کی موسیقیت، ترنم اور روانی کا (سامعین و قارئین کے دل پر سحر اور جادو کا سا اثر ہوتا ہے - وہ اپنی نظمیں جب مشاعروں میں پڑھنے کے لیے آتے ہیں تو ان کے منہ سے

ان کا کلام سننے کے لیے لوگ بڑی کثرت کے ساتھ جمع ہوتے ہیں ۔ یہ امر لایق ذکر ہے کہ حفیظ نے انگریزی تعلیم حاصل نہیں کی ۔ انھوں نے پہلی دفعہ ۱۹۳۸ء میں انگلستان اور فرانس کا سفر کیا ۔ اسی زمانے میں انھوں نے انگریزی میں کچھ بول چال سیکھی اور مغربی ممالک سے براہِ راست ان کا رابطہ ہوا لیکن سچ یہ ہے کہ وہ اس سے بہت قبل اپنے ہم نشینوں اور دوستوں کے ذریعے مغربی خیالات سے روشناس ہو چکے تھے ۔

جوش ملیح آبادی کا وطن لکھنؤ ہے لیکن اب دہلی میں مقیم ہیں ۔ وہ انگریزی ادب سے بخوبی واقف ہیں اور ان کے قلم میں بڑا زور ہے ۔ اقبال کی طرح ان کی شاعری بھی مغرب کے خلاف ، علی الخصوص مغرب کے سیاسی استیلا کے خلاف ، احتجاجی ذہن کی نمائندگی کرتی ہے ۔ جوش زبردست وطن پرور اور وطن دوست شخص ہیں ۔ وہ اکثریت ملوکیت ، استعمار اور سرمایہ داری کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں ۔ ان کی آخری نظموں میں مذہب اور دین کی بھی سخت مخالفت پائی جاتی ہے ۔ اردو ڈراما کے ذکر سے پہلے بلینک ورس (بے قافیے کی نظم) کی طرف بھی کچھ اشارات کرنے ضروری معلوم ہوتے ہیں ۔ یہ طرز خالصتاً مغربی اثرات کی پیداوار ہے ۔ اس کو رواج دینے کی کوششیں بارہا ہوچکی ہیں لیکن اس معاملے میں کسی کو کامیابی نہیں ہوئی ۔[۱] مولانا عبدالحلیم شرر نے ''دلگداز'' میں اس طرز کی کچھ نظمیں شائع کی تھیں لیکن انھیں قبولِ عام نصیب نہ ہوا اور اب تک ہندوستان میں قدیم طرز کی مقفیٰ شاعری کو بڑی مقبولیت حاصل ہے ۔

ڈراما ہندوستان کے لیے کوئی نئی چیز نہیں ۔ قدیم یونان کی طرح قدیم ہندوستان میں بھی راجاؤں کے درباروں میں ناٹک ہوا کرتے تھے لیکن زمانے کے نشیب و فراز ، حکومتوں کے مدو جزر نیز سیاسی انقلابات اور پے درپے بیرونی حملوں کی وجہ سے ڈرامے کا رواج جاتا رہا اور بالآخر (معاشرتی زندگی میں) اس کی وہ اہمیت باقی نہ رہی ۔ نئے خیالات اور طریقوں کے آنے سے پہلے ، ڈرامے کی صرف اسی قدر بگڑی ہوئی شکل رہ گئی تھی کہ بازی گری اور ناچنے والوں کی ٹولیاں شہر بہ شہر پھرا کرتی تھیں جس کو "رہس پرس" کہا کرتے تھے ، یا پھر ہر سال دسہرے کے موقع پر رام چندر جی اور لچھمن کے واقعات کے سوانگ بھرے جاتے تھے ۔

ڈرامائی ادب اور کھیلوں کا ذوق اودھ کے آخری بادشاہ واجد علی شاہ کے زمانے میں پھر زندہ ہوا ۔ ۱۸۵۱ء کے قریب امانت نے "اندرسبھا" کے نام سے ایک کہانی لکھی ۔ یہ ایک فرضی راجہ (راجہ اندر) کے دربار کی کہانی ہے جس میں پریوں کے ناچ گانے ہوتے تھے ۔ کوہ پیکر دیو اس کے اکھاڑے کی حفاظت کیا کرتے تھے اور کسی آدم زاد کو اس کے پاس پھٹکنے کی اجازت نہ تھی ۔ یہ کھیل واجد علی شاہ کی نگرانی میں لکھنؤ میں دکھایا گیا ۔ کہتے ہیں کہ خود واجد علی شاہ نے اس میں گلفام شاہزادہ کا پارٹ کیا (یہ اس آدم زاد شاہزادے کا نام ہے جس پر ایک پری عاشق ہو گئی تھی ۔ اسی کی بدولت اس شہزادے کو راجہ اندر کے اکھاڑے میں گھس آنے کا موقع ملا تھا) ۔

•

امانت ہندوستان میں جدید ڈرامے کی ابتدا کرنے والا ہے ۔ کم از کم اردو کا جہاں تک متعلق ہے اس کی اولیت کا سہرا اسی

کے سر ہے ۔ بمبئی ، ہندوستان میں ڈرامے کی ترقی اور فروغ کا سب سے بڑا مرکز ہے ۔ سب سے پہلے امانت کا ڈرامہ اسی شہر میں سٹیج پر دکھایا گیا ۔ ہندوستانی سٹیج کی ترقی میں بمبئی کے پارسیوں نے بڑا حصہ لیا جن کی کمپنیوں نے اپنے سرمائے اور محنت سے اس فن کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا ۔ انھوں نے شمالی ہندوستان سے نامور ہندو اور مسلم شعرا کو بلا کر ان سے انگریزی ڈراموں کے ترجمے کروائے اور نئے ڈرامے لکھوائے ۔ مثلاً رونق بنارسی اور ظریف وغیرہ ۔ ان کے بعد سید مہدی حسن (احسن) لکھنوی اور ونائک پرشاد طالب بنارسی نے اس میدان میں قدم رکھا ۔ انھوں نے اردو ڈرامے کی زبان میں بڑی اصلاح کی ۔ لیکن اردو ڈرامے کی دنیا میں جس شخص کو بقائے دوام حاصل ہوگا وہ آغا حشر کاشمیری تھا ، جسے اس کے قدردان اور رتبہ شناس ''انڈین شیکسپیئر'' کے پُر افتخار لقب سے یاد کیا کرتے تھے ۔ حشر نے انگریزی کے بہت سے ڈراموں کا ترجمہ کیا مگر بہت سے طبع زاد ڈرامے بھی لکھے ۔

یہ امر ملحوظ خاطر رہنا چاہیے کہ اردو ڈرامے نے زیادہ تر اوپرا (غنائی تمثیل) کے انداز پر ترقی کی ہے جس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اندرسبھا ایک غنائی تمثیل تھی ۔ جن لوگوں نے پہلے پہل کھیل تیار کیے انھوں نے یہ خیال کیا کہ گانے ہندوستانی پبلک کے لیے بڑی کشش کا باعث ہوں گے ۔ محولہ بالا مصنفوں کے ڈراموں میں نظم اور نثر دونوں ہیں ۔ مگر نثر مقفیٰ اور مسجع ہوتی ہے جس کو پڑھ کر یہ محسوس نہیں ہوتا کہ مختلف اشخاص قصہ کے درمیان کوئی حقیقی اور واقعی گفتگو ہورہی ہے ۔ باقی رہیں نظمیں سو وہ گانے جانے کے لیے ہیں ۔ پھر عام رواج کے

مطابق (جو اب تک قائم ہے) عموماً ہر کھیل میں ایک مسخرہ ہوتا ہے جس کی حرکتیں اور باتیں لوگوں کو ہنسانے کے لیے ہوتی ہیں ۔ مسخرہ عام طور پر سٹیج پر اس وقت آتا ہے جب کھیل کا کوئی مضطرب یا متاثر کرنے والا حصہ دکھایا جا چکتا ہے اور لوگوں کو تفریح کی ضرورت ہوتی ہے ۔ یا پھر ایسے وقت نمودار ہوتا ہے جب نئے سین کے لیے تیاری ہو رہی ہوتی ہے اور پبلک کی توجہ کو مشغول رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اصول فن سے ہٹے ہوئے یہ ڈھنگ سٹیج کی ضرورتوں کے پیش نظر جائز سہی لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ان کی وجہ سے ہندوستان میں اردو ڈرامے کی ترقی قدرتی بنیادوں پر نہیں ہو سکی ۔ یہی وجہ ہے کہ ڈراما اب تک سوسائٹی کے سامنے (مسائل مجلسی کی) اصلی تصاویر پیش کرنے سے قاصر رہا ہے جسے در حقیقت ڈرامے کے مقاصد میں بنیادی اہمیت حاصل ہے ۔ شیکسپیئر کے بہت سے ڈراموں کے ترجمے یا چربے اردو زبان میں موجود ہیں ، ہیملٹ (Hamlet) ، ٹمپسٹ (The Tempest) جولیس سیزر ، کلیو پیٹرا ، ہنری دی ففتھ ، رومیو اینڈ جولیٹ ، سٹیج پر دکھائے جا چکے ہیں ۔ طالب بنارسی نے لٹن کے ڈرامے موسوم بہ Night and Morning کا ترجمہ ''لیل و نہار'' کے نام سے اردو میں کیا ۔ اسی مصنف کا ڈرامہ "ہریش چندر" ہندو مآخذ پر مبنی تھا ۔ طالب بنارسی کی طرح آغا حشر نے بھی ہندو مآخذ سے بہت کام لیا ہے ۔

آج کل بہت سے مصنف اس سلسلے میں عمدہ کام کر رہے ہیں لیکن سینما کی بولنے والی تصویر کے رواج عام نے تھیٹر کی ترقی کو بڑا دھکا لگایا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ ہندوستان میں فن ڈرامہ کی

مستقبل میں کیا حالت ہوگی ۔ مغربی ممالک میں بھی ناطق تصاویر کی وجہ سے ڈرامے کو کچھ نقصان پہنچا ہے لیکن اس حد تک نہیں ۔ کیونکہ یہ فن ان ممالک میں صدیوں سے معراج کمال پر ہے ، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب بھی لوگ اس میں خاص دلچسپی لے رہے ہیں اور اس کے سلسلے میں بڑی سرگرمی کا اظہار کیا جا رہا ہے ۔ ہندوستان میں ڈرامے کی ترقی کے لیے جو قوتیں صرف ہو سکتی تھیں وہ اب ان کہانیوں کے معیار کو بلند کرنے میں صرف ہوں گی جو خاص سینما کے لیے لکھی جا رہی ہیں ۔

میں محسوس کرتا ہوں کہ میرا تبصرہ جامع اور مکمل نہیں ، تاہم اس قدر ضرور ہے کہ اس سے اردو ادب میں مغربی اثرات کی کمیت اور کیفیت کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہو سکے گا ۔ قومیت ، جمہوریت ، اشتراکیت اور بین الاقوامیت اور اس نوع کے دوسرے مضامین سے متعلق بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں ۔ وہ اس تبصرے میں شامل نہیں ۔ ان کو پڑھنے سے ان اثرات کا ، جو اس وقت ہندوستانی ادب اور تصورات پر بڑی شدت کے ساتھ وارد ہو رہے ہیں اور ادب کے راستے سے ہو کر جمہور کی مجلسی اور معاشرتی زندگی کو متاثر کر رہے ہیں ، بڑی اچھی طرح سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔

* * *

ہماری شاعری کا ایک نیا میلان
(اشاریت اور ابہام)

(یہ مضمون ماہنامہ "نگار" شمارہ جنوری و فروری ۱۹۵۰ء،
ص ۱۰۵ تا ۱۱۷ میں شائع ہوا)

انیسویں صدی کے وسط میں فرانسیسی شاعری میں ایک نئی تحریک کا آغاز ہوا۔ اس نئی تحریک کے بانی Boudlaire, Verlaine اور Mallarme ہیں جن کا کہنا ہے کہ شعر کے حسن، لطافت و رنگینی کا راز اس میں پنہاں ہے کہ وہ ہمیں غور و فکر کی دعوت دے۔ شعر پڑھنے کے بعد ہم اس کے معنی کی جستجو میں مستغرق ہوجائیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ شاعری میں ہمیشہ ایک معمہ چاہیے جو حل کا طالب ہو۔

Mallarme جو اس زمانے کی نئی پود کا مشہور شاعر تھا، اپنی کتاب میں اس نئی تحریک کی حمایت میں کہتا ہے:

"میری رائے میں شاعری میں اشارات و کنایات کا ہونا بہت ضروری ہے۔ اشیاء کے تصور میں غرق ہونے سے اُن کی متحرک تصویروں کا بننا ہی شعر کی جان ہے۔ کسی شے کو اس کے مروجہ نام سے پکارنا، شعر کے تین چوتھائی حسن کو فنا کر دیتا ہے۔ سننے والے کے لیے شعر میں کوئی لذت باقی نہیں رہتی۔ شعر کا حسن اور اس کی لذت یابی عبارت ہے اُس مسرت سے جو ہمیں اس کے معنی کی تلاش میں قدم قدم پر ہوتی ہے ——

اشاروں ہی سے سوئے ہوئے خواب جاگ اٹھتے ہیں ــــ اس ابہام کے صحیح استعمال سے اشاریت وجود میں آتی ہے۔"

شاعری میں یہ نئی تحریک نوجوانوں میں اس قدر مقبول ہوئی کہ اس نے بہت جلد ایک مسلمہ اصول کی حیثیت اختیار کر لی اور فرانسیسی ادب کے نقادوں کو اس کے خلاف آواز بلند کرنا پڑی۔ مثلاً Doumie نے اُس زمانے میں لکھا :

"اب وقت آ گیا ہے کہ ہم شاعری کے اس نئے نظریہ ابہام کا خاتمہ کریں جس کو اس کے مربیوں نے ایک مسلمہ اصول کی حیثیت دے دی ہے۔"

یہ نئی تحریک فرانس تک ہی محدود نہ رہی بلکہ جرمن، روسی اور انگریز آرٹسٹ بھی اس سے متاثر ہوئے۔ کسی جرمن آرٹسٹ کو اس نئی تحریک میں نطشے کے اس بیان کی وضاحت نظر آئی کہ :

"آرٹ طبقہ ادنٰی اور طبقہ متوسط کے لیے نہیں ہے بلکہ اعلیٰ تہذیب و تمدن کے چند افراد کے لیے ہے۔"

تو کسی کو Wagner کے بیان کی صداقت نظر آئی کہ :

"آرٹ ایک انفرادی مشغلہ ہے۔ آرٹسٹ جو کچھ پیش کرتا ہے وہ خود اس کے لیے ہے، دوسروں کے لیے نہیں۔ اور آرٹ ترقی پذیر اُسی وقت ہوتا ہے جب کہ سامعین یا ناظرین سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔"

ہمارے ادب نے بھی اس تحریک سے اثر لیا اور گزشتہ چار پانچ سال سے ایسی سینکڑوں نظمیں ہمارے یہاں کے صفحات کی زینت

بن کر ، شعر و ادب کا ذوق رکھنے والے حضرات کے تخیّل پر تازیانے لگا رہی ہیں -

اب فن ادب (Art of Literature) کے نقطۂ نظر سے دیکھنا یہ ہے کہ آرٹ میں اس قسم کی شاعری کا کوئی جواز ہے یا نہیں ، اگر ہے تو وہ کس قسم کا ؟

ادب ایک فن ہے جس میں لحن و صوت کے ذریعے گویائی حاصل ہوتی ہے لیکن ادب کی یہ تعریف مکمل نہیں - ہر وہ چیز جو اس تعریف کے تحت میں آتی ہے ادب نہیں کہلائی جا سکتی - مثلاً کلام (conversation) ادب نہیں ، لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ کلام بھی ایک فن ہے - لفظ آرٹ مختلف معنوں میں استعال ہوتا ہے - فنون لطیفہ کے علاوہ جنگ کا فن ، اشتہار بازی کا فن ، جھوٹ بولنے کا فن ، ایسے بیسیوں فنون سے ہمارے کان آشنا ہیں - لیکن لفظ فن اپنے مختلف سیاق و سباق میں ایک ہی معنی رکھتا ہے - وہ ایک "سلیقہ" (skill) ہے جو ایک خاص اثر پیدا کرنے کے لیے عمداً اختیار کیا جاتا ہے - "سلیقہ" کے مختلف مدارج ہیں - ادب میں "لسانی سلیقہ" اعلیٰ درجے کا ملتا ہے جو گفتگو سے زیادہ متعین ، مستقل ، مؤثر اور جچا تلا ہوتا ہے - اس کے علاوہ ادب میں یہ سلیقہ صرف الفاظ تک محدود ہے - لیکن گفتگو میں سلیقہ کی خوبی کا انحصار متکلم کی شخصیت پر بھی ہے -

ادب کے آرٹ سے ہمارا مطلب وہ فن ، وہ کمال ، وہ سلیقہ یا وہ ہنر ہے جس کے ذریعے ہم ایک خاص اثر کی اثر پذیری کے متمنی ہوتے ہیں - لیکن سوال یہ ہے کہ ادب کے آرٹ سے ہم ایک خاص

اثر کیوں پیدا کرنا چاہتے ہیں اور اس سے ہمارا مقصد کیا ہے۔ ادب اظہار کا ایک ڈھنگ ہے اور اس کے وجود کا انحصار صرف کسی جذبے کے اظہار پر ہی نہیں بلکہ ظاہر کیے ہوئے جذبے کی قبولیت (receiving) پر بھی ہے۔ ادب کے فن میں یہ دونوں پہلو شامل ہیں اور مقابلتاً دونوں مساوی اہمیت رکھتے ہیں۔ اگر میں آپ سے کوئی ایسی چیز بیان کروں جس کا مجھے احساس ہوا ہو تو اس صورت میں الفاظ میری جانب سے میرے احساس کو "ظاہر" (express) کرتے ہیں لیکن آپ کے لیے میرے یہ الفاظ میرے احساس کی "نمائندگی" (represent) کرتے ہیں۔

ادب کے یہ دونوں پہلو اپنی جداگانہ حیثیتوں سے صرف تنقید ہی پر نہیں بلکہ ادب پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں اور ادب کی اصطلاح میں انہیں "داخلی" اور "خارجی" پہلو کہا جاتا ہے۔ ادب کو مصنف کے خیالات یا اس کی ذہنی کیفیت پر محمول کرنا ادب کے داخلی پہلو کو اہمیت دینا ہے اور romanticism کی ابتدا ادب کے اسی تصور سے ہوئی۔ ادب کا دوسرا تصور وہ ہے جس میں خیالات کو مخاطب کے سامنے پیش کیا جاتا ہے جس سے ادب کے خارجی پہلو کو اہمیت ملتی ہے۔ اس کی انتہا ہمیں realism میں ملتی ہے جس میں ظاہر کی ہوئی چیز ہی سب کچھ ہے۔

ادب کے یہ دونوں پہلو اپنی اپنی جگہ پر صحیح ہیں۔ ان میں سے ایک بھی مکمل صداقت نہیں۔ ادب کی تھیوری (نظریہ) کے لیے ہمیں ایک ایسے لفظ کی ضرورت ہے جو ادب کے ان دونوں پہلوؤں کو مساویانہ حیثیت سے آپس میں ملا سکے۔ لفظ "ترسیل" یا ابلاغ (communication) ہمارے اس مقصد کو پورا کرتا ہے۔ کیونکہ

یہ بات بدیہی ہے کہ ادب جو کچھ بھی ہو ، اس میں "رسائت" (communication) کا ہونا ضروری ہے - اگر مصنف کے خیالات یا احساسات کی رسائی قارئین تک نہ ہوئی تو وہ ادب نہیں ہو سکتا ، کوئی اور چیز ہے ـــ معمہ ، چیستان یا الفاظ کا ایک بے معنی مجموعہ - زبان ، صرف ادب کے آرٹ کا ذریعہ ہے اور اس آرٹ کا انحصار اس رشتہ ابلاغ پر ہے جو مصنف اور اس کے پڑھنے والوں میں قائم ہوتا ہے - ادب سے ہمارا مقصد کیا ہے ؟ اس کی وضاحت اس ابلاغ میں ملے گی جو آرٹ کے ذریعے قائم ہوتی ہے - ادب کے آرٹ سے ہمارا مقصد وہ تین کڑیاں ہیں جو باہم ملی جلی ہوتی ہیں - اس کی ابتدا اور انتہا مصنف اور اس کے پڑھنے والے ہیں اور ان دونوں کے درمیان رشتہ قائم کرنے والی کڑی زبان ہے -

اگر نوع انسانی کے لیے آرٹ کی کوئی قیمت اور اہمیت ہے تو وہ صرف اس لیے کہ آرٹ ایک معاشرتی مشغلہ ہے - ٹالسٹائی کے نزدیک آرٹ ایک ایسا مشغلہ ہے جس میں ایک انسان شعوری طور پر خارجی اظہارات کے ذریعے اپنے جیتے جاگتے احساسات کو اس انداز میں دوسروں تک پہنچاتا ہے کہ دوسرے بھی اس سے ویسے ہی متاثر ہوں جس طرح آرٹسٹ - آرٹسٹ کے جذبات و احساسات کا دوسروں میں سرایت کر جانا آرٹ کا کمال ہے -

آرٹ صرف احساسات کا اظہار ہی نہیں بلکہ سامعین سے تخاطب کا ایک ذریعہ بھی ہے - وہ ایک شکل (form) اختیار کرتا ہے تاکہ دوسرے کو مخاطب کر سکے - کہانی ، کہانی اس لیے ہے کہ وہ دوسرے کو سنائی جاتی ہے - ایک تصویر ، تصویر اس لیے ہے کہ

وہ دیکھنے کے لیے کھینچی گئی ہے اور وہ آرٹ کی تمام خوبیوں کی حامل ہے اس لیے کہ اس کا خطاب آنکھ سے ہے ۔ موسیقی جس میں موسیقی کے وہ تمام اجزا شامل ہیں جس سے اس کی تشکیل ہوئی ہے، موسیقی کہلاتی ہے، اس لیے کہ اس کا خطاب کان سے ہے ۔ آرٹ کی اس غرض و غایت کے بغیر آرٹ کی تشکیل نہیں ہو سکتی ہے، ورنہ ایک فنی کارنامہ اور بیداری کا سپنا دونوں برابر ہیں ۔ ایک استعمال کی چیزیں ہیں جو آرٹ سے بالکل عاری ہوتی ہیں ۔ کاریگر کے فن کو اہمیت وہاں ملتی ہے جہاں بنائی ہوئی چیز کی خوبصورتی نمایاں ہوتی ہے ۔ یہی وہ اہمیت ہے جس کی وجہ سے ایک عمارت آرکیٹیکچر میں تبدیل ہوجاتی ہے اور وہ اس بات کی دلیل ہے کہ عمارت صرف معمار کے لیے یا کسی کے رہنے کے لیے نہیں بنائی گئی بلکہ ناظرین سے خطاب کرنا اور ان کی آنکھوں کو دعوتِ نظارہ دینا بھی اس کا مقصد ہے ۔

آرٹسٹ اپنے احساس کو ظاہر کرتا ہے لیکن اس کا یہ اظہار خارجی ہے ۔ شاید آپ یہ کہیں کہ اس کا یہ "خارجی اظہار" خارجی اظہار نہیں ہے، بلکہ وہ اپنے احساس کو صرف ضبط تحریر (recording) میں لا رہا ہے ۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ اظہار کس کے مطالعے یا مکالمے کے لیے ہے ۔ خود اس کے لیے ؟ ہاں ۔ لیکن کیا صرف اسی کے لیے ؟ کسی مخلص آرٹسٹ سے پوچھیے یا اس پر غور کیجیے کہ آرٹ گیلریاں کس لیے سجائی جاتی ہیں ۔ مطبعے کس لیے قائم ہوتے ہیں ؟ نغمہ و سرود کی محفلیں کیوں منعقد کی جاتی ہیں ؟ آرٹ کے لیے public کی ویسی ہی ضرورت ہے جیسی public کو آرٹ کی ۔ آرٹسٹ سے اس کے سامعین یا قارئین کو الگ کر لیجیے

تو آرٹسٹ ایک عضوِ معطل ہو کر رہ جائے گا ۔ اگر آرٹ کا عمل آرٹسٹ کی ذات کے لیے محدود ہے اور بالکل private ہے تو وہ کس لیے ایک قابلِ فہم خارجی تکمیل میں کوشاں نظر آتا ہے ۔ جب تک وہ ایک ایسی چیز نہیں پیش کرتا جس سے دوسرے بھی محظوظ ہو سکیں ، اس کی پیش کی ہوئی چیز آرٹ نہیں کہلا سکتی ۔ آرٹسٹ اپنے فن میں اس وقت تک ناکام رہتا ہے جب تک وہ اپنے مواد کو اپنی ذات تک ہی محدود رکھتا ہے اور اس طرح وہ اپنے احساس کے وجود کو مکمل نہیں کر سکتا ۔

آرٹ انسانی ترقی کے دو بڑے حربوں میں سے ایک ہے ۔ محض الفاظ کے ذریعے ہم تبادلۂ خیالات کرتے ہیں ، اور آرٹ کی مختلف شکلوں سے تبادلۂ جذبات و احساسات ۔ خیالات و جذبات کے اظہار کے لیے انھیں الفاظ کا جامہ پہنانا ضروری ہے ، لیکن اسے ادب کا درجہ بخشنے کے لیے فن کارانہ انداز ضروری ہے ۔ اور الفاظ کا یہ جامہ جو خیالات و احساسات کو فن کارانہ انداز میں پہنایا جاتا ہے ، ایسا ہو کہ دیکھنے والا اگر فوراً نہ سہی تو کچھ غور و تفکر کے بعد کہہ اٹھے : ”من انداز قدت را می شناسم ۔“ آرٹ کی ترقی اور اس کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ آرٹسٹ اپنے سامعین یا ناظرین سے ایک کامیاب رشتۂ مراسلت قائم کرے ورنہ اُس کے آرٹ کا خاتمہ ہونا ضروری ہے ۔

یہ کہنا کہ : ”کسی چیز کو واضح طور پر بیان کر دینے سے اس کے لطف کا تین چوتھائی حصہ زائل ہوجاتا ہے جو رفتہ رفتہ کسی بات کے معلوم کرنے میں ہمیں حاصل ہوتا ہے اور اشاروں ہی سے

سوئے ہوئے خواب جاگ اُٹھتے ہیں'' صرف اسی حد تک صحیح ہے کہ تخیل کی مدد سے ایک خاص خیال کا اظہار کیا گیا ہو اور اس تخیل کی کارفرمائی ایسی ہو کہ قاری کے ذہن کو تخیل کی رنگین و سرسبز وادیوں سے گزار کر منزل مقصود تک پہنچا سکے ، یا تخیل کی سرسبز وادیاں ایسی ہوں کہ ان کی مدد سے قاری منزل مقصود کا پتہ لگا سکے ۔ غالب کا ایک مشہور شعر ہے :

بوئے گل ، نالۂ دل ، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

اس میں ایک خاص خیال کے اظہار میں تخیل سے مدد لی گئی ہے ۔ تین مختلف تصور پیش کیے گئے ہیں اور اس کے بعد شاعر نے اپنے مقصد کا اظہار کیا ہے ۔ اس سے شعر کے حسن میں اضافہ ہوگیا ہے اور وہ سریع التاثیر بن گیا ہے :

ٹوٹی ہے کوئی کشتی یا شور ہے ساحل کا
یا کوئی بلاتا ہے مجھ کو لبِ ساحل سے

"واضح طور پر شاعر نے کچھ نہیں کہا ۔ اسے جو کچھ کہنا ہے اسے اس نے دھندلکے میں رکھا ہے ۔" لیکن شاعر نے جو تین تصور پیش کیے ہیں وہ شاعر کے مقصد کی طرف رہبری کرتے ہیں : "ایک شک کی حالت شروع سے آخر تک قائم ہے اور قاری کے دل میں ایک دردمندانہ کیفیت پیدا کی گئی ہے ۔'' بے شک یہ دھندلکا شعر کی خوبی کو بڑھاتا ہے اور اگر اشاریت یا تخیل پرستی یا ابہام

سے یہی دھندلکا مقصود ہے تو چشم ما روشن دل ما شاد ۔ لیکن میلارمے اور اس کے مقلد میراجی کے یہاں جو دھندلکا ہے وہ اندھیرے کو بھی مات کرتا ہے ۔ یہاں امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی جو قاری کو منزل مقصود تک پہنچا سکے ۔

”کسی چیز کو واضح طور پر بیان کر دینے سے اس کے لطف کا تین چوتھائی حصہ زائل ہو جاتا ہے“ یقیناً درست ہے ۔ لیکن اس اصول کی پابندی میں اگر آرٹ کا سب سے پہلا مقصد (communic) فوت ہو جائے تو وہ آرٹ ، آرٹ نہیں رہتا ۔ آرٹ کے اس اصول کو دریافت کرنے کا سہرا میلارمے کے سر نہیں ، میلارمے سے پہلے مشرق و مغرب کے ادب میں ایسے آرٹ کی مثالیں مل جاتی ہیں ۔ لیکن فرق یہ ہے کہ وہاں یہ صرف اظہار کا ایک ”ذریعہ“ تھا اور میلارمے نے اسے ”مقصود“ قرار دیا ہے ۔

کسی جذبے کے ”بیان“ (description) اور ”اظہار“ (ex-pression) میں بہت فرق ہے ؛ مثلاً یہ کہنا کہ ”میں خوش ہوں“ ایک خاص جذبے کو اس کے نام سے پکارتا ہے ۔ یہ محض ”بیان“ ہے ”اظہار“ نہیں ۔ اظہار میں ایسا کوئی لفظ مستعمل نہیں ہوتا جس سے وہ جذبہ موسوم کیا جاتا ہے ۔ مثلاً فارسی کا ایک مشہور شعر ہے :

پردہ داری می کند بر قصر کسریٰ عنکبوت
بوم نوبت می زند بر گنبد افراسیاب

شاعر کو جو کچھ کہنا ہے (یعنی بے ثباتی دنیا) اس کا کامل اظہار اس شعر میں ملتا ہے مگر اس خیال سے متعلق ایک لفظ بھی اس شعر میں نہیں ملتا ۔ غالب فرماتے ہیں :

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

"اس شکل"، کس شکل سے ؟ اس کے متعلق شاعر نے واضح طور پر کچھ نہیں کہا ۔ لیکن کس لطیف اور مؤثر پیرائے میں اشارہ کرتا ہے کہ یہ افلاس و مصیبت کی زندگی ہے ۔ ایک اور مثال ملاحظہ ہو ۔

عشق و عاشقی کے مراحل میں شاعر ایک ایسی منزل پر پہنچتا ہے جب کہ اُسے یقین ہو جاتا ہے کہ اب معشوق کی تلاش اور جستجو لاحاصل ہے ۔ اُسے سخت مایوسی ہوتی ہے لیکن اس کی یہ مایوسی بےبنیاد نہیں اور وہ اس مہم سے دست بردار ہو جاتا ہے ۔ دوست احباب طعنہ دیتے ہیں تو وہ کس قطعیت سے جواب دیتا ہے :

پے بہ کجا برد کسے مرغ بہ شب پریدہ را
(ارے میاں اب اُس پرندہ کے پیچھے کون جائے جو رات کی تاریکی میں اُڑ گیا) ۔

Collingwood اپنی کتاب Principles of Art میں کہتا ہے : "اگر تم خوف کے اُس جذبے کو ظاہر کرنا چاہتے ہو جو کسی چیز سے تمہیں ہوا ہے تو کسی وضعی لفظ مثلاً "خوفناک" سے ظاہر نہ کرو ، کیونکہ لفظ "خوفناک" جذبے کو ظاہر کرنے کی بجائے اس کو بیان کرتا ہے اور ایسے بیان سے زبان اور جذبات دونوں سرد پڑ جاتے ہیں ۔ ایک اعلیٰ شاعر اپنے شاعرانہ الہام کے لمحات میں اپنے جذبات کا ذکر اُن الفاظ میں

نہیں کرتا جن سے عام طور پر جذبات موسوم ہوتے ہیں۔ "بیان" کسی جذبے کے ظہار میں مد و معاون نہیں ہوتا بلکہ اس کے اظہار میں حارج ہوتا ہے، کیونکہ "بیان" تعمیم (generalize) کرتا ہے، اورکسی جذبے کو بیان کرنا اس کو اس کے اقسام اور اصل سے متعلق کرنا ہے۔ اس کے برعکس "اظہار" (expression) متفرد (individualize) کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ 'مسرت' جو مجھے یہاں اس گھڑی اور ایک خاص شخص کی موجودگی میں اور ایک خاص سبب سے حاصل ہوئی ہے اُس کیفیت کی ایک مثال ہے جسے ہم "مسرت" کہتے ہیں اور میں آسے مسرت کہنے میں اس حقیقت کو بیان کر رہا ہوں۔ لیکن یہ مسرت اُس مسرت سے یکسر مختلف ہے جسے میں نے پہلے کبھی محسوس کیا تھا اور شاید اس قسم کا احساس مسرت مجھے پھر کبھی نہ ہوگا۔"

شاعر اپنی شاعری کے معراج پر اُس وقت پہنچتا ہے جب کہ وہ اپنے جذبات و احساسات پر لیبل نہیں لگاتا۔ اس کی نوعیت نہیں بیان کرتا، بلکہ اپنے جذبے میں ایک انفرادی شان پیدا کرتا ہے اور اس کو ایسے الفاظ میں بیان کرتا ہے جس سے ہم اُس جذبے کو اُسی قسم کے، مگر کچھ مختلف جذبے سے ممیز کر سکیں۔

جذبات کا "اظہار" (اظہار اُن معنوں میں جس کی وضاحت اوپر ہوچکی ہے) شاعری کے لیے ایک بڑی کڑی شرط ہے۔ اگر اس معیار پر ہماری شاعری کے سرمائے کو جانچا جائے تو شعرا کے کلام کے ایک بڑے حصے کو شاعری سے خارج کرنا پڑے گا۔ لیکن ہر بڑے شاعر کے ہاں ایسے آرٹ کی کمی نہیں۔

اگر آپ کو میراجی اسکول کے شاعروں سے ملنے کا اتفاق ہو اور اگر آپ اُن سے پوچھیں کہ ''جناب ! آپ کی شاعری میں اس قدر ابہام کیوں ہے ؟'' تو وہ جواب دیں گے کہ ''ہماری شاعری علاماتی (symbolic) ہے اور اس سے لطف اندوز ہونے کے لیے اُن علامات کا سمجھنا ضروری ہے ۔''

یہ اشاریت یا علامتیت (symbolism) کیا ہے ؟ مغرب کے اثر سے پہلے ہمارے ادب میں اس کی مثالیں ملتی ہیں یا نہیں ؟ اگر ملتی ہیں تو وہ کس قسم کی ہیں ؟ اس کی ایجاد کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی ؟ یہ باتیں تفصیل طلب ہیں اور ادب جدید کی اشاریت پر کچھ کہنے سے قبل ضروری ہے کہ ان سوالات پر غور کیا جائے۔

فیض احمد فیض اپنے ایک مختصر مضمون ''اُردو شاعری میں اشاریت'' میں فرماتے ہیں :

''علامات سے ہم ایسے استعارے مراد لیتے ہیں جنھیں شاعر اپنے بنیادی تصورات کے لیے استعمال کرتا ہے ۔ جس طرح ہم کسی ایک لفظ کو اصطلاح قرار دے کر اس کے خاص معنی مقرر کر لیتے ہیں ، خواہ اس کا لغوی مفہوم کچھ ہی کیوں نہ ہو ، اسی طرح شاعر اپنے تجربات کے اظہار میں بعض الفاظ کو اصطلاحات قرار دے لیتا ہے ۔ شاعر اور اس کے سننے والوں میں ایک مفاہمت سی ہو جاتی ہے ۔ جب شاعر سفّاک کہے تو اس کی مراد چنگیزخاں سے نہیں ، اپنے محبوب سے ہے ۔''

مثلاً جب مرزا مظہر جانِ جاناں کہتے ہیں :

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو
یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

تو کسی کو اس خیال سے تشویش نہیں ہوتی کہ شہر میں کوئی خطرناک مجرم آن گھسا ہے - سب جانتے ہیں کہ بات کیا ہو رہی ہے - Collingwood کہتا ہے :

''علامات ، وہ الفاظ یا اصطلاحات ہیں جو مصنف اور قاری کے درمیانی معاہدے کی بنا پر ایک خاص مقصد کے اظہار کے لیے جائز قرار دیے جاتے ہیں - علامات ایک قابل فہم (-intelling ible) زبان ہے - زبان اس لیے کہ وہ ہمارے جذبات و احساسات کا اظہار کرتی ہے اور 'معقول' اس لیے کہ وہ ذہنی خیالات و نتائج کا اظہار ہے - الفاظ صرف احساس کا اظہار کرتے ہیں اور علامات احساس کی اُس ارتقائی منزل کی طرف اشارہ کرتے ہیں جہاں پہنچ کر یہ احساس ایک پختہ خیال کی صورت اختیار کرتا ہے -"

مندرجہ بالا سطور میں اشاریت سے متعلق فیض اور کالنگ وڈ کے جو حوالے دیے گئے ہیں اُن میں کوئی نئی بات نہیں کہی گئی ہے - اس میں جس قسم کی علامات کی وضاحت کی گئی ہے اُس کی بیسیوں مثالیں ہمیں قدیم و جدید شاعری میں مل جاتی ہیں - پرانی شاعری کے علامات سے تو ہر شخص واقف ہے : گل و بلبل ، شمع و پروانہ ، ساقی و پیمانہ ، شیریں و فرہاد ، شمشیر و سناں ، قاتل ، حاجب ، فرہاد ، رقیب وغیرہ - موجودہ شعرا نے ان میں سے بعض کو ترک کردیا ہے اور بعض کو نئے معنی پہنائے ہیں - شمشیر و سناں ، جوش اور مجاز کے ہاں لوٹ آئے ہیں لیکن ان علامات کا مفہوم اور ماحول بالکل جداگانہ ہے - علامات کی بہترین مثالیں ہمیں اقبال کی شاعری میں ملتی ہیں - انھوں نے نئی علامات وضع کرنے کی بجائے قدیم شاعری کی علامتوں کو ، جو اب فرسودہ ہوگئی ہیں ،

ایک نئے ماحول میں پیش کر کے بالکل نئے معنی پہنائے ہیں ۔ صرف یہی نہیں بلکہ ایک علامت کو مختلف جگہوں پر مختلف معنوں میں استعمال کیا ہے ۔ مثلاً پرویز اور فرہاد سیاسی میدان میں سرمایہ دار اور مزدور کے مترادف ہیں اور اخلاقی میدان میں مادیت پرستی اور بے لوث اصول پرستی کے ترجمان ہیں ۔ میخانہ سیاسی معنوں میں دولت والوں کی محفل ہے اور اخلاقی محفل میں صاحبِ دل لوگوں کی مجلس ۔ یہ تو ہوئیں اشاریت کی وہ مثالیں جو صرف نئے ادب ہی میں نہیں بلکہ قدیم ادب میں بھی ملتی ہیں اور جن کے نئے مفہوب کا ارتقا ہماری گزشتہ چالیس برس کی سماجی زندگی کے مطابق ہوا ہے ۔ لیکن یہاں اصل بحث اُس اشاریت سے ہے جس کی ابتدا میلارمے اسکول سے ہوئی اور جس کی تقلید ہمارے چند نوجوان[1] شعرا نے شروع کی ہے ۔

جدید اشاریت کا سب سے اچھا مبصر Edmund Wilson ہے ۔ اس کی کتاب Axcts Castle اشاریت پر بہترین کتاب ہے ۔ وہ اشاریت کی وضاحت ان الفاظ میں کرتا ہے :

۱- مغرب کے اثر سے ہمارے ادب میں جو نئی چیزیں آئی ہیں ان میں سے ایک ''مارکسی ادب'' بھی ہے ۔ ہمارے ادب میں اس کے علم بردار سجاد ظہیر ، علی سردار جعفری ، خواجہ احمد عباس ، جوش ملیح آبادی ، اختر انصاری ، کرشن چندر وغیرہ ہیں ۔ مارکسی ترق پسند ادب طبقاتی کشمکش کا ترجمان اور ایک اشتراکی نظامِ معاشرت کا حامی ہے ۔ اس میں اشاریت اور ابہام جیسے ''طبقاتی ادب'' اور ''ذہنی تعیشات'' کے لیے کوئی جگہ نہیں ۔ روسی ادب میں بھی گزشتہ صدی کے اواخر تک اشاریت کا بازار گرم تھا لیکن انقلابِ روس کے بعد پرولتاری ادب کی اشاعت کے لیے وہاں جو جماعت قائم ہوئی ، اس نے اشاریت کے خلاف آواز بلند کی اور ایک قلیل مدت میں اس تحریک کا خاتمہ کردیا گیا ۔

"... ہمارے شعوری لمحات کا ہر احساس یا تاثر ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہوتا ہے اور اس لیے ہمارے احساسات و تجربات کو رواجی ادب کی رسمی زبان کے ذریعے ضبط تحریر میں لانا ناممکن ہے۔ ہر شاعر کی شخصیت جداگانہ ہوتی ہے۔ اس کا ہر لمحہ ایک اچھوتی خصوصیت کا حامل ہوتا ہے جس میں مخصوص عناصر کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ ایک ایسی زبان کی تخلیق کرنا جو شاعر کے اظہار یا تاثر کو ظاہر کرنے پر قدرت رکھتی ہو، ہر شاعر کا فرض ہے۔ ایسی زبان میں اشارات کا استعمال ضروری ہے۔ شاعر کا احساس جو نہایت دھندلا، نہایت سبک رو اور نہایت اچھوتا ہوتا ہے، اس کو واضح الفاظ میں یا نہایت تفصیل سے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ الفاظ کا ایک تانتا اور پیکروں (images) کا ایک تسلسل، جو قاری کے ذہن کی رہبری کر سکے، اس مقصد کو پورا کرتا ہے۔"

اشاریت اور ابہام کی پوری وضاحت کے لیے واسن کے ان الفاظ کے ساتھ میلارمے کے اس بیان کو پیش نظر رکھنا چاہیے جو اس مضمون کے آغاز میں نقل ہو چکا ہے۔

میلارمے کے بیان کے بعض اہم نکات پر اس سے قبل بحث ہو چکی ہے۔ اب ان دونوں بیانوں کو ملحوظِ خاطر رکھ کر اشاریت کی طرف لوٹیے۔

آرٹ میں اشاریت کی ابتدا غالباً اسی وقت سے ہوئی جب کہ مشہور آرٹسٹ Azaneme نے کہا:

"میں نے فطرت کی عکاسی نہیں کی بلکہ اس کی ترجمانی کی ہے۔"

Azaneme کے اس بیان کے بعد ایسے آرٹ کی کوئی اہمیت نہیں

رہتی جس میں اشیا کے خارجی پہلو کی عکاسی کی گئی ہو ۔ ایک اعلیٰ آرٹسٹ کسی چیز کی سطح کو جوں کا توں پیش نہیں کرتا بلکہ اس سطحی اظہار کی تہ میں جس اصول کی کارفرمائی ہوتی ہے اس کی جستجو کرتا اور اس کا جلوہ دکھاتا ہے ۔

آرٹ کا یہ نظریہ بہت مقبول ہوا اور ادب پر بھی اس نے اپنا گہرا اثر ڈالا ۔ سب سے پہلے فرانس میں میلارمے وغیرہ نے symbolism کو اپنے خیال کا ذریعہ بنایا ۔ ادیب اب تک جس کمی کو محسوس کر رہے تھے اسے پورا کرنے کے لیے انھیں جس چیز کی تلاش تھی وہ انھیں اشاریت میں نظر آئی ۔ ہمارے ایک شاعر نے جب یہ کہا ''آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں'' تو اس کے ذہن میں بھی غالباً کچھ اسی قسم کا خیال تھا ۔ آنکھ جو دیکھتی ہے ، دل جو محسوس کرتا ہے ، دماغ جو سوچتا ہے ، اس کے اظہار کے لیے رسمی زبان کا سرمایہ کافی نہیں ، کسی اور ذریعے کی ضرورت ہے ۔

شاعر ایک بات کو محسوس کرتا ہے ، اس پر غور کرتا ہے اور اپنے تاثرات کو الفاظ کا قیدی بناتا ہے ۔ اب اگر ان الفاظ سے قاری کے ذہن میں وہی احساس پیدا نہیں ہوتا جو شاعر کو ہوا ہے تو اس میں تصور کس کا ؟ شاعر کہے گا کہ اس میں میرا کوئی تصور نہیں ۔ مجھے تو ہمیشہ سے ''تنگئی ظرف'' کی شکایت رہی ہے اور میں چلاتا رہا ہوں ''کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے۔'' آرٹسٹ اور شاعر کی یہی ضرورت تھی جس کی وجہ سے اشاریت وجود میں آئی ۔

ادیب اور شاعر اپنے اظہار خیال کے لیے جس چیز کی کمی محسوس کررہے تھے وہ اس عہد کے لیے نئی ہے ۔ قدما میں بھی ہر

بڑے شاعر کو اس دقت کا احساس ہوا ہے مگر انھوں نے اکثر مقامات پر suggestion کے حربے سے اس مشکل کو آسان کیا ہے ۔ ادب کو ادب العالیہ کا درجہ بخشنے والی تین بڑی خصوصیتوں میں سے ایک suggestion (تصور زائی) ہے ۔ ''تصور زائی'' اور اشاریت میں جو بات مشترک ہے وہ یہ کہ دونوں کا مقصد ایک ہے ، یعنی الفاظ جن معنی کا اظہار کرتے ہیں اس سے بہت زیادہ کی طرف اشارہ بھی کرتے ہیں ۔ یہاں لفظوں کا محض ایک جال ہی نہیں پھیلا ہوتا ہے بلکہ اس کے آگے نکل کر کچھ اور بھی موجود ہوتا ہے جو ہمارے احساسات کو جگا سکتا ہے ۔ جب ملٹن کا ابلیس پکار اٹھتا ہے :

myself am Hell

تو شاعر ابلیس کے ذریعے ایک حقیقت کا اظہار ہی نہیں کرتا بلکہ محض تین الفاظ کے مجموعے سے ایک دنیائے تخیل کو ہمارے سامنے پیش کرتا ہے ۔

جب شیکسپیئر کا انٹونی اپنے آخری سانس لیتے ہوئے کہتا ہے :

I am dying, Egypt is dying

تو ملکۂ قلو پطرہ کو اس کے ملک کے نام سے یاد کر کے اس عجیب و غریب ملکۂ حسن کے رعب و داب اور اس کے جاہ و جلال کا مکمل اظہار کرتا ہے جس کے لیے اس نے اپنی سلطنت اور جان کی بازی لگا دی تھی ۔

جب فاؤسٹس ، ہیلن کی موجودگی میں پوچھتا ہے :

Was this the face that launched hundred ships.

یعنی "کیا یہی وہ صورت ہے جس کے پیچھے ہزاروں جہاز

ٹوٹ گئے" تو شاعر نہ کسی حقیقت کا اظہار کرتا ہے اور نہ کسی جواب کی توقع رکھتا ہے بلکہ ہماری آنکھوں کے سامنے تخیل کے دروازے کھول دیتا ہے جس میں سے ہم ایک دنیائے محبت ، ایک دنیائے حسن کا جلوہ دیکھ سکتے ہیں اور ہمیں بہادری اور جواں مردی کا وہ اکھاڑا نظر آتا ہے جو سارے یونانی ادب کی جان ہے ۔ جو ہمیں یونانیوں کی بزرگی و عظمت کا احساس دلاتا ہے ۔

حافظ کا ایک شعر ہے :

شبے مجنوں بہ لیلیٰ گفت کاے معشوق بے ہمتا
ترا عاشق شود پیدا ولے "مجنوں" نخواهد شد

شاعر نے لفظ "مجنوں" کہہ کر عاشقی کے سارے لوازم بیان کر دیے ہیں ۔ یہی suggestion کا کمال ہے ۔

الفاظ تو احساسات ذہنی کے اظہار کا بہت ہی معمولی ذریعہ ہیں اور کسی احساس کو مکمل طور پر ظاہر کرنے کے لیے الفاظ کے انتخاب اور ان کی نشست کو نہایت ہی احتیاط سے ترتیب دینا چاہیے تاکہ وہ قاری کے ذہن کے صحیح تار پر مضراب کا عمل کر سکیں اور شاعر کے احساس کو پورے طور پر اپنی تفہیم کی گرفت میں لا سکیں ۔ غالب کا ایک مشہور شعر ہے :

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

دو چھوٹے مصرعوں کا ایک شعر ہے ۔ الفاظ بظاہر جن معنوں کا اظہار کرتے ہیں ، وہ یہ ہیں :

خدا کی عبادت کرنے سے بندوں کا بھلا ہوتا ہے ۔ نمرود کی پرستش سے کچھ حاصل نہیں ہوتا ۔ میں نے تمام عمر خدا کی عبادت کی اور ہمیشہ اس امید میں رہا کہ خدا کی عبادت سے مجھے کچھ فائدہ پہنچے گا ۔ آخرکار مجھے مایوسی ہوئی اور میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ میں نے تمام عمر جس کی پرستش کی وہ خدا کی ذات نہیں بلکہ نمرود کی ذات تھی کیونکہ نمرود کی پرستش ہی اس قدر لاحاصل ہو سکتی ہے ۔

لیکن درحقیقت شاعر کا یہ مقصد نہیں ۔ الفاظ کی اس خاص ترتیب سے جو لطیف اشارہ مقصود ہے وہ یہ کہ اب آپ خدا کی خدائی میں شک آ گیا ہے ۔ شاعر نے الفاظ کی نشست اور ان کی ترتیب میں ایسی چابک دستی سے کام لیا ہے کہ اس کے الفاظ جن معنی کا اظہار کرتے ہیں ، اس سے زیادہ کی طرف اشارہ بھی کرتے ہیں ۔ اشاریت (suggestion) سے کام لینا ہر شاعر کے بس کی بات نہیں ۔ شیکسپیئر ، ملٹن یا غالب جیسا خدائے سخن ہی اس حربے کو نہایت کامیابی کے ساتھ استعمال کر سکتا تھا ۔ علاوہ اس کے رسمی زبان میں ایسے الفاظ آسانی سے دستیاب نہیں ہوتے جو suggestion کا کام دے سکیں ۔ اس لیے شاعر کو ایک ایسے ذریعے کی ضرورت تھی جس پر آسانی سے اس کو دست رس حاصل ہو سکے ۔ اشاریت اسی ضرورت کی ایجاد ہے ۔

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کی ابتدا میں نفسیاتی تحقیق کی سب سے اہم شاخ "لاشعور کی کارفرمائی" (The Working of the Unconscious) نے ایک نئی حقیقت کا انکشاف کیا اور وہ یہ کہ علامات و اشارات خیال کی سب سے بڑھ کر بے ساختہ اور

آپ روپی صورت ہے ۔ عالمِ خواب اور بیداری کے سپنوں میں علامت اور استعارے کی زبان ایک ایسا بے ساختہ ذریعۂ اظہار ہے جو ہمارے احساسات کی جیتی جاگتی تصویریں بناتا ہے اور جو رسمی زبان کی پابندیوں سے آزاد ہے ۔ اس حیثیت سے ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اشاراتی شاعری اظہار کا ایک ایسا فطری طریقہ ہے جو ہمارے نفس کی گہرائیوں سے اٹھ کر نمودار ہوتا ہے ۔ عالمِ بیداری کے احساسات عالمِ خواب میں علامات کا کیا روپ اختیار کرتے ہیں ، اس کی دو ایک مثالیں سنیے :

فرض کیجیے کہ آپ لیٹے ہوئے فلسفے کی کوئی کتاب پڑھ رہے ہیں ۔ قدم قدم پر آپ کو ایسے نکات ملتے ہیں جن کے سمجھنے میں آپ دقّت محسوس کرتے ہیں ۔ اسی حالت میں آپ کی آنکھ لگ جاتی ہے ۔ خواب میں آپ دیکھتے ہیں کہ آپ کے سامنے ایک سفید چادر بچھی ہوئی ہے اور اس کے مختلف مقامات پر سیاہ دھبے ہیں ۔

آپ ایک نئی مصیبت میں مبتلا ہیں اور یہ مصیبت آپ کے لیے بلائے جان بنی ہوئی ہے ۔ عالمِ خواب میں آپ دیکھتے ہیں کہ آپ ایک عمارت کی بلندی کے عین کنارے پر سے گزر رہے ہیں جہاں سے پھسل کر گر پڑنے کا خطرہ لگا ہوا ہے ۔

ایک اور دلچسپ واقعہ ملاحظہ ہو : Royal Navy کا ایک افسر ، جسے ایک بڑے عہدے پر پہنچنے کی قوی امید تھی ، اس سے محروم رہ جاتا ہے ۔ اس کا حق چھین کر دوسرے کو دے دیا جاتا ہے اور اس کو سخت مایوسی ہوتی ہے ۔ عالمِ خواب میں دیکھتا ہے کہ وہ شاہی محل میں ملکِ معظم کی ٹی پارٹی میں ، جہاں

اور لوگ بھی موجود ہیں ، مدعو ہے - چائے آتی ہے اور ہر شخص کی میز پر پیالیاں رکھی جاتی ہیں ، مگر اس کی میز بالکل خالی ہے -

نفس لاشعور کے انکشاف ، اور اس کی تحریکات کے علم سے ہماری زندگی کے مختلف شعبوں میں ایک زبردست انقلاب رونما ہو رہا ہے(یا ہونے والا ہے) - ادب اور آرٹ پر اس کا جو اثر ہوا اُس سے اشاریت کی تحریک کو تقویت پہنچی - صرف نظموں ہی میں علامات کا استعمال نہیں ہوا بلکہ افسانوی ادب میں بھی علامات استعمال ہونے لگے اور ناول اور افسانے ایک بالکل نئی ٹکنیک میں لکھے جانے لگے - بیسویں صدی کی دو عہد آفریں تصنیفات Ulyssis اور Wasteland بہترین مثالیں ہیں - اول الذکر جیمس جائس (James Joyce) کا مشہور ناول ہے - اس میں سب سے پہلی بار ایک بالکل نئی ٹکنیک کا استعمال ہوا - اس کی ٹکنیک[۱] بالکل وہی ہے جس میں ہم اور آپ دن رات سوچا کرتے ہیں - ہماری اندرونی ہستی کے مکمل اظہار کے لیے شعور اور لاشعور دونوں کی تحریکات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے - اور پھر نفس شعور میں آنے والے خیالات بھی دو قسم کے ہیں - ایک وہ جن کا ہم بے کھٹکے سوسائٹی کے سامنے اظہار کر سکتے ہیں - دوسرے وہ جو نفس شعور میں گھومتے تو ہیں لیکن ''سماجی تعصبات'' (۲) کے خوف کی وجہ سے ان کو زبان پر نہیں لاتے - "جس وقت نظر پڑتی ہے اُس شوخ پر تسکین" تو وہ یہ کہہ کر

۱- مشہور فرانسیسی ناول نویس Proust نے بھی اسی ٹکنیک میں افسانے اور ناول لکھے ہیں - ہمارے جدید ادب میں اس کی کامیاب تفسیر محمد حسن عسکری کے افسانے ''چائے کی پیالی'' میں ملتی ہے -

۲- مسودے میں یہاں جگہ خالی چھوڑی ہوئی ہے -

خاموش ہو جاتا ہے کہ ''کیا کہیے کہ کیا کیا مرے جی میں نہیں آتا ۔" وہ اس کی تشریح نہیں کرتا کہ اس کے جی میں کیا کیا آتا ہے ، اس لیے کہ وہ سوسائٹی کے ممنوعات کے شکنجے میں پھنسا ہوا ہے ۔ جائس کی ٹکنیک کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ نفس شعور میں گھومنے والے تمام خیالات کو ، قطع نظر اس سے کہ وہ سوسائٹی کے سامنے قابلِ ذکر ہوں یا نہ ، اسی انداز میں بیان کرتا ہے جس میں کہ اس کا کردار سوچتا ہے ۔ دوسری خصوصیت یہ کہ وہ ایک خاص واقعے کو بیان کرنا شروع کرتا ہے اور کچھ آگے چل کر اس سے وابستہ لاشعوری تلازمات کو بیان کرنے لگتا ہے جن کا بظاہر نفسِ مضمون سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا[1] ۔ ۔ ۔ بیسیوں صفحات ایک لمحے کو دوسرے سے جدا کر دیتے ہیں ، لیکن اس ''تک بندی" کے باوجود پلاٹ میں ایک خاص قسم کا ربط پایا جاتا ہے ۔

([2]) کی اشاعت سے دنیائے ادب میں ایک ہنگامہ بپا ہو گیا ہے ۔ پہلے پہل انگلستان میں اس کی اشاعت ممنوع قرار دی گئی اور اس کے سینکڑوں نسخے نذر آتش کر دیے گئے ۔ نقادوں کی ایک جماعت نے اس تصنیف کو انسانیت کی توہین قرار دیا تو دوسری جماعت نے اسے نوعِ انسانی کے لیے ایک "صحت بخش مسہل'' ٹھہرا کر اس کا خیرمقدم کیا ۔

جنسیات میں نئی تحقیقات سے اور ہماری معاشرت کی روز افزوں الجھنوں سے دنیائے ادب پر جو اثر ہو رہا ہے وہ ایک جداگانہ بحث

۱۔ ایک مشہور نقاد نے اس ٹکنیک کے علم برداروں کو ''Put Every thing in school" کہا ہے ۔

۲۔ مسودے میں جگہ خالی چھوڑ دی ہے ۔

کا طالب ہے اور اس مقالے کے احاطے سے باہر ۔ اس لیے اس بحث کو یہیں چھوڑ کر اشاریت کی طرف لوٹتا ہوں ۔

پچھلے اوراق میں اس کی وضاحت ہو چکی ہے کہ جب شاعر کوئی نئی علامت استعمال کرتا ہے تو وہ بجائے خود مقصود نہیں ہوتی بلکہ شاعر کے چند ذاتی تصورات کی ترجمانی کرتی ہے ۔ علامات کی تخلیق کے لیے کوئی قاعدۂ کلیہ نہیں بنایا جا سکتا ، لیکن اس کی سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ نئی علامات ایسی ہوں کہ قاری کا ذہن شاعر کے اس تصور تک پہنچ سکے جو شاعر کا مقصود ہے ۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ شاعر کی علامات ایسی دور از کار نہ ہوں کہ پڑھنے والا انھیں کسی تجربے یا تصور سے متعلق ہی نہ کر سکے ۔

نئی علامتیں وضع کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ۔ جدید شعرا نے نئے علامات استعمال کیے ہیں ۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ وہ اس نئے تجربے میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں ۔ فرانس کا اسکول (میلارمے ۔ ورلین اور جس کے مقلد ہمارے ادب میں میراجی اور ان کا اسکول ہے) کی علامتوں کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی علامتیں arbitrary مستعمل ہوتی ہیں ۔ مثلاً میراجی کا ایک مصرع ہے :

چوم ہی لے گا بڑا آیا کہیں کا کوّا

''شاعر کی محبوبہ محو خواب ہے ۔ اس کی آنکھ کا کاجل رخسار تک بہہ آیا ہے ۔ اس کے ڈھلکے ہوئے کاجل کی صورت کچھ کوّے سے ملتی جلتی ہے اور شاعر نے کوّے سے یہ کاجل مراد لیا ہے ۔ ظاہر ہے کہ اتنی دور کی کوڑی لانا ہر شخص کے بس کا روگ نہیں ۔'' (فیض)

علامات کے وضع کرنے اور ان کے استعمال میں جس بات کو

پیش نظر رکھنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ علامات ایسی ہوں کہ قاری کا ذہن اس تصویر تک پہنچ سکے جو شاعر کا مقصود ہے ، ورنہ شعر کا بنیادی مقصد (communication) فوت ہو جائے گا ۔ اقبال کے کلام میں اور ڈینٹے کی ''ڈیوائن کامیڈی" میں جو اشاریت ملتی ہے وہ رسمی اور معین ہونے کے باوجود نئے معنی کا اظہار کرتی ہے ۔ پرانے الفاظ کو نئے معنی پہنائے گئے ہیں اس لیے ان کے سمجھنے میں دقت محسوس نہیں ہوتی ۔ اکبر الہ آبادی کی شاعری کا آغاز ایک ایسے عہد میں ہوا جب کہ ہماری قدیم تہذیب جدید تہذیب سے متصادم تھی ۔ اکبر نے ہمارے معاشرتی اداروں کی اصلاح کے لیے بعض ایسے علامات وضع کیے جو اس وقت کی سماجی حالت کے پورے ترجمان ہیں ۔ مثلاً جمن ، سید ، ہوٹل ، بس وغیرہ ۔ لیکن اشاریت کے اس نئے اسکول میں علامات من مانے مستعمل ہوتے ہیں اور اکثر موقعوں پر قاری کا ذہن اس تصور کی طرف منتقل نہیں ہوتا جس کی طرف شاعر کا اشارہ مقصود ہوتا ہے ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے قاری الفاظ و معنی کی بھول بھلیوں میں کھو جاتا ہے اور اس کے لیے ایسی شاعری ایک خاردار راستے کی مانند ہے جس کی جھاڑیوں میں اس کا دامن الجھ کر رہ جاتا ہے اور وہ آگے بڑھنے نہیں پاتا ۔

علامات وضع کرنے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں ۔ پہلی یہ کہ پرانی علامات کو نئے معنی پہنائے جائیں جیسا کہ ڈینٹے اور اقبال نے کیا ہے ۔ دوسری صورت یہ کہ نئی علامات کو ایک ایسے ماحول میں پیش کیا جائے جس سے قاری کو اس تصور تک پہنچنے میں مدد ملے جو شاعر کا مقصود ہے ۔ یعنی وہ داخلی اور تمثیلی ہونے

کے باوجود بعید از قیاس نہ ہوں - مثلاً W.B. Yeats[1] کی شاعری کے ابتدائی دور میں زندگی کی کشمکش سے گریز پایا جاتا ہے اور وہ تخیلات کی جنتیں آباد کر کے اس میں پناہ لیا کرتا تھا - Fairy Land اس کے ہاں ایک علامت ہے - imagination کے لیے T.S. Elliot نے اپنی مشہور نظم Waste Land میں "پانی" کو آزادی اور روح کی بالیدگی کی علامت قرار دیا ہے اور Waste Land کی مناسبت سے یہ بعید از قیاس بھی نہیں -

نئی شاعری ابھی تجرباتی دور سے گزر رہی ہے اور ایسی حالت میں اس کی فوری تکمیل کی توقع کچھ نامناسب ہے - تجرباتی دور میں خوبیاں بھی ہوتی ہیں اور خامیاں بھی ، لیکن فی الحال ہمارے لیے اس کی خوبیاں ہی نہایت اہم ہیں ، کیونکہ نقادان فن کی جانچ پڑتال سے خامیاں دور ہو سکتی ہیں -

★ ★ ★

---

۱ - فرانس میں میلارمے کی قیام گاہ کو ایک ادبی مرکز کی حیثیت حاصل تھی جہاں یورپ کے مشہور شعرا و ادبا جمع ہوتے تھے جن میں W.B. Yeats ، Oscarwilde اور T. S. Elliot بھی شامل تھے - ییٹس اور ایلیٹ نے انگریزی شاعری میں اشاریت کو فروغ دیا - ان کی شاعری میں "دھندلکا" پایا جاتا ہے لیکن یہ ابہام کی حد کو نہیں پہنچتا -